فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ (النساء)

اِصلاحُ النّسآء

از

حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہ

۱۲۸۰ - ۱۳۶۲ھ

۱۸۶۳ - ۱۹۴۳ء

اسلامی معاشرے میں خواتین کا مقام، اُن کے حقوق و فرائض، ان کی تعلیم و تربیت اور امور خانہ داری کی اصلاح سے متعلق حضرت اقدس تھانوی قدس سرہٗ کی عام فہم تقاریر کا بہترین مجموعہ

مکتبۃ البشریٰ

شعبہ نشر واشاعت

چودھری محمد علی چیریٹیبل ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کراچی پاکستان

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ (النسآء)

اِصلاحُ النّسَاء

از

حکیم الامّت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرّہ

۱۲۸۰ - ۱۳۶۲ھ
۱۸۶۳ - ۱۹۴۳ء

اسلامی معاشرے میں خواتین کا مقام، اُن کے حقوق و فرائض
ان کی تعلیم و تربیت اور امور خانہ داری کی اصلاح سے متعلق
حضرت اقدس تھانوی قدس سرّہ کی عام فہم تقاریر کا بہترین مجموعہ

مکتبۃ البشریٰ
شعبہ نشر و اشاعت
چودھری محمد علی چیریٹیبل ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کراچی پاکستان

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضرات اہل علم، عزیز طلبہ اور معزز قارئین کی خدمت میں گذارش:

الحمدللہ! اس کتاب کی تصحیح کی حتی الوسع کوشش کی گئی ہے۔ اس کے باوجود اگر کوئی غلطی نظر آئے یا کوئی مفید تجویز ہو تو براہ کرم تحریر کر کے ہمیں ضرور ارسال فرمائیں تاکہ آئندہ اشاعت بہتر اور غلطی سے پاک ہو سکے۔

جزاکم اللہ تعالیٰ خیراً

مکتبۃ البشریٰ

برائے خط وکتابت: 9-A/1 محمد علی سوسائٹی، بالمقابل عوامی مرکز، شاہراہ فیصل، کراچی۔ 75350

کتاب کا نام : اِصلاحُ النِّسا

واعظ : حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہ

قیمت برائے قارئین : فہرست کتب ملاحظہ فرمائیں۔

سن اشاعت : ۱۴۳۴ھ/۲۰۱۲ء

ناشر : مکتبۃ البشریٰ چودھری محمد علی چیریٹیبل ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کراچی پاکستان

Z-3، اوورسیز بنگلوز، گلستان جوہر، کراچی۔ پاکستان

فون نمبر : +92-21-34541739, +92-21-37740738

ویب سائٹ : www.maktaba-tul-bushra.com.pk
www.ibnabbasaisha.edu.pk

ای میل : al-bushra@cyber.net.pk

ملنے کا پتہ : مکتبۃ البشریٰ، کراچی۔ پاکستان

موبائل نمبر : 0321-2196170, 0334-2212230, 0346-2190910
0314-2676577, 0302-2534504

اس کے علاوہ تمام مشہور کتب خانوں میں بھی دستیاب ہے۔

ترتیبِ مواعظ

① کساء النساء

﴿فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی﴾ (القرآن)

از صفحہ: ۲۰ تا ۱۲۰

② العاقلات الغافلات

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ﴾ (القرآن)

از صفحہ: ۱۱۶ تا ۱۶۹

③ الکمال فی الدین للنساء

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ﴾ (القرآن)

از صفحہ: ۱۷۰ تا ۲۳۵

④ حقوق البیت

"کُلُّکُمْ رَاعٍ وکُلُّکُمْ مَسْؤُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِهٖ". (الحدیث)

از صفحہ: ۲۳۶ تا ۲۸۳

⑤ إصلاح النساء

"مارأیت من ناقصات عقل ودین". (الحدیث)

از صفحہ: ۲۸۴ تا ۳۰۶

فہرست

مضمون	صفحہ
① کساءُ النساء	
دعا وخطبہ	۲۲
تواضع زائد از حد مفید نہیں ہے	۲۴
ایک بزرگ کا قصّہ متعلق تواضع	۲۵
قصّہ سید احمد رفاعی رحمہ اللہ بابت تواضع	۲۵
ایک پیش کار صاحب مصلی پر رشوت لیتے تھے	۲۸
تقوی کلابی	۲۸
بعض واعظ صرف ترہیب کرتے ہیں	۳۱
سخت تعلیم نہ چاہیے	۳۲
مدرسوں کے نظم ونسق پر اعتراض کرنا	۳۳
میرے یہاں تشدد بھی ہوتا ہے	۳۴
جیسے مردوں کے اعمال ویسے ہی عورتوں کے	۳۵
تواضع بے محل کے متعلق ایک قصّہ	۳۵
کھانے کو گوہ موت کہنا	۳۷
مولانا فضل رحمٰن صاحب نے ارہر کی دال کو بڑی نعمت کہا	۳۷
بے نمک کھچڑی کھا لینے پر بخشش	۳۸
شریعت میں کھانے کے متعلق اعتدال	۳۸
غصّہ میں کھانے کے برتن توڑنا	۳۹
افراط فی التواضع سے مایوسی پیدا ہوتی ہے	۴۰

مضمون	صفحہ
ایک مسلمان سپرنٹنڈنٹ کا قصّہ متعلقۂ یاس	۴۰
چندہ مانگنے والے قصداعورتوں کے مجمع میں بیان کرتے ہیں	۴۱
گھروں میں املاک متمایز ہونے چاہئیں	۴۳
املاک متمائز نہ ہونے میں دینی اور دنیوی خرابی	۴۴
گھر کے خرچ میں بھی تصریح مِلکیت کی ہونی چاہیے	۴۵
بی بی کو جیب خرچ بھی دینا چاہیے	۴۵
عورتوں کی عفت	۴۹
مردوں پر جاں نثاری	۴۹
عورتوں کا ایثار	۴۹
عورتوں میں بدزبانی کا بڑا عیب ہے	۵۰
بدزبانی کی ایک لطیف تدبیر	۵۰
حکایت	۵۱
اہل اللہ زن مرید نہ تھے بلکہ قدر شناس تھے	۵۲
ایک بزرگ کو ان کی بیوی بہت دق کرتی تھی	۵۲
ماں باپ لڑکیوں کو تعلیم نیک نہیں دیتے	۵۳
عورتوں کو انگریزی تعلیم مضر ہے	۵۴
عورتوں کو جغرافیہ پڑھانا	۵۴
پرانی تعلیم یافتہ عورتیں بہت مہذب ہوتی ہیں	۵۵
ہر علم مفید نہیں	۵۵
ایک جنٹ صاحب کی تعلیم نسواں سے متعلق رائے	۵۶
ایک عورت کی تصنیف کا قصّہ	۵۶
اخباروں میں عورتوں کے مضامین مع پتہ ونشان	۵۷

مضمون	صفحہ
ایک پرچہ میں عورت کا پیر سے عاشقانہ خطاب	۵۸
عورت کی تہذیب یہ ہے کہ اجنبی سے روکھا برتاؤ کرے	۵۹
مردوں کی تہذیب اور ہے، عورتوں کی اور	۶۱
حیا عورت کے لیے طبعی امر ہے	۶۲
لڑکیوں کو پرانی تعلیم دینا چاہیے	۶۳
لڑکیوں کا اشعار یاد کرنا	۶۳
تصوّف کی حقیقت	۶۳
اہلِ تصوف کے اشعار سب کو مفید نہیں	۶۴
عورتوں کے لیے کس قسم کی کتابیں مناسب ہیں	۶۴
ایک واعظ صاحب کا قصّہ	۶۶
شریعت میں پالیسی کی تعلیم نہیں	۶۶
ایک واعظ صاحب کا قصّہ	۶۷
پالیسی کے لیے حدیث وقرآن کو کیوں آڑ بناتے ہو؟	۶۷
شانِ نزول	۶۹
حق تعالیٰ کو عورتوں کی رعایت کس قدر ملحوظ ہے؟	۶۹
حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی حکایت کہ حق تعالیٰ نے اس کو پیغام بھیجا	۷۰
جوشِ محبّت کا رونا	۷۰
بلبلے برگ گل خوش رنگ	۷۰
غایت قرب میں تحیر ہوتا ہے	۷۱
بڑے کے اتباع میں چھوٹے کا نفع ہے	۷۴
عورتوں کی اصلاح خاوند سے بہ نسبت پیر کے زیادہ ہوسکتی ہے	۷۵
پیر کا رتبہ خاوند سے زیادہ نہیں	۷۵

مضمون	صفحہ
باپ کا رُتبہ پیر سے زیادہ ہے	۷۵
باپ اور پیر کے حقوق میں قولِ فیصل	۷۶
آج کل کے پیروں نے دین کا ناس کر دیا ہے	۷۷
خاوند کے برابر پیر کا حق نہیں	۷۷
پیر کے یہاں بلا اجازت خاوند کے جانا	۷۷
بعض پیر پردہ نہیں کرنے دیتے	۷۸
ایک پیر کا قصّہ	۷۸
کانپور کے ایک پیر صاحب کا قصّہ	۷۸
ایک اور آیت مُثبِتِ مساوات	۸۳
پردہ عقلی اور نقلی ثبوت	۸۶
مسلمان عورت کے لیے پردہ قید نہیں ہے	۸۷
عورتوں کو پردہ میں آرام پہنچانا	۸۷
عورت کو خاوند کا عشق ہوتا ہے	۸۸
حضرت لقمان علیہ السلام کی حکایت	۸۸
عورتوں کی سفارش قرآن میں	۸۹
عورت کا موجبِ خیر کثیر ہونا	۸۹
قیامت میں اولاد والدین کو بخشوائے گی	۹۰
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق بیبیوں کے ساتھ	۹۰
زیادہ وقار بھی اچھا نہیں	۹۱
متانت خلافِ سنت مذموم ہے	۹۱
حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب میں مِل جل کر رہتے تھے	۹۲
حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قصّہ	۹۳

مضمون	صفحہ
بیوی کے خرچ میں تنگی	۹۴
عورت کو حتی المقدّور تنگ نہ کیا جائے	۹۵
مسئلۂ تساوی میں بظاہر نصوص میں تعارض ہے	۹۵
صفات فاضلہ دو قسم کی ہیں خلقی، ومکتسب	۹۶
فضائل خِلقیہ	۹۷
فضائلِ مکتسبہ کی تمنّا جائز ہے	۹۸
سالکین کے کام کی بات	۹۸
ذوق و وجد اختیاری نہیں	۹۸
امور غیر اختیار یہ کے درپے ہونے کی خرابی	۹۹
قبض کے وقت کیا کرنا چاہیے	۱۰۰
بسط میں کبھی سالک کو بھی عمل پر ناز ہو جاتا ہے	۱۰۰
امور اختیار یہ میں اپنے اختیار کے موافق ہمت سے کام لے	۱۰۰
تہجّد کے وقت آنکھ کھلنے کی تدابیر	۱۰۱
باوجود تدابیر کے تہجّد کے وقت آنکھ نہ کُھلنا	۱۰۱
آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک بار فرض نماز قضا ہوئی	۱۰۱
عشاء کے بعد تہجّد پڑھنا	۱۰۳
کام اپنے کرنے سے ہوتا ہے	۱۰۳
سہل تعلیم کی قدر نہیں کی جاتی	۱۰۳
حق تعالیٰ نے جو کچھ کسی کو دیا وہ اُسی کے قابل تھا	۱۰۴
دوسرے کی حالت کی تمنّا ٹھیک نہیں	۱۰۵
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہونے کی تمنّا کرنا	۱۰۵
حضور صلی اللہ علیہ وسلم حلیم ہی نہ تھے بلکہ حکیم بھی تھے، سختی کے موقع پر سختی فرماتے تھے	۱۰۶

مضمون	صفحہ
نبی کی طرف سے قلب میں کدورت ہونا بھی کفر ہے	۱۰۶
آیت و آتَاکُمْ مِنْ کُلِّ مَا سَالْتُمُوْهُ إلخ کی تفسیر	۱۰۷
عورتیں سب باتوں میں گھٹی ہوئی نہیں	۱۰۷
تشبہ بالرجال ممنوع ہونے کا ثبوت آیت سے	۱۰۸
ڈاڑھی منڈانے پر عذاب	۱۰۹
ایک عورت مرد بن گئی، اس کے مہر کا مسئلہ	۱۰۹
ایک عورت کے ڈاڑھی	۱۱۰
عورتوں کو اچکن یا گرگابی پہننا	۱۱۰
التماسِ کاتب	۱۱۳
④ العاقلات الغافلات	
خطبہ مسنونہ	۱۱۶
مستورات کی خدمت میں درخواست	۱۱۶
وعظ کی کیا نیت ہے؟	۱۱۷
لوگوں کی غرضیں وعظ سننے سے مختلف ہیں	۱۱۷
وعظ کی اصلی غرض	۱۱۷
قرآن نافع ہے اور پھر نفع نہیں ہوتا کیا بات ہے؟	۱۱۸
وعظ کا نفع کس کو ہوگا	۱۱۹
مردوں کی خدمت میں عرض	۱۲۰
مستورات کی بے احتیاطی	۱۲۰
مردوں کے ذمہ عورتوں کی تعلیم بھی ہے	۱۲۱
بعض کی رائے ہے کہ تعلیم مستورات کو مضر ہے	۱۲۲
مستورات کو کیا تعلیم ہونی چاہیے	۱۲۳

مضمون	صفحہ
کمال جب ہے کہ مضر نہ ہو	۱۲۳
تعلیم دین مضر ہو ہی نہیں سکتی	۱۲۳
عورتوں کی تعلیم کا کیا طریقہ ہے	۱۲۳
فقہاء کے اس قول کا راز	۱۲۴
آیت میں ایک مضمون خاص بیان ہوا ہے	۱۲۵
عورتوں کی تین صفات کا بیان آیت میں	۱۲۵
آیت میں المحصنات کو کیوں مقدم کیا المؤمنات پر	۱۲۶
انسان میں دو کمال ہیں قوت علمیہ وعملیہ	۱۲۶
قرآن شریف میں دینی کمالات مذکور ہوں گے، دنیوی نہیں	۱۲۷
قرآن شریف کے ذمہ دو چیزیں ہیں	۱۲۷
کمالِ دینی دو چیزیں	۱۲۹
عورتیں اپنی نوع کی اعتبار سے کامل ہو سکتی ہیں نہ کہ مردوں کی نوع سے	۱۲۹
مقصود علم سے عمل ہے	۱۳۰
ایک حکایت	۱۳۰
ان کا رد جو محض تعلیم کو مقصود سمجھتے ہیں، عمل کو نہیں	۱۳۱
بعض کتابیں محض بے اصل ہیں	۱۳۱
بعض نے صرف ایمان پر کفایت کر لی ہے، اس کے متعلق عجیب تحقیق	۱۳۲
صرف لا الٰہ الا اللہ پر اکتفا جائز نہیں، اعمال کی بھی ضرورت ہے	۱۳۳
ایمان کے ساتھ عمل کے ضروری ہونے کی ایک مثال سے وضاحت	۱۳۴
دین سیکھنے سے آتا ہے	۱۳۶
علم وعمل کی فہرست	۱۳۶
نماز روزہ اپنی ذات میں دین ہے	۱۳۷

مضمون	صفحہ
سب سے پہلے بچہ کی تعلیم کیا ہونی چاہیے	۱۳۷
دین سب کی مشترک جائیداد ہے، سب کو حفاظت کرنی ضروری ہے	۱۳۸
ارادہ نہ کرنے سے معمولی کام مشکل ہو جاتا ہے	۱۳۸
قرآن شریف کسی حالت میں ترک نہ کرنا چاہیے	۱۳۹
قرآن شریف نہ پڑھانے کا بہانہ	۱۴۰
مشغول شخص کا نصابِ دین	۱۴۱
بچیوں کے لیے تعلیم	۱۴۱
ناخواندہ عورتوں کو دینی تعلیم	۱۴۲
دینی کتابوں سے متعلق ایک کام کی بات	۱۴۳
گورنمنٹ کا کسی کو شمس العلماء کا خطاب دینا معتبر نہیں	۱۴۴
علماء کون سے ہیں	۱۴۴
ایمان کی حفاظت کا طریقہ، ایک متبع سنت عالم کی پیروی کرنا ہے	۱۴۵
عالم کون ہے	۱۴۶
ہر ایک کتاب نہ دیکھنا چاہیے	۱۴۷
کتابیں انتخاب کرا کر پھر گھر والوں کو سنانا چاہیے، خواہ پندرہ منٹ روزانہ ہو	۱۴۸
دینی نصاب بار بار سنایا جائے	۱۴۹
دین کی مشقت اور اس کا مزہ	۱۵۰
کام تو کرنے سے ہوتا ہے	۱۵۱
اللہ والوں کے سامنے اپنے آپ کو مٹانے سے دین آتا ہے	۱۵۳
دین کے لیے تھوڑی بہت تکلیف برداشت کرنی ہی پڑتی ہے	۱۵۴
مشائخ کی تربیت اور اصلاح بالکل ایسی ہے جیسے آپریشن ہو	۱۵۵
اہل اللہ کی صحبت میں رہنے سے کیا ہوتا ہے	۱۵۶

صفحہ	مضمون
۱۵۶	کام کرنے کا خلاصہ
۱۵۶	قوتِ عملیہ کے واسطے ہمت کی ضرورت ہے
۱۵۷	توبہ ٹوٹنے کے خیال سے نہ کریں کہ توبہ نہ کریں
۱۵۸	گناہ نہ چھوٹے تو کیا کرے
۱۵۹	زمانہ کا مذاق کہ حرام کو حرام نہیں سمجھتے
۱۵۹	گناہ نہ چھوٹے تو دوسرا کام یہ کرے
۱۶۰	بعض اعمال عورتوں کے متعلق
۱۶۰	عورتوں میں خاوند کی نافرمانی کا خاص مرض
۱۶۱	پردہ میں کمی کا مرض
۱۶۱	گھر کا کام کاج
۱۶۲	غیبت کا مرض
۱۶۲	عورتوں میں ایک اور مرض مردوں کے ساتھ مشابہت
۱۶۲	ایک قوم کو دوسری قوم کے ساتھ مشابہت کی مخالفت
۱۶۴	عورتوں میں رسوم کی پابندی
۱۶۵	نکاح میں سادگی کا اہتمام
۱۶۶	غمی کی رسمیں
۱۶۷	آیت کے تفسیری نکات
۱۶۷	مرد کے ذمہ عورت کی عصمت کی حفاظت ہے
۱۶۹	خلاصہ وعظ
۱۶۹	وعظ کے بعد نکاح
	③ الکمال فی الدین للنساء
۱۷۲	خطبۂ مسنونہ

مضمون	صفحہ
تمہید	۱۷۲
مسلم معاشرہ میں عورتوں کا اہم کردار	۱۷۲
بچوں کی اصلاح کا سہل طریقہ	۱۷۳
ازواجِ مطہرّات کا دینی جذبہ	۱۷۶
خواتین سے اللہ تعالیٰ کا خطاب	۱۷۸
قرآن مجید میں مردوں کو خطاب کرنے کی مختلف وجوہات	۱۷۹
مردوں کی غفلت	۱۸۱
کمالِ دین حاصل کرنے کا طریقہ	۱۸۱
عورتوں کے دو شعبے	۱۸۳
خواتینِ اسلام کی غفلت	۱۸۴
ناشکری کا مادہ	۱۸۵
چتھیڑے، لیترے، ٹھیکرے	۱۸۶
بد دین عورتوں سے احتیاط	۱۸۸
زیورات کی حرص	۱۹۲
امیر عورتوں سے ملاقاتوں کا نتیجہ	۱۹۳
غریب خواتین سے میل جول	۱۹۵
دُنیا میں اپنے سے نیچے اور دین میں اپنے سے اُونچے کو دیکھو	۱۹۵
ہماری حالت	۱۹۶
ہمارے اندر تکبّر کی عادت	۱۹۹
سالکین کی ایک غلطی	۲۰۰
اپنے نیک کاموں پر ناز نہیں کرنا چاہیے	۲۰۲
اللہ تعالیٰ کی بے حساب رحمت	۲۰۴

صفحہ	مضمون
۲۰۵	قبولیت کی علامت
۲۰۵	عورتوں کے لیے دین میں کمال حاصل کرنے کا طریقہ
۲۰۶	آج کل کی عورتوں کی دینی تعلیم
۲۰۷	عورتیں جاہل پیروں کی جلدی معتقد ہو جاتی ہیں
۲۰۷	مری بار کیوں دیر اتنی کری؟
۲۰۸	ناول اور افسانے
۲۰۹	گھر کے بڑوں کی ذمہ داری
۲۱۰	تکمیلِ دین کا طریقہ
۲۱۰	نماز میں کوتاہیاں
۲۱۲	بچوں کی تربیت اور نماز
۲۱۳	عورتیں اور روزہ
۲۱۴	روزہ اور غیبت
۲۱۴	زکوٰۃ کی کوتاہیاں
۲۱۵	پردہ میں کوتاہی
۲۱۷	نفس کی مثال
۲۱۸	شوہر کا ادب واحترام
۲۱۸	فضول خرچی کی عادت
۲۱۹	بچت کرنا اور رقم جمع رکھنا
۲۲۰	موت اور غمی کی رسمیں
۲۲۲	خلاصہ
۲۲۲	نیک لوگوں کی صحبت اور عورتوں کے لیے اس کا طریقہ
۲۲۵	عورتوں کی اصلاح کی پہلی صورت

مضمون	صفحہ
اصلاح نسواں کی دوسری صورت	۲۲۶
ایک علمی اشکال اور اس کا جواب	۲۲۸
خلاصۂ کلام	۲۳۴
④ حقوق البیت (یعنی حقوقِ خانہ داری)	
تمہید	۲۳۷
اجمال و تفصیل	۲۳۹
حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی قرآن کریم سے تائید	۲۴۰
عورتوں کو بھی یہ حکم شامل ہے	۲۴۰
مردوں اور عورتوں کے متعلق کچھ حقوق	۲۴۰
حقوق کا علم	۲۴۱
بدنظمی کی ایک مثال	۲۴۱
بدنظمی کی خرابی	۲۴۱
عورتوں کی کوتاہی	۲۴۲
مردوں کی کوتاہی	۲۴۲
بیوی کو نماز پر کبھی تنبیہ نہیں کی	۲۴۳
مردوں کی دوسری کوتاہی	۲۴۴
مردوں کی عورتوں پر بے جا سختی	۲۴۵
ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حسنِ سلوک	۲۴۶
قصۂ افک	۲۴۶
براءتِ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا	۲۴۷
حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے کلام کا منشا	۲۴۸
حضورِ پرنور صلی اللہ علیہ وسلم احکامِ شرعیہ میں کسی کی رعایت نہ فرماتے تھے	۲۴۸

مضمون	صفحہ
باوجود کمالِ محبّت کے حضور اکرم ﷺ حضرت فاطمہ کی احکامِ شرعیہ میں رعایت نہ فرماسکتے تھے	۲۴۹
حضور ﷺ اپنی ذاتِ خاص اور اپنے گھر والوں کے لیے دنیوی وسعت کو پسند نہ فرماتے تھے	۲۴۹
سب سے بہترین وظیفہ جو حضور ﷺ نے اپنی صاحب زادی کو بتایا	۲۵۰
مال کا زیادہ ہونا حضور ﷺ کے مذاق کے خلاف تھا	۲۵۱
حضورِ اکرم ﷺ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی کمالِ محبّت	۲۵۱
حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے جواب سے حضور ﷺ کی مسرت	۲۵۲
ہمارے مذاق فاسد ہوچکے ہیں	۲۵۲
اُلٹی گنگا	۲۵۲
مردوں کی غلطیاں	۲۵۳
عورتیں ٹیڑھی پسلی سے پیدا ہوئی ہیں، لہٰذا اُن میں تھوڑی سی بے تمیزی مناسب ہے	۲۵۳
عورتوں کو دینی تعلیم کافی دینی چاہیے	۲۵۴
عورت کا کمال یہ ہے کہ گھر میں رہے	۲۵۴
سمجھ دار نوتعلیم یافتہ عورتوں کو صرف دینیات کی تعلیم دیتے ہیں	۲۵۵
اخبار اور ناول عورتوں کے لیے زہرِ قاتل ہیں، اسی طرح زنانہ اسکول بھی سخت مضر ہیں	۲۵۵
آج کل کی حالت	۲۵۶
عورت پردہ میں رہے، عورت کے معنی بھی یہی ہیں کہ چھپی ہوئی	۲۵۷
شریعت کو چھوڑ دینے سے حیا اور غیرت رخصت ہوجاتی ہے	۲۵۷
پیر سے بھی شدید پردہ ہے	۲۵۷
شریف آدمی عورت کی آزادی پر صبر نہیں کرسکتا	۲۵۸
دین کی تعلیم سے عورتوں میں سلیقہ آئے گا	۲۵۸

مضمون	صفحہ
مردوں کا غیر اختیاری باتوں پر غصّہ کرنا سخت غلطی ہے	۲۵۹
خضر علیہ السلام کا واقعہ	۲۵۹
اولاد کے ہوتے ہوئے انسان بے فکر نہیں رہ سکتا	۲۶۰
ظرافت کی کہانی	۲۶۱
اولاد نیک نہ ہو تو از حد پریشانی ہوتی ہے	۲۶۱
ایک لطیفہ	۲۶۲
اولاد سے نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کی فرمانبرداری سے نام چلتا ہے	۲۶۳
ایک شُبہ کا ازالہ	۲۶۴
ایک بزرگ کا واقعہ	۲۶۵
ایک حکایت	۲۶۶
دوسری حکایت	۲۶۶
ایک تحصیل دار کا واقعہ	۲۶۷
شرعی پردہ کی برکت سے ہی عورت پاکدامن رہ سکتی ہے	۲۶۸
ایک واقعہ	۲۶۹
خُوبیوں کا مقتضا	۲۶۹
پیرانی صاحبہ کا واقعہ	۲۷۰
عورتوں کے دینی و دنیوی حقوق کی طرف توجہ دینی چاہیے	۲۷۰
عورتوں کو دِین سکھانے کا طریقہ	۲۷۱
حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجلاس میں ایک مقدمہ	۲۷۱
عورتوں کی کوتاہیاں اور غلطیاں	۲۷۲
ایک لطیفہ	۲۷۲
ایک حدیث	۲۷۳

مضمون	صفحہ
دوسری حدیث	۲۷۳
میرٹھ کا ایک گھرانہ	۲۷۳
ایک حکایت	۲۷۴
مردوں اور عورتوں میں قُدرتی فرق	۲۷۵
عورتوں کا مردوں کے ساتھ برابری کا دعویٰ غلط ہے	۲۷۵
عورتوں کی دوسری کوتاہی	۲۷۶
عقلاء کا طرز اور ایک حکایت	۲۷۷
عورتیں مرد کو دِیندار بنا سکتی ہیں	۲۷۸
عورتوں کو اعتدال سے کام لینا چاہیے	۲۷۸
عورتوں کی اولاد کے حقوق میں کوتاہیاں	۲۸۰
ایک حکایت	۲۸۰
دوسری حکایت	۲۸۰
اولاد نیک ہونے کے طریقے	۲۸۱
حقوق کی قسمیں	۲۸۱
آخری بات	۲۸۲
عِلم حاصل کرنے کا آسان طریقہ	۲۸۲
⑤ اصلاح النساء	
خُطبۂ مسنونہ	۲۸۶
ترجمہ حدیث شریف	۲۸۶
تمہید	۲۸۷
نقائصِ اضطراری	۲۸۷
تکبّر کا منشا اور بنیاد جہالت ہوتی ہے	۲۸۹

مضمون	صفحہ
مردوں اور عورتوں کی خِلقت میں فرق ہے	۲۹۱
لعنت ملامت کرنے کا مرض	۲۹۴
ناشکری کا مرض	۲۹۴
چالاکی و ہوشیاری کا مرض	۲۹۷
حسد	۳۰۱
عورتوں کو اپنی اصلاح کی فکر ضروری ہے	۳۰۳
اصلاح کا طریقہ	۳۰۵

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الوعظ

المسمّٰی بہ

کساءُ النساء

کساءُالنساء

أین (کہاں ہوا): بمقام پانی پت، محلّہ مخدوم زادگان، مکان زنانہ عبدالحکیم صاحب۔

متی (کب ہوا): ۲۷ صفر، ۱۳۲۷ھ، یوم دوشنبہ بمطابق ۲ دسمبر ۱۹۱۸ء

کم (کتنی دیر ہوا): صبح ۸ بج کر ۱۸ منٹ سے ۱۰ بجکر ۲۶ منٹ تک، کل وقت: دو گھنٹہ ۸ منٹ۔

کیف (کس ہیئت پر ہوا): چوکی پر بیٹھ کر بیان فرمایا۔

ماذا (کیا مضمون تھا): حقوق مستورات اور مردوں کو تنبیہ کہ عورتوں کو حقیر نہ سمجھیں، بعض امور میں عورتیں مردوں سے کم نہیں اور بعض میں برابر اور بعض میں بڑھ بھی سکتی ہیں۔

من ضبط (کس نے ضبط کیا): احقر محمد مصطفیٰ و منشی عزیزالرحمٰن صاحب اپچولوی وخواجہ عزیزالحسن صاحب

المستمعون (سامعین کی تخمینی تعداد): مرد تقریبا ۱۰۰، باقی مستورات

الأشتات (متفرقات): واقعہ: ایک صاحب سامنے پنسل بنانے لگے، فرمایا: اس کو چھوڑ دیجیے۔ اور مجمع زیادہ نہ تھا، مگر چوکی کے متّصل ازدحام تھا۔ فرمایا: اس سے دل الجھتا ہے، تھوڑا سا فصل ہونا چاہیے۔ تبییض کے وقت مسوّدہ مصطفیٰ کا اور خواجہ صاحب کا پیش نظر تھا۔

دعا وخطبہ

أما بعد: فأعوذ بالله من الشيطن الرجيم، بسم الله الرحمن الرحيم

﴿فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّىْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِىْ سَبِيْلِىْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ۝﴾

(آل عمران: ۱۹۵)

سو منظور کرلیا اُن کی درخواست کو ان کے رب نے، اس وجہ سے کہ میں کسی شخص کے کام کو جو کہ تم میں سے کرنے والا ہو اِکارت نہیں کرتا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، تم آپس میں ایک دوسرے کے جزو ہو۔ سو جن لوگوں نے ترکِ وطن کیا اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور تکلیفیں دیے گئے میری راہ میں اور جہاد کیا اور شہید ہوگئے، ضرور ان لوگوں کی تمام خطائیں معاف کردوں گا اور ضرور ان کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، یہ عوض ملے گا اللہ کے پاس سے اور اللہ ہی کے پاس اچھا عوض ہے۔

یہ ایک آیت ہے جس کا ایک خاص جزو اس وقت بیان کرنے میں مقصود ہے، کیوں کہ اس خاص جزو میں عورتوں کے بتلانے کے قابل ایک بات ہے۔ اس واسطے ضرورت ہوئی اُسی کے مقصود بتانے کی۔ میں اس کی تعیین ابھی کردوں گا، اسی سے وجہ معلوم ہوجائے گی اس آیت کے اختیار کرنے کی۔ گو میں نے آیت پوری پڑھی ہے، مگر ترجمہ اسی جزوِ مقصود تک کروں گا۔ اول سمجھ لیجیے کہ اس سے اوپر حق تعالیٰ نے کچھ ذکر کیا ہے اہلِ طاعت کا اور ان کے بعض اقوال وافعال ذکر فرمائے ہیں کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ وہ ذکر کرتے ہیں حق تعالیٰ کا اور کائنات میں تفکر کرتے ہیں اور دعائیں کرتے ہیں۔ اور وہ دعائیں نقل فرمائی ہیں اور نقل کیا فرمائی ہیں بلکہ تعلیم فرمائی ہیں۔ نہایت پاکیزہ اور جامع دعائیں ہیں۔ اس کے بعد یہ آیت ہے جو میں نے پڑھی ہے: ﴿فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ﴾ اِلخ، جس کا مطلب یہ ہے کہ اُن کی دعا قبول ہوئی

اوران کی درخواست منظور کی گئی۔ اگلے جملے میں اس کی وجہ ارشاد ہے: ﴿اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ﴾ (آل عمران: ۱۹۵) یہاں لام مقدر ہے، یعنی تقدیر لِاَنِّیْ ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ درخواست ان کی اس وجہ سے منظور ہوئی کہ میری عادت یہی ہے کہ میں کسی شخص کا عمل اور کسی کام کرنے والے کا کام ضائع اور برباد نہیں کیا کرتا۔ چوں کہ دعا بھی عمل ہے، اس واسطے اس کو بھی میں نے ضائع نہیں کیا، بلکہ اس کو منظور کرلیا اور وہ جو سوال کرتے ہیں وہ میں پورا کروں گا۔ ایک تو یہ توجیہ ہے۔ اور ایک یہ ہے کہ أَنِّی کی تقدیر لِأَنِّی نہیں ہے اور یہ علت نہیں ہے فَاسْتَجَابَ کی، بلکہ یہ جملہ مفعول ہے اِسْتَجَابَ کا۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ حق تعالیٰ نے اس بات کو منظور فرمایا کہ ان کا کوئی عمل ضائع نہیں کریں گے۔

اس میں دعا بھی آگئی اور یہ اعمال بھی آگئے اور گو اوپر اعمال کے ضائع کرنے کی درخواست نہیں تھی۔ پھر استجاب کے کیا معنی؟ مگر اعمال تو مذکور ہیں یَذْکُرُوْنَ اور یَتَفَکَّرُوْنَ میں جواب اعمال کو شامل ہے، لِمَا قَالُوْا: کُلُّ مُطِیْعِ اللّٰہِ فَھُوَ ذَاکِرٌ. اور جو شخص عمل کرتا ہے، بہ نیت قبول کے کرتا ہے، تو عمل کرنا بھی درخواست ہے ضائع نہ کرنے کی۔ پس اس طرح سے عدمِ اضاعۃ ''اِسْتَجَابَ'' کا مفعول بہ ہوگیا۔ یہ تو توجیہ کا اختلاف ہے، لیکن ہر حال میں خلاصۂ مشترک اس کا یہ ہے کہ یہ بات معلوم کرادی گئی کہ خدا تعالیٰ کسی کا عمل ضائع نہیں کرتے۔ یہ مضمون ایسا ہے کہ سب جانتے ہیں اور جابجا آیتوں میں مذکور ہے۔ چناں چہ کئی جگہ آیا ہے:

﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَO﴾ (التوبۃ: ۱۲۰)

یقیناً اللہ تعالیٰ مخلصین کا اجر ضائع نہیں کرتے۔

اور ﴿فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗO﴾ (الزلزال: ۷)

سو جو شخص (دنیا میں) ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ (وہاں) اس کو دیکھ لے گا۔

بہر حال اس میں کسی کو اختلاف نہیں اور اس میں کوئی اشتباہ نہیں کہ خدا تعالیٰ کسی کا کام ضائع نہیں کرتے۔ چوں کہ یہ بہت ظاہر اور مُسلَّم بات ہے، لہٰذا اس وقت یہ بیان سے مقصود بھی نہیں۔ مقصود وہ ہے جو آگے ہے، یعنی تعمیم اس حکم کی کہ عامل کوئی ہو، خواہ مرد ہو یا عورت،

سب کے لیے یہ حکم عام ہے۔ جو نیک عمل کرے اس کا عمل ضائع نہیں کیا جائے گا۔ اور یہ امر مقصود بالبیان اس واسطے تجویز ہوا کہ عورتیں یوں سمجھتی ہیں۔ اور آج کل کی عورتوں پر کیا منحصر ہے، پہلے بھی ایسا ہی ہوا تھا کہ عورتیں یہ سمجھتی تھیں کہ ہم کوئی چیز نہیں، بالکل ردی اور بے کار چیز ہیں، اسی پر یہ آیت نازل ہوئی تھی۔

چناں چہ شانِ نزول اس کا یہ ہے کہ حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ مردوں کے لیے ہجرت کے بڑے فضائل آئے ہیں، عورتوں کا کچھ ذکر نہیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور یہ مضمون کچھ تو عورتوں کے ذہن میں خود ہی ہے اور کچھ بعض مضامین کے سننے سے پیدا ہوگیا ہے۔ جو واعظ بیان کرنے کو اُٹھتا ہے وہ عورتوں کی مذمت ہی کرتا ہے اور ان کے عیوب ہی بیان کرتا ہے۔ ایسے مضامین سنتے سنتے عورتوں کی طبیعتیں سرد ہوگئی ہیں اور یہ کلیہ انھوں ذہن میں جمالیا ہے کہ ہم برے اور بے کار ہیں۔ وہ مضامین بہت سے صحیح بھی ہیں اور یہ کلیہ جو اُن کے ذہن میں آیا ہے بہت کار آمد چیز ہے۔ کیوں کہ یہ تواضع ہے اور اپنے آپ کو مٹانا ہے۔ مگر چوں کہ ایک ہی قسم کے مضامین پر کفایت کی جاتی ہے اور دوسرا رخ نہیں دکھلایا جاتا اس واسطے مفید نہ رہا، کیوں کہ ہر چیز اپنے موقع پر ٹھیک ہوتی ہے۔ جو عورتوں میں عیوب ہیں وہ بھی ٹھیک ہیں، لیکن صرف عیوب ہی نہیں ہیں کچھ اوصافِ حمیدہ بھی ہیں، عیوب کو اپنے موقع پر اور اوصافِ حمیدہ کو اپنے موقع پر بیان کرنے سے نفع ہوسکتا ہے۔ اگر اس کا خیال نہ رکھا جائے اور دونوں میں سے صرف ایک ہی شِق کو بیان کیا جائے تو کوئی مفید نتیجہ نہیں نکل سکتا، بلکہ وہ بیان بالکل مہمل اور بے کار ہوجاتا ہے۔ اور گو اپنے آپ کو لاشے سمجھنا فی نفسہٖ بہت نافع ہے۔ کیوں کہ تواضع ہے۔

تواضع زائد از حد مفید نہیں ہے:

مگر میں تجربہ سے کہتا ہوں کہ اپنے آپ کو بالکل بے کار سمجھنا کسی عارض سے مُضر بھی ہے۔ اگر طبیعت سلیم ہو تو اپنے آپ کو جس قدر کم سمجھے اسی قدر نفع ہوتا ہے اور اگر طبیعت سلیم نہ ہو تو نفع نہیں ہوتا بلکہ ضرر ہوتا ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ نیستی سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔ اہل اللہ نے بڑی بڑی کوششیں کیں کہ اپنے آپ کو مٹادیں، کسی شمار ہی کا نہ رکھیں۔

انھوں نے اس کی کوششیں کیں، اور منجانب اللہ ان پر حالتیں بھی ایسی طاری ہوئیں جس سے ہستی بالکل مٹ جائے۔

باوجودت آواز نیامد کہ منم

اُن کو یہ بھی کہتے شرم آتی ہے اور خدائے تعالیٰ کی جانب سے بھی حالات اسی قسم کے پیش آتے ہیں کہ ان کی ہستی بالکل مٹ جائے۔

ایک بزرگ کا قصّہ متعلق تواضع:

چناں چہ ایک بزرگ کا قصّہ ہے کہ اُن کے وقت میں ایک دفعہ بارش نہ ہوئی، لوگ عقیدت کی وجہ سے ان کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ حضرت! دعا کیجیے کہ بارش ہو جائے۔ فرمایا: میں کیا دُعا کروں؟ یہ میری ہی آفت ہے، یہ میری ہی شامتِ اعمال ہے کہ بارش نہیں ہوتی۔ اس کو معتقدین کب تسلیم کرتے۔ عرض کیا کہ حضرت آپ تو مقبول بندے ہیں اور بزرگ ہیں اور چناں وچنیں ہیں۔ آپ یہ کیا فرماتے ہیں؟ یہ تو ہم لوگوں کی نحوست ہے، ہمارے واسطے استغفار کر دیجیے کہ حق تعالیٰ ہمارے گناہوں پر نظر نہ فرماویں اور اپنی طرف سے رحمت نازل فرماویں۔ فرمایا: میں سچ کہتا ہوں کہ یہ میری ہی نحوست ہے، جب تک میں شہر میں رہوں گا رحمت نہ ہوگی۔ لوگ مجبور ہوئے اور اُن کو شہر سے باہر پہنچا دیا۔ بس اُن کا شہر سے نکلنا تھا کہ فوراً بارش ہوگئی۔

کیا ٹھکانا ہے حق تعالیٰ کے معاملات کا، کوئی سمجھ نہیں سکتا۔ ان کی تربیت کی تکمیل مقصود تھی، اسی واسطے ایسا ہوا کہ جب تک وہ شہر میں رہے بارش نہیں ہوئی، تو اس میں یہ راز ہوسکتا ہے کہ اس تواضع پر عمل کرنے کی برکت سے بارش ہوئی ہو۔ غرض وہ لوگ خود اپنے آپ کو مٹاتے ہیں اور حق تعالیٰ بھی اُن کے واسطے ایسا ہی سامان کرتے ہیں کہ ان کی ہستی بالکل مٹ جائے، اپنے آپ کو مٹانے پر ایک اور حکایت یاد آئی۔

قصّہ سید احمد رفاعی رحمہ اللہ بابت تواضع:

ایک بزرگ تھے سید احمد رفاعی رحمہ اللہ۔ یہ حضرت سیدنا غوثِ پاک کے معاصر ہیں۔ یہ

اتنے بڑے شخص ہیں کہ جب مدینہ طیّبہ پہنچے وہاں روضۂ اقدس ﷺ کے اوپر ذوق وشوق کی حالت میں یہ شعر پڑھے:

في حالة البعد روحي كنت أرسلها تقبل الأرض مني وهي نائبتي
وهذه نوبة الأشباح قد حضرت فامدد يديك لكي تحظي بها شفتي

جن کا مطلب یہ ہے کہ جب ہم دُور تھے تو اپنی روح کو بھیج دیا کرتے تھے، وہ روضۂ اقدس ﷺ پر زمین بوس ہوجایا کرتی تھی۔ اب جسم کے حاضر ہونے کی نوبت آگئی۔ ذرا اپنے دستِ مبارک کو بڑھایئے، تاکہ میرا لب اُس سے بہرہ ور ہوسکے، ہونٹوں کو یہ دولت نصیب ہوجائے۔

جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ روضۂ منورہ کے اندر سے ایک نہایت نورانی ہاتھ ظاہر ہوا، وہ حضور ﷺ کا دستِ مبارک تھا۔ انھوں نے دوڑ کر بوسہ دیا اور بے ہوش ہوگئے۔ بس ہاتھ غائب ہوگیا مگر کیفیت یہ ہوئی کہ تمام مسجد نبوی میں نور ہی نور پھیل گیا۔ ایسا نور کہ اس کے سامنے آفتاب کی بھی کوئی حقیقت نہ تھی اور واقعی آفتاب کی اس نور کے سامنے کیا حقیقت ہوتی۔ جب ان کو افاقہ ہوا تو خیال ہوا کہ میری بڑی عظمت ظاہر ہوگی جس سے میں ہلاک ہوجاؤں گا۔ پس کیا کیا، کہ دروازہ پر جاکر زمین پر لیٹ گئے اور پکار کر کہا کہ میں سب کو قسم دیتا ہوں کہ میرے اوپر سے پھاندتے ہوئے اور مجھ کو روندتے ہوئے جائیں۔ یہ اس واسطے کیا کہ عجب پیدا نہ ہوجائے کہ میں ایسا ہوں کہ میرے واسطے ایسا ایسا ہوا۔ چناں چہ کوتاہ نظر عوام الناس نے یہی کیا کہ سب اُن کو اوپر کو پھاندتے ہوئے گئے۔ ان کو اس میں لُطف آتا تھا اور اس کی کچھ بھی پروانہ تھی کہ ابھی کیا شان تھی اور ابھی کیا گت بن رہی ہے۔

ایک بزرگ سے جو کہ اس مجمع میں موجود تھے۔ اس قصّے کے بعد کسی نے پوچھا کہ آپ بھی اُن کے اوپر پھاند کر گئے تھے؟ کہا: توبہ توبہ! یہ کیسے ہوسکتا تھا، خدا کا غضب فوراً نازل ہوتا اگر میں ایسا کرتا۔ عوام تو معذور ہیں، کیوں کہ ان کو پہچانتے نہ تھے۔ اور جو اُن کو پہچانتا ہو وہ بے ادبی کرے تو فوراً پکڑلیا جائے گا۔ ان بزرگ سے اس شخص نے یہ پوچھا کہ آپ کو رشک تو بہت ہوا ہوگا۔ فرمایا: میں کیا؟ اس وقت ملائکہ کو بھی رشک تھا کہ ہمیں بھی یہ دولت نصیب

ہوتی۔تو اخفائے حالات کی یہ حالت ہوتی ہے۔اور کبھی کسی کمال کو ظاہر بھی کردیا ہے تو وہ اُس اظہار کے ماذون بلکہ مامور تھے۔سو جب اس کے اظہار کے لیے کوئی حکم ہوجاتا ہے اس کو نہیں چھپا سکتے، اس وقت کوئی بات ظاہر ہوجاتی ہے۔سو کمالات کو چھپایا ہے، بلاغات کو نہیں چھپایا ہے، یعنی احکام کو پوشیدہ نہیں رکھا۔لیکن اِس صورت میں بھی جبکہ حکم سے ان کا کوئی کمال ظاہر ہوگیا تو انھوں نے دوسرے طریق سے اپنے آپ کو اس قدر مٹایا کہ کسی کو نیک گمان اُن کی طرف ہو ہی نہ سکے۔ یہ حالت تھی مٹانے کی جو آپ نے ابھی سنی۔

غرض اپنے آپ کو مٹانا جس کو تواضع کہتے ہیں بڑے کام کی اور نفع کی چیز ہے۔ یہ مٹانا وہ چیز ہے جس کے حاصل کرنے کے واسطے بندگانِ خدا نے سلطنتیں چھوڑ دیں، دنیا بھر کی پروا نہ کی۔کوئی بات تو تھی جس کی بدولت دنیا بھر سے اس کو ترجیح دیتے تھے۔تو یہ صفت جس درجہ تک بھی کسی میں ہو محمود اور مقصود ہونی چاہیے۔مگر ساتھ ہی ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اگر طبیعت سلیم نہ ہو تو اس سے نقصان بھی پہنچتا ہے۔ چناں چہ مایوسی اور ناامیدی پیدا ہوجاتی ہے۔ انسان سمجھنے لگتا ہے کہ میں تو کچھ ہوں ہی نہیں، نہ میرا نماز روزہ کچھ ہے، نہ اتنی طاقت ہے کہ مقصود تک پہنچوں۔مقصود ہر طرح دور ہی دور ہے۔بس اس وقت شیطان بہکاتا ہے کہ ارے! بیٹھ بھی رہ، محنت بھی کرے گا، دنیا کی لذات کو بھی چھوڑے گا اور ہوتا ہوا کچھ ہے نہیں۔بس یہ شخص مایوس ہو کر کام چھوڑ بیٹھتا ہے۔

یہ سب اسی تواضع کے نتائج ہیں جس کو غلطی سے علی الاطلاق محمود کہا جاتا ہے اور جس میں واقع میں تفصیل ہے۔اور یہ نہ سمجھیے کہ یہ دھوکہ عوام ہی کو لگتا ہے، درویشوں کو بھی لگتا ہے۔ایک شخص ذکراللہ کرتا تھا، تہجّد کو اٹھتا تھا۔شیطان نے کہا: ارے! بڑے حوصلے کی ضرورت ہے اللہ اللہ کرنے کے لیے، تو نے اتنا اللہ اللہ کیا، کیا فائدہ ہوا؟ دماغ خراب کیا، مغز مارا، مگر وہاں سے کوئی رسید ہی نہیں ملتی۔بس وہ شخص مایوس ہو کر آرام سے مکان میں جا کر سو رہا۔اور سوتے وقت ہی نیت کرلی کہ تہجّد کو نہ اٹھوں گا۔فائدہ کیا جب اتنے دن محنت کی اور کچھ نہ ہوا، آگے ہی کیا ہوگا؟ بس وہ کام سے رہ گیا۔بہت لوگ ایسے ہیں کہ اعمالِ صالحہ پر جب ثمرات مرتب نہ ہوئے، اعمال سے بددل ہوجاتے ہیں۔ دنیا دار تو ظاہری ثمرات کو دیکھتے ہیں اور دین دار

باطنی ثمرات کو دیکھتے ہیں۔ چناں چہ دنیا داروں کی تو یہ حالت ہے کہ ذرا دنیا کی فلاح میں دیر ہوئی تو دین سے بے زار ہو گئے۔

ایک پیش کار صاحب مصلی پر رشوت لیتے:

چناں چہ ہمارے عزیزوں میں ایک صاحب انسپکٹر تھے، جو نماز نہیں پڑھتے تھے اور ان کی بیوی نمازی تھی۔ ایک دن بیوی نے کہا کہ آپ بھی نماز پڑھا کیجیے۔ کہنے لگے کہ تجھی کو نماز سے کیا وصول ہوتا ہے جو میں بھی پڑھا کروں؟ وصول کیا ہوتا، آج کل لوگ وصول اسے سمجھتے ہیں، جیسے ایک پیش کار صاحب تھے، وظیفچی بہت تھے، صبح کی نماز کے بعد مصلی ہی پر بیٹھے رہتے اور وظیفہ پڑھتے رہتے۔ اشراق پڑھ کر مصلی اٹھایا جاتا، مگر اس مصلی پر ہی بیٹھے بیٹھے رشوت لیتے۔ مصلی اور رشوت کا بھی کیا جوڑ ملایا ہے:

هر گناه که کنی در شب آدینه بکن
تا که از صدر نشینانِ جهنّم باشی

اہلِ معاملہ آتے اور رشوت کی بات چیت کرتے، تو یہ منہ سے نہ بولتے، اشاروں میں جواب دیتے کہ ایک انگلی اٹھادی، مطلب یہ ہوا کہ ایک سو لیں گے۔ دو اٹھادیں، دو سو لیں گے۔ پانچ اٹھادیں، پانچ سو لیں گے۔ بولتے اس واسطے نہیں کہ وظیفہ خراب ہو جائے گا۔ یہ عجیب بات ہے کہ وظیفہ میں بولنا تو ناجائز مگر رشوت لینا جائز۔

تقوی کلابی:

یہ تقوی کلابی کہلاتا ہے کہ کتا ٹانگ اٹھا کر موتتا ہے۔ ایسا محتاط ہے کہ ٹانگ کو پیشاب سے بچاتا ہے مگر منہ سے پائے خانہ کھاتا ہے۔ پاؤں مُوت میں آلودہ نہ ہو، چاہے منہ گوہ میں بھر جائے اور گوہ پیٹ تک پہنچ جائے۔ اسی طرح یہ پیش کار صاحب زبان کو تو بچاتے کہ وظیفہ خراب نہ ہو جائے، مگر پیٹ کو رشوت سے بھر لیتے۔ کوئی کہتا اتنا لایا ہوں، پیش کار صاحب اشارہ سے کہتے: نہیں، اتنا لیں گے۔ خیر اسی طرح لوٹ پھیر کر کے رشوت اشاروں ہی میں طے ہو جاتی۔

میانِ عاشق ومعشوق رمزے نیست
کراماً کاتبین را ہم خبر نیست

جب اشراق پڑھ کر اٹھتے تو ڈیڑھ سو، دوسو، تین سو روپے مصلی کے نیچے سے نکلتے تھے۔ یہ روز کی آمدنی تھی۔ کسی منحوس دن میں ایسا ہوتا کہ دس بیس روپے ہوتے۔ یہ بار آور نماز تھی، اسی کو وصول سمجھا جاتا ہے۔ تو انسپکٹر صاحب نے جو بیوی سے سوال کیا کہ تجھے نماز سے کیا وصول ہوتا ہے؟ یہی وصول مراد ہوگا۔ اسی بنا پر جو نماز پڑھی اور روپیہ نہ ملا تو ان کا کہنا ٹھیک ہے کہ فائدہ کیا ہوا؟

بعض لوگ اسی واسطے اعمال کرتے ہیں کہ دنیا حاصل ہو۔ روپیہ پیسہ ملے، دنیا کی حاجتیں پوری ہوں، یہ تو اہلِ دنیا کے قصّے ہیں۔ ان قصوں کو سن کر دین دار ہنستے ہیں کہ کیا دین داری ہے کہ دین کو ذریعہ بنایا دنیا کے حاصل کرنے کا؟ مگر یہ لوگ سن لیں کہ آپ میں سے بھی بعض ان ہی کی طرح دنیا میں مبتلا ہیں اور دین سے دنیا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اس طرح مبتلا ہیں کہ ذکر شغل سے خاص ثمرات کے طالب ہوتے ہیں۔ اس طرح کہ فقیر بنیں، لوگوں میں مشہور ہو کہ یہ بزرگ ہیں اور مجاہدے کرتے ہیں، تاکہ لوگوں کے ذہنوں میں ان کی عزت ہو۔ اگر کبھی کسی وجہ سے ان کی عزت میں فرق آ گیا تو سمجھے کہ ہمارا ذکر شغل بے کار ہے، کیوں کہ اس کا ثمرہ نہیں پایا جاتا۔ یہ تو طالبِ جاہ ہیں اور بعض طالبِ کیفیات ہوتے ہیں۔ اگر کبھی کیفیات نہ طاری ہوئیں تو دل گھٹ گیا۔ یہ طلبِ کیفیات کسی درجہ میں طبعی بات ضرور ہے، مگر سمجھ دار آدمی کو کیفیات پر نظر نہ رکھنا چاہیے۔ اسی طرح جاہ کی حالت ہے کہ اکثر دین دار کی عزت ذہنوں میں ہوتی ہے، لیکن ذکر سے عزت کو مقصود نہ بنانا چاہیے۔ اس طرف التفات ہی نہ کرنا چاہیے، کوئی عزت کی نظر سے دیکھے یا ذلت کی نظر سے، ان کو اس کی کچھ پروا نہ کرنی چاہیے۔ اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے، ورنہ یہ ہوتا ہے کہ بعض وقت جو کم فہموں میں ان کی عزت نہیں ہوتی کیوں کہ ان کے قلب میں دین ہی کی وقعت نہیں ہوتی، تو یہ اس ذلت کو دیکھ کر عمل ہی چھوڑ بیٹھتے ہیں۔

غرض وہ شخص جو رسید کا منتظر تھا یہ نیت کر کے سو گیا کہ میں تہجّد میں نہ اٹھوں گا۔ خواب

میں فرشتہ کے ذریعہ سے اس کو متنبہ کیا گیا۔ بات یہ ہے کہ اس نے تو ذکر کو چھوڑنا چاہا، مگر حق تعالیٰ نے نہ چاہا کہ اس کو اس طرح چھوڑ دیں۔ فرشتے نے کہا کہ بھائی! حق تعالیٰ یوں فرماتے ہیں کہ آج تُو نے میرا نام کیوں نہیں لیا؟ کہا: میں عرصہ سے نام لیتا تھا، مگر ادھر سے کچھ جواب ہی نہیں ملتا۔ میں یہ سمجھا کہ میرا عمل قبول نہیں ہوتا۔ جب عمل قبول نہیں ہوتا تو اس کا کرنا فضول ہے۔ میں پکارتا ہوں، مگر ادھر سے نہ سلام ہے، نہ جواب ہے۔ بس میری ہمت ٹوٹ گئی۔ جواب میں ارشاد ہوتا ہے جس کو مولانا نقل فرماتے ہیں:

گفت آں اللہ تو لبّیک ما است
ایں نیاز وسوز ودردست پیک ماست

یعنی وہ تیرا اللہ اللہ کہنا ہی ہمارا جواب ہے، اگر ہم کو تیرا اللہ اللہ کہنا پسند نہ ہوتا تو دوبارہ توفیق ہی نہ ہوتی۔ تمام عالَم بھرا پڑا ہے، اللہ اللہ کون کرتا ہے سوا اس کے جس کو ہم توفیق دیں۔ جب ہم نے توفیق دی تو یہ سمجھ لینا چاہیے ہم کو تیرا عمل پسند ہے۔

یہ بات ذاکرین کے لیے کس قدر تسلّی دہ اور ہمت بڑھانے والی ہے۔ گو ہمارا ذکر ہرگز اس قابل نہیں کہ قبول کیا جاسکے، مگر ان کی رحمت ہے کہ ایسے ذکر کو بھی قبول کر لیتے ہیں۔ مولانا دوسری جگہ فرماتے ہیں:

ایں قبول ذکر تو از رحمت است
چوں نماز مستحاضہ رخصت است

یہ آپ کا ہمارے ذکر کا قبول فرمانا رحمت ہی ہے، جیسے مستحاضہ کی نماز رخصت کی بنا پر قبول فرمالیتے ہیں۔

دیکھیے مستحاضہ کی اور بیمار کی کیا نماز ہے؟ خون پیپ بہہ رہا ہے، اَحکم الحاکمین کے دربار میں ان نجاستوں کے ساتھ کھڑے ہونے کی کیا ہمت ہوسکتی ہے؟ مگر یہ حکم ہے کہ اسی طرح پڑھ لو۔ خدا تعالیٰ کی رحمت ہے کہ ایسی نماز بھی قبول کر لی جاتی ہے۔ خیر اُس شخص سے فرشتہ نے کہا کہ تُو نے غلط سمجھا۔ ایک بار کے بعد دوبارہ ذکر کی توفیق ہوئی تو قبول ہی کی علامت ہے۔ اس کو سن کر اس کا دل بڑھا اور اٹھ بیٹھا اور تہجّد پڑھی اور ذکر کرنے لگا۔ غرض دل گھٹنے

سے عمل میں قصور رہتا ہے، کیوں کہ عمل کرنے والا یوں سمجھتا ہے کہ میرا عمل کسی کام کا تو ہے نہیں، پھر میں کیوں تکلیف اٹھاؤں اور دوسرے کاموں میں کیوں خرچ کروں۔

بعض واعظ صرف ترہیب کرتے ہیں:

بعض واعظ ایک طرف سے سب کو ایک ہی طرح ہانکنا شروع کردیتے ہیں۔ ان کے تمام بیان میں ترہیب ہی ترہیب ہوتی ہے، انھوں نے ترغیب کا سبق ہی نہیں پڑھا۔ بس ان کا وعظ یہ ہوتا ہے کہ تمہاری نماز کچھ نہیں، تمہارا روزہ کچھ نہیں، حج تمہارا بے کار، زکوۃ تمہاری فضول۔ اس کا اثر یہ نہیں ہوتا کہ سننے والے نماز، روزہ اور اعمال کی اصلاح کریں، بلکہ ہمت ہار کر جو کچھ برا بھلا عمل کرتے تھے اس کو بھی چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ جیسے ایک گنوار کا قصّہ ہے کہ گاؤں میں ایک واعظ صاحب آئے اور انھوں بیان کیا کہ جب تک نیت نہ کرے روزہ نہیں ہوتا اور نیت بتائی کہ یوں کہنا چاہیے: بصوم غد نویت. کوئی ایسے ہی ٹٹ پونجیا واعظ ہوں گے جیسے گشتی واعظ اور کھانے کمانے والے ہوا کرتے ہیں، ورنہ نیت کی حقیقت[۱] بھی بیان کردیتے، پھر غلطی نہ ہوتی۔ اگلے دن کیا دیکھتے ہیں کہ دن میں چودھری صاحب بے دھڑک حقہ پی رہے ہیں۔ کہا: مردود! رمضان ہے، تو نے روزہ نہیں رکھا۔ کہا: مولوی جی! خفامت ہو، تم ہی نے تو مسئلہ بیان کیا تھا کہ بے نیت کے روزہ نہیں ہوتا اور جو نیت تم نے بتائی تھی وہ مجھے یاد نہیں ہوئی، اب اسے یاد کرکے روزہ رکھا کروں گا۔ آج میں نے سوچا کہ جب روزہ تو ہوا نہیں، پھر حقہ کا ذائقہ کیوں چھوڑوں؟

اس حکایت کو سن کر ہم لوگ ہنستے ہیں اور اس روزہ نہ رکھنے والے کو گنوار اور بے وقوف سمجھتے ہیں۔ مگر انصاف سے کہیے کہ اس میں قصور کس کا ہے؟ قصور واعظ کا ہے کہ بات کہی مگر ادھوری، مسئلہ اس طرح بتایا کہ اس گنوار سے اس پر عمل نہ ہوسکا۔ جب اس نے دیکھا کہ اس طرح عمل کرنا میرے بس کا نہیں ہے تو عمل ہی کو چھوڑ دیا۔ یہی اثر ان واعظوں کے بیان کا ہوتا ہے جو نری ترہیب ہی ترہیب بگھارتے ہیں اور اس کی تائید میں پرانے بزرگوں کے مجاہدوں کے قصّے بیان کرتے ہیں کہ فلاں بزرگ نے پانی پینا چھوڑ دیا تھا، فلاں بزرگ نے

[۱] نیت کی حقیقت ارادہ کرنا ہے۔ جب دل میں خیال ہے کہ کل روزہ رکھیں گے تو نیت ہوگئی۔

جوتا پہننا چھوڑ دیا تھا، فلاں بزرگ نے تمام عمر میں اتنے جو کھائے تھے۔ تم کیا کر سکتے ہو؟ تمہاری کیا نماز ہے؟ تمہارا کیا روزہ ہے؟ تمہارا کیا ذکر ہے؟ کیا شغل ہے؟ بس سننے والے سمجھ لیتے ہیں کہ ہم ایسے تو ہونے سے رہے اور بلا ایسے ہوئے کسی شمار میں نہیں، لہٰذا قصّہ ختم کرو کہ کچھ بھی نہ کرو۔

سخت تعلیم نہ چاہیے:

میں مشورہ دیتا ہوں کہ اہل تربیت کو، کبھی ایسی سخت تعلیم نہ کریں۔ اگر کسی سختی کی ضرورت بھی ہو تو عنوان اس کا نرم ہونا چاہیے۔ اس میں راز وہی ہے کہ طالب کو وحشت نہ ہو جاوے اور اس کو گراں سمجھ کر اصل کام سے بھی نہ رہ جاوے۔ اتنی تنگی نہیں چاہیے کہ وہ اس کو تکلیف مالایُطاق سمجھ لے۔ میں بعض دفعہ دوستوں کو مستحبات کی تاکید نہیں کرتا۔ اس وجہ سے کہ کہیں وہ تنگ ہو کر ضروریات سے بھی نہ رہ جائیں۔

اس واسطے میں کہتا ہوں کہ موقع اور محل اور مخاطب کے خاص حالات کی رعایت کی نہایت ضرورت ہے۔ بعض لوگ سختی کرتے ہیں اور طالبین کو مشکلات میں ڈال دیتے ہیں۔ میں مخاطب کی رعایت بہت زیادہ کرتا ہوں، حتیٰ کہ بعض وقت کسی کے ساتھ بہت نرمی کی جاتی ہے اور کسی فعل پر روک ٹوک نہیں کی جاتی، جو ظاہراً مداہنت ہی معلوم ہوتی ہے۔ اس پر بعض دیکھنے والے کہنے لگتے ہیں کہ اس شخص کو یہ ٹوک دیتے یا اس کام کا امر کر دیتے تو یہ شخص ضرور مان لیتا۔ ایسے موقع پر چُوکنا نہ چاہیے تھا۔[1]

بات یہ ہے کہ ہر کام کا ایک آدمی ہوتا ہے، وہ اس کے موقع محل کو سمجھتا ہے، اس کو مشورہ دینے کی ضرورت نہیں اور مشورہ دینا بھی ہو تو اس وقت نہیں دینا چاہیے۔ یہ تو اعتراض کی صورت ہے۔ اگر خیر خواہی اور دل سوزی ہے تو کسی وقت تنہائی میں کہہ دیا جائے تو مضائقہ

---

[1] جیسے ایک ڈپٹی صاحب کو ریل کے سفر میں نماز کے وقت حضرت والا نے نماز کے لیے نہ کہا اور خود نماز پڑھی، جس کو اُنہوں نے دیکھا لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ یہ معتقد ہیں اگر حضرت والا ذرا اِشارہ کرتے تو نماز میں ضرور شریک ہو جاتے لیکن اِس چشم پوشی کا یہ اثر ہوا کہ وہ خود بہت شرمندہ ہوئے اور ہمیشہ کے لیے نمازی بن گئے۔

نہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس وقت دوسروں کی سمجھ میں اس کے فعل کی غایت نہیں آتی، کیوں کہ نتیجہ کچھ زمانے کے بعد مترتب ہونے والا ہوتا ہے جس کو یہ سمجھتا ہے دوسرا نہیں سمجھتا، اس لیے وہ اس فعل کو فضول سمجھ رہا ہے۔

دیکھیے! اناج ربیع میں بویا جاتا ہے، بوتے وقت کوئی ناواقف دیکھنے والا کہہ سکتا ہے کہ اتنا اناج مٹی میں غارت کیا جارہا ہے۔ لیکن بونے والا جانتا ہے کہ اس کا نتیجہ چند روز میں نکلے گا اور اس تلف شدہ اناج کا بدلہ دوچند سہ چند ملے گا۔ غرض جس شخص کو کسی کام کا اہل مان لیا جاوے اس کے افعال پر اعتراض نہ کرنا چاہیے۔ اگر کسی کے فعل کی حکمت سمجھ میں نہ آئے تو کسی وقت اس سے بطور عرض کے سوال کیا جاسکتا ہے، اِعتراض کی اصلاً گنجایش نہیں کیوں کہ اس کو جاننے والا تسلیم کیا جاچکا ہے۔

مدرسوں کے نظم ونسق پر اعتراض کرنا:

اس میں یہ بھی داخل ہے کہ بعض لوگ مدرسوں میں جاتے ہیں تو طرح طرح کی رائے دیتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ کورس ایسا ہونا چاہیے، کوئی کہتا ہے: خودداری کی تعلیم ہونا چاہیے۔ تم کیا جانو؟ جو لوگ اس کے اہل ہیں، جن کے ہاتھ میں مدرسہ ہے وہ اس کے نشیب وفراز کو سمجھ سکتے ہیں یا آپ؟ بس جب آپ نے ان کے ہاتھ میں مدرسہ دے دیا ہے تو ان کی رائے میں دخل نہ دیجیے۔ ہاں اگر ان میں نااہلیت ثابت ہوجائے تو ان کو معزول کر کے کسی دوسرے اہل کے ہاتھ میں مدرسہ دے دیجیے اور اس دوسرے کے بارہ میں بھی میں یہی کہوں گا کہ اس کی رائے میں دخل مت دینا۔ یہ بڑی غلطی ہے کہ ایک شخص کو کسی کام کا اہل مان کر پھر اس کی رائے کو نہ مانا جائے اور اس کے مقابلہ میں رائے زنی کی جائے۔ غرض جو آدمی جس کام کا ہو اس کو کام کرنے دو۔

میرے یہاں تشدد بھی ہوتا ہے:

میرے یہاں بعض وقت کسی پر تشدد بھی کیا جاتا ہے، جس پر بعض دفعہ دوسروں کو رحم آتا ہے۔ لیکن میرے یہاں (میں دعوے سے نہیں کہتا) بفضلہٖ تعالیٰ جس کے ساتھ جو برتاؤ کیا

گیا،اخیر میں اکثر وہ اسی کا اہل ثابت ہوا۔ یہ کچھ میرا کمال نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کی تائید ہے۔خلاصہ یہ کہ مخاطب کی رعایت کرنا عموماً نہایت ضروری ہے اور خصوصاً اہل تربیت کے لیے تو بہت ہی لازم ہے۔ اور یہ طریقہ مفید نہیں کہ جب بیان ہو تو ترہیب ہی کا ہو۔ جیسا آج کل واعظوں کی عادت ہے۔اگر عورتوں کو ہمیشہ دوزخی دوزخی کہا جائے گا تو دوخرابیاں ہوں گی: یا تو وہ نماز روزہ بالکل ہی چھوڑ دیں گی، یا کریں گی مگر دل بجھا ہوا رہے گا، رحمت سے مایوسی ہوجائے گی اور آپ نے سنا ہوگا کہ خدا تعالیٰ کی رحمت سے مایوسی کفر ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ واعظ صاحب ممبر پر تو بیٹھتے ہیں تقویٰ سکھلانے کو اور طرز بیان ایسا ہے جس نے ایک مومن کو کافر یا قریب بکفر بنا دیا یا اس کا دل شکستہ کر دیا، حتی کہ وہ بے چاری اپنے آپ کو خدا کی رحمت سے مایوس سمجھنے لگی۔ میں نہیں سمجھتا کہ آخر عورتوں کو بات بات پر دوزخی کیوں کہا جاتا ہے؟ کیا وہ نماز نہیں پڑھتیں؟ کیا وہ روزہ نہیں رکھتیں؟ روزہ رکھنے میں تو وہ مردوں سے بھی آگے ہیں۔ غرض جس طرح مرد عمل کرتے ہیں اسی طرح عورتیں بھی کرتی ہیں۔ اگر ان کے اعمال کو بے کار کہا جاتا ہے تو کیا مردوں کے سب اعمال باکار ہیں۔

سچ بات یہ ہے کہ حقیقت پر اگر نظر کی جائے تو عمل تو سب ہی کے بے کار ہیں، حق تعالیٰ کی شان کے موافق کوئی بھی عمل نہیں کرسکتا۔ پھر کسی فریق کو کیا حق ہے کہ اپنے عمل کو باکار سمجھے اور دوسرے کے اعمال کو بے کار۔ اگر ایک فریق کو حق تعالیٰ کی رحمت سے ایسے بے کار اعمال کے قبول ہوجانے کی امید ہوسکتی ہے تو دوسرے فریق کو کیوں نہیں ہوسکتی؟ اول تو نجات کا اصلی مدار رحمت پر ہے، مگر عمل کو جتنا دخل ہے عورتیں بھی اس سے محروم نہیں، عورتیں بھی عمل کرسکتی ہیں اور کرتی ہیں تو سب کو ایک لکڑی سے ہانکنا کیسے درست ہوسکتا ہے؟ واعظوں کی مہربانی سے عورتوں کے ذہن میں علی العموم یہ بات جم گئی ہے کہ ہمارے اعمال بالکل نکمے ہیں اور ہمارا انجام دوزخ کے سوا کچھ نہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انہوں نے ہمت ہار دی ہے اور اپنی اصلاح کی طرف توجہ بھی نہیں کرتیں۔ میں کہتا ہوں: یہ بڑی غلطی ہے، خدا تعالیٰ کی رحمت تنگ نہیں ہے، نہ کسی کے ساتھ اس کو خصوصیّت ہے۔

جیسے مردوں کے اعمال ویسے ہی عورتوں کے:

تمہاری نماز لنگڑی لنجی کیسی بھی ہو، اگر مردوں کی نماز حق تعالیٰ کے یہاں کوئی قدر رکھتی ہے تو تمہاری نماز بھی وہی قدر رکھتی ہے۔ بیبیو! ہمت نہ ہارو اور ایسے واعظوں کے کہنے کو مت سنو۔ حق تعالیٰ کی رحمت تو تم پر اسی وقت متوجہ ہوگئی جب تم کو نماز کی توفیق دی۔ رہا تمہارا یہ کہنا کہ ہماری نماز ہی کیا؟ یہ قول بہت اچھا ہے، مگر اس میں دو حیثیتیں ہیں: ایک تو یہ کہ یہ ہمارا فعل ہے، اس معنی کو یہ بالکل صحیح ہے، کیوں کہ اپنی چیز کو ہمیشہ گھٹیا ہی سمجھنا چاہیے۔ اور ایک حیثیت یہ کہ خدا تعالیٰ نے ہم کو اس توفیق دی، اس معنی پر یہ قول صحیح نہیں ہے، کیوں کہ اس صورت میں وہ خدا تعالیٰ کا عطیّہ ہے اور خدا تعالیٰ کی نعمت کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیے۔ نماز لنگڑی لنجی ہو، اس حیثیت سے کہ عطیۂ خداوندی ہے بہت بڑی نعمت ہے، اگر اس کی بھی توفیق نہ ہوتی تو کیا کرتے؟ اگر ایک شخص کو روکھی روٹی ملے تو اس کو ناک مار کر کھانا کفرانِ نعمت ہے، کیوں کہ اگر یہ بھی نہ ملتی تو اس کا کیا بس تھا؟ اب واعظوں نے ایک حیثیت کو تو غائب کر دیا اور ایک پر نظر کر رکھی ہے۔ لہٰذا جب بیان کریں گے تو یہی کہ تمہاری نماز کیا اور تمہارا روزہ کیا؟ واعظ صاحب سے کوئی پوچھے کہ آپ کی نماز میں بھی تو دو حیثیتیں ہیں، اس میں بھی اسی ایک حیثیت پر نظر کیوں نہیں رکھتے؟ عورتوں کو ہی کیوں خطاب کرتے ہو کہ تمہاری نماز کیا اور روزہ کیا؟

تواضع بے محل کے متعلق ایک قصّہ:

مجھے اس لفظ پر کہ اپنی چیز کو گھٹیا سمجھنا چاہیے ایک حکایت یاد آئی۔ ایک مرتبہ میں انٹر کلاس میں سفر کر رہا تھا۔ میری اکثر عادت تو تیسرے درجہ میں سفر کرنے کی ہے، مگر بعض دفعہ اس میں تکلیف ہوتی ہے تو ایسے موقع پر میں اس کو بھی تکلّف سمجھتا ہوں کہ تھرڈ میں سفر کرنے کو اپنی وضع بنالیا جاوے۔ ہجوم وغیرہ کے موقع پر میں بے تکلّف انٹر میں سفر کر لیتا ہوں۔ چناں چہ آرام کے خیال سے اس وقت انٹر کلاس میں سفر کر رہا تھا جس میں تین چار جنٹلمین بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے عمر بھر کبھی ایسی غیر مہذب صحبت کا اتفاق نہیں ہوا جیسی غیر مہذب جماعت سے اس دن سابقہ پڑا، حالاں کہ وہ معمولی درجہ کے لوگ نہ تھے بلکہ بڑے بڑے درجہ کے لوگ

تھے۔ ایک جنٹ تھے اور ایک وکیل تھے اور خدا جانے کیا تھے؟ غرض ممتاز لوگ تھے۔ انھوں وہ خرافات آپس میں بکنا شروع کی کہ سننے والا شرما جائے۔ اتفاق سے ایک ہندو مُنصِف بھی اسی ڈبہ میں آ بیٹھے۔ عہدہ اس کا بھی بڑا تھا مگر غیر مذہب کا آدمی تھا۔ جنٹلمینوں نے آپس میں فحش فحش اشعار پڑھنا شروع کیے۔ مُنصِف صاحب کی کم بختی آئی کہ کسی شعر پر آپ بول اٹھے کہ ہاں صاحب! ذرا پھر پڑھیے۔ انہوں نے وہ شعر تو دوبارہ پڑھا نہیں، مگر مُنصِف صاحب کے سر ہو گئے۔ ایک بولا: اچھا آپ بھی شاعر ہیں؟ اس نے کہا: جی نہیں، میں شاعر تو نہیں۔ دوسرے بولے: آپ ضرور شاعر ہیں۔ اس جماعت کی یہ حالت تھی جیسے بھانڈ ہوتے ہیں کہ ایک سے ایک بڑھ کر۔ تیسرا بولا: آپ یقینی شاعر ہیں۔ آپ کا تخلّص مسکین ہے۔ ایک بولے آہ آہا!! تو یہ شعر آپ ہی کا ہے۔

مسکین خر اگرچہ بے تمیز است
چوں بار ہمے بود عزیز است

غرض بے چارے کو ایک مشغلہ بنا دیا، مگر منصف صاحب کچھ نہ کہہ سکے، کیوں کہ وہ خود ہی اپنے ہاتھوں بلا میں پھنسے تھے۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ آپ کا خود ہی جی چاہا مسخرہ بننے کو۔ ایسے بھانڈوں کو چھیڑا ہی کیوں تھا؟ پھر انھوں نے ایک حرکت یہ کی کہ جب دسترخوان بچھایا اور کھانا نکالا گیا تو ایک بولا: آیئے مُنصِف صاحب! آپ بھی کچھ گوہ مُوت کھا لیجیے۔ دوسرا بولا: تم بڑے بدتمیز ہو کہ کھانے کو گوہ موت کہتے ہو۔ اس نے کہا: میاں! اپنی چیز کو ہمیشہ گھٹیا نام سے یاد کرنا چاہیے۔ اسی کا نام تواضع ہے۔ اپنے کھانے کو کھانا کہنا تکبّر ہے۔ میں تو چادر لپیٹ کر ایک طرف کو لیٹ گیا اور دل ہی دل میں کہہ رہا تھا کہ اے اللہ! ایسا نہ ہو کہ مجھ پر بھی کچھ عنایت ہو۔ خدا کا شکر ہے کہ مجھ پر تو کچھ عنایت نہیں ہوئی اور شاید وہ منصف صاحب کو بھی کچھ نہ کہتے مگر ان کی کم بختی نے خود ہی دھکا دیا کہ اپنے آپ پنچوں میں شامل ہوئے اور بجلی کے تار کو ہاتھ لگا یا۔

خیر! مجھے یہ حکایت صرف اتنی مناسبت سے یاد آ گئی کہ اپنی چیز کو گھٹیا نام سے یاد کرنا چاہیے۔ اتنی بات تو صحیح ہے، مگر جیسا گھٹیا نام ان جنٹلمینوں نے اپنے کھانے کو دیا وہ نہایت

بدتمیزی اور بدتہذیبی کا نمونہ تھا۔ کھانے کو گوہ موت کہنا تو اضع نہیں ہے۔ کھانا خدا کا رزق ہے، اس کو اپنی طرف نسبت کرتے ہوئے مگر کسی قدر گھٹیا نام سے یاد کر سکتے ہیں۔ مثلاً دال روٹی، یا آب ونمک کہہ دیا جائے۔

کھانے کو گوہ موت کہنا:

مگر نہ اس قدر گھٹانا کہ گوہ موت ہی کہہ دیا جائے۔ کیوں کہ کھانے میں یہ بھی تو ایک حیثیت ہے کہ وہ خدا کا رزق ہے، اسی لحاظ سے وہ بہت کچھ معظّم ومکرم ہے۔ غرض یہ ان کا مسخرہ پن تھا کہ رزق کے لیے ایسے الفاظ بے ہودہ استعمال کیے۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر۔ اللہ والوں کے یہاں جیسی دیکھی، کہیں نہ دیکھی۔

مولانا فضل رحمٰن صاحب نے ارہر کی دال کو بڑی نعمت کہا:

چناں چہ ایک بار حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن صاحب قُدِّس سِرُّہٗ کے یہاں میں مہمان تھا۔ جب میں نے کھانا شروع کیا مولانا نے پوچھا: کیا کھانا ہے؟ میں نے کہا: ارہر کی دال اور روٹی ہے۔ فرمایا: سبحان اللہ! خدا کی بڑی نعمت ہے۔ دیکھو! صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے جہاد میں ایک ایک چھوہارے پر پورا دن گذارا ہے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو بعض وقت بدون سالن کے روٹی کھاتے تھے، کبھی سرکہ سے کھا لیتے۔ واقعی اللہ کے بندے ایسے ہی شاکر ہوتے ہیں۔

اب ہماری یہ حالت ہے کہ کوئی کھانا کھلاتا ہے تو اس میں دس قسم کے اعتراض نکالتے ہیں اور جگہ جگہ گاتے پھرتے ہیں کہ فلانے کے یہاں گھی کم تھا، گوشت سخت تھا، گلا گھونٹ پلاؤ تھا، گھونسے مار مار کر حلق سے اتارا گیا۔ یہ کیا بے ہودگی ہے؟ اپنے آپ کو ایسا بڑا سمجھتے ہیں کہ پلاؤ قورمہ بھی نظر میں نہیں آتا۔ اگر واقعی کھانا خراب ہی تھا اور تمھیں پسند نہ آیا تو اس کو نہ کھاتے، واپس چلے آتے، مگر اس کی نسبت تحقیر کے الفاظ کہنا، جابجا گاتے پھرنا، یہ کہاں کی تہذیب ہے؟ دیکھو! مولانا نے ارہر کی دال کو بڑی نعمت فرمایا اور فرمایا کہ صحابۂ کرام اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کھایا کرتے تھے؟ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تو جو کو پیس کر پھونک سے بھوسی اڑا کر کھا لیا جایا کرتا تھا۔ پھر کس کا منہ ہے کہ پلاؤ قورمہ سے بھی ناک چڑھائے۔

بے نمک کھچڑی کھا لینے پر بخشش:

میں نے اپنے ایک استاد کو خواب میں دیکھا۔ پوچھا کہ آپ کے ساتھ کیا معاملہ ہوا؟ فرمایا کہ حق تعالیٰ نے مجھے بخش دیا۔ میں نے پوچھا: کس بات پر بخش دیا؟ فرمایا: ایک ذرا سی بات پر، وہ یہ کہ ایک روز گھر میں کھچڑی پکی تھی، اس میں نمک ٹھیک نہ تھا۔ میں نے اس کو حق تعالیٰ کی نعمت سمجھ کر چپکے بیٹھ کر کھالیا، کچھ تکرار نہیں کیا۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ ہمیں تمہاری یہ بات پسند آئی، لہٰذا تم کو بخش دیا۔

ہم تو اس بنا پر ان کے معتقد تھے کہ وہ بڑے متّقی تھے۔ نماز ایسی پڑھتے تھے کہ ذکر و شغل کرتے تھے، بڑے پابند شرع تھے، مگر بخشش ان کی اس پر ہوئی کہ بے نمک کی کھچڑی خوشی سے کھالی تھی۔ حق تعالیٰ کے سامنے کسی کا زہد و طاعت اور اتقا کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ کیوں کہ کوئی بھی یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ ہمارا عمل ان کی شان کے موافق ہے۔ اگر بخشش ہوسکتی ہے تو صرف نظرِ عنایت سے ہوسکتی ہے، جس کے لیے ادنیٰ سبب بھی کافی ہوسکتا ہے۔ پھر اس سبب میں کیا مردوں ہی کا حصّہ ہے؟ عورتوں کا نہیں؟ ہم لوگ حدیث پڑھتے ہیں، جو لوگ پلاؤ قورمہ پر ناک مارتے ہیں وہ حدیث میں دیکھیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ کی عادت شریفہ یہ تھی کہ جو کھانا پسند نہیں آیا اس کو چھوڑ دیا، نہ کھایا نہ کوئی برا لفظ اس کے متعلق فرمایا۔ آج کل افراط وتفریط دونوں ہیں۔ یا تو پلاؤ قورمہ پر ناک ماریں یا باوجود رغبت نہ ہونے کے کھائے چلے جاویں اور اس کو بڑی نفس کشی سمجھیں کہ طبیعت لیتی نہیں، مگر زبردستی حلق سے اتارے چلے جاتے ہیں، اسے نفس کی مخالفت نہیں کہتے بلکہ اس کا نام زہدِ خشک ہے۔ شریعت میں اعتدال ہے۔ سبحان اللہ! حضور ﷺ نے یہ تعلیم نہیں فرمائی کہ جی نہ چاہتا ہو تو خواہ مخواہ کھا ہی لو، بلکہ تعلیم دی ہے کہ جی چاہے تو کھاؤ، نہ چاہے تو چھوڑ دو، مگر اس کو برا کہنے کی اجازت نہیں دی۔

شریعت میں کھانے کے متعلق اعتدال:

اعتدال وہی ہے جس کو حضور ﷺ نے کر کے دکھایا۔ کھانا پسند آیا تو کھالیا نہ پسند آیا چھوڑ دیا۔ حدیث میں ہے: لَمْ یَعِبْ طَعَامًا یعنی کسی کھانے میں کبھی عیب نہیں نکالا، جیسا ہم

کرتے ہیں کہ گھی کم ہے، کچا ہے، پکا ہے۔ یہ سارے نخرے اس لیے ہیں کہ خدا نے دے رکھا ہے۔ کھانے کی قدر بھوکے سے پوچھو، اس کو یہ نہیں سوجھتا کہ روٹی تازی ہے یا باسی، گھی کم ہے یا زیادہ، کھانا گرم ہے یا ٹھنڈا؟ غرض کھانے کو کسی حال میں برا نہ کہنا چاہیے۔

مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ باورچی کیسا ہی خراب اور بے ترکیبی سے پکائے اس کو تنبیہ بھی نہ کی جائے۔ یہ بات نہیں، پکانے والے کو سمجھ دینا چاہیے۔ مگر کھانے سے ناک منہ نہ چڑھایا جاوے کہ منہ میں رکھا اور ذرا نمک کم ہے تو تھوک دیا۔ اٹھا کر برتن پھینک دیا۔ بی بی یا خادمہ کے سر پر سالن لوٹ دیا۔

غصّہ میں کھانے کے برتن توڑنا:

بعض لوگ برتن بہت توڑتے ہیں۔ ارے! برتن نے کیا خطا کی تھی۔ بلکہ ان سے کوئی یہ پوچھے کہ یہ جرمانہ کس پر ہوا؟ آپ نے جو اپنے گھر کا آٹھ آنے کا پیالہ توڑا، یہ تو آپ ہی کے اوپر جرمانہ ہوا، جس سے لازم آیا کہ خطا وار صرف تم ہی ہو۔ غصّہ میں یہ بھی نہیں سوجھا کہ خطا وار نوکر ہے یا تم خود ہو اور جرمانہ کس پر ہو رہا ہے۔ اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کرنا! ﴿یُخْرِبُوْنَ بُیُوْتَھُمْ﴾ (الحشر:۲) (اپنے گھروں کو خود اپنے ہاتھوں سے برباد کرتے ہیں) کا مصداق بنتا ہے جس کو حق تعالیٰ نے ایک گروہِ کفار کی حالت میں یہ بیان فرمایا ہے کہ ان پر یہ عذاب الٰہی نازل ہوا کہ بھاگتے وقت اپنے گھروں کو اپنے ہاتھوں سے اجاڑ رہے تھے، برباد کر رہے تھے، گھر میں رہنا تو کیا ملتا۔ اسی طرح کھانا تو تم سے چھین ہی لیا گیا تھا کہ بھوکے رہے اور یہ جرمانہ ہوا کہ برتن بھی ٹوٹ گئے، بری بات ہے۔ کھانے میں عیب نکالنا تکبّر کی بات ہے اور اتنا بڑا عیب نکالنا کہ اس کو گوہ موت کہنا، یہ سب ان کا مسخرہ پن تھا اور اس کو تواضع میں ٹھونسنا تو نری شرارت تھی۔ اس کو تواضع نہیں کہتے۔ یہ تو ایسا ہے کہ جیسے تم کسی کے پاس جاؤ اور وہ پوچھے تم کون ہو؟ تو جواب میں یوں کہو کہ گدھا ہوں اور اس کو تواضع سمجھو، تو ہرگز کوئی عقلمند اس کو پسند نہیں کرے گا۔ اپنی نسبت کوئی تعظیم کا لفظ نہ ہو تو یہ بھی نہ ہو کہ انسان سے گدھے بن جاؤ، اس کا نام تواضع نہیں ہے، اس کا نام ناشکری اور بدتمیزی ہے۔ اسی طرح اپنی نماز کو بالکل رائیگاں

اور بے کار سمجھ لینا، یہ بھی تواضع نہیں ہے۔ اعتدال کا درجہ یہ ہے کہ نماز کو اس حیثیت سے کہ اپنا فعل ہے ہیچ سمجھے، مگر اس حیثیت سے کہ حق تعالیٰ کا عطیّہ ہے یوں سمجھے کہ جس نماز کی توفیق ہم کو دی گئی ہے ہم اس کے بھی قابل نہ تھے، یہ محض حق تعالیٰ کا فضل ہے کہ ایسے نالائقوں کو ایک دین کے کام کی توفیق دی:

کہاں میں اور کہاں یہ نکہتِ گل
نسیمِ صبح تیری مہربانی

خلاصہ یہ ہے کہ ناز نہ کرے بلکہ شکر کرے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ آگے چل کر اس سے اچھے عمل کی توفیق ہوگی۔ اور جب تم اپنے عمل کو ناقص وحقیر جانتے ہو تو اس کی اصلاح کرو اور اصلاح میں کسی خاص درجہ پر اکتفا نہ کرو، جو جو خرابیاں اس میں ہیں سب کی اصلاح کرو اور پوری طرح سنوار لو کہ صحیح طریقہ یہ ہے، نہ یہ کہ اس کو لاشے محض سمجھو اس کی بے قدری کرو، بلکہ ہر درجہ میں اس کو ایک لحاظ سے خدا کی نعمت سمجھو اور دوسرے لحاظ سے اس کو کسی قابل نہ سمجھو، ہر وقت تکمیل اور اصلاح کی فکر میں لگے رہو، اس سے نہ ناز ہوگا نہ ہمت ٹوٹے گی۔

افراط فی التواضع سے مایوسی پیدا ہوتی ہے:

بہر حال مطلب یہ ہے کہ زیادہ تواضع کرنے سے آدمی مایوس ہو جاتا ہے اور رحمت سے ناامیدی ہو جاتی ہے۔ ہم نے ایسے مسلمان دیکھے ہیں جو گناہ میں مبتلا ہوئے۔ پھر ان کے دل میں کھٹکا پیدا ہوا، لیکن بتلانے والوں نے ان کو امید نہیں دلائی، بلکہ ڈرا ڈرا کر مایوس کر دیا۔ اس کا اثر یہ ہو کہ وہ اور زیادہ گناہ میں مبتلا ہو گئے۔

ایک مسلمان سپرنٹنڈنٹ کا قصّہ متعلقہ یاس:

ایک مسلمان سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے۔ ان کی یہ کیفیت تھی کہ کوئی عیب دنیا کا نہیں تھا جو ان میں نہ ہو۔ بہت ہی بڑا ظالم اور بے رحم آدمی تھا۔ جب ان سے کہا جاتا کہ یہ کیا حالت ہے؟ تو کہتے کہ میں دوزخی تو ہو ہی چکا، پھر کیوں کسر رکھوں؟ ایسی بہت نظیریں ہیں۔ یہ خرابی ہے مایوسی کی جس سے بعض دفعہ ایمان کے جاتے رہنے کا ڈر ہو جاتا ہے۔ اور ایمان نہ بھی جاوے تو آدمی پریشان تو رہے گا، اور بھی کچھ نہیں عمل میں تو کمی کرے ہی گا۔ کمی بھی نہ کرے، تو ناشکری تو

ضرور کرے گا۔ چناں چہ بعض دفعہ ایسے لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ ہمیں کیا دیا حق تعالیٰ نے؟ نہ نماز کی توفیق دی نہ روزہ کی۔ اس ناشکری اور گستاخی کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں کہ ان کی طبیعت میں مایوسی جاگزین ہوگئی ہے، اسی لیے وہ کچھ بھی ہمت سے کام نہیں لیتے۔ اور اللہ تعالیٰ کی عادت ہے کہ جب تک بندہ میں طلب و ہمت نہ ہو اس وقت تک توفیق نہیں دیتے۔

پس خدا کی شکایت کرنا کہ ہم کو نماز روزہ کی توفیق نہیں دی دراصل اپنی شکایت کرنا ہے۔

ایک ضرر تو مایوسی کا یہ ہے اور دوسرا ضرر یہ ہے کہ جو لوگ نماز روزہ کرتے بھی ہیں وہ نہایت بے دلی کے ساتھ کرتے ہیں۔ کیوں کہ یہ خیال جم گیا ہے کہ ہماری نماز کیا ہے، روزہ کیا ہے، یہ سب بے کار باتیں ہیں، اس لیے وہ صرف ایک رسم سی ادا کر لیتے ہیں۔ عورتوں پر یہ اثر زیادہ دیکھا جاتا ہے۔ زیادہ عورتیں آپ کو اسی خیال کی ملیں گی، جو یہ سمجھے بیٹھی ہیں کہ ہمیں دین حاصل ہو ہی نہیں سکتا۔ نہ ہماری نماز کچھ ہے، نہ روزہ کچھ ہے۔ اور اگر آپ تجسس کریں گے تو اس کو حضرات واعظین ہی کی برکت کا نتیجہ پائیں گے۔ کیوں کہ یہ لوگ جب مستورات کے مجمع میں بیان کرتے ہیں تو صرف یہی حدیث پڑھتے ہیں کہ عورتیں زیادہ دوزخ میں جائیں گی۔

مستورات کو اول تو بیان سننے کے مواقع ہی کم ملتے ہیں اور جب ملتے ہیں تو یہی بات کان میں پڑتی ہے کہ تم دوزخی ہو، دوزخ میں تم زیادہ ہوگی۔ اس سے ان کے دل میں یہ خیال مستحکم ہو جاتا ہے کہ ہمارے اعمال بے کار ہیں۔ اور چوں کہ عورتوں میں بوجہ ضعف تاثر کا مادہ بہت ہوتا ہے، اس لیے وہ واعظوں کی ہر قسم کی باتوں سے بہت جلد متاثر ہو جاتی ہیں۔ اس تاثر کی ایک اور فرع یاد آ گئی۔

چندہ مانگنے والے قصداً عورتوں کے مجمع میں بیان کرتے ہیں:

وہ یہ کہ بعض چندہ وصول کرنے والے قصداً عورتوں کے مجمع میں بیان کرتے ہیں، تا کہ چندہ زیادہ وصول ہو۔ چناں چہ ان پر واقعی بڑا اثر ہوتا ہے اور چندہ خوب ہو جاتا ہے۔ دو وجہ سے: ایک تو یہ کہ چندہ دینے میں عورتوں کے دل کو کیا لگتی ہے؟ کچھ بھی نہیں، کیوں کہ خاوند کا مال ہے اور مالِ مفت دلِ بے رحم۔ دوسرے یہ کہ ان بے چاریوں میں عقل بھی کم ہوتی ہے،

موقع ومحل کونہیں سمجھتیں، جوش میں جو کچھ ہاتھ میں آیا دے ڈالا۔

اور ایک وجہ تیسری یہ ہے کہ ان کے دل نرم ہوتے ہیں، ذرا کوئی قصہ رقت آمیز سنا دیا اور یہ پانی پانی ہوگئیں۔ ایک چوتھی وجہ یہ بھی ہے کہ عورتیں سونے چاندی سے خالی نہیں ہوتیں۔ سب کے پاس کچھ نہ کچھ زیور ضرور ہوتا ہے، وہ ضرور کچھ نہ کچھ دے ہی دیتی ہیں۔ اور مرد تو جیب میں روپیہ پیسہ لانا کبھی بھول بھی جاتے ہیں۔ اور ایسے حضرات واعظین کو حدیث بھی ایک ہی یاد ہے: يَا مَعْشَرَ النِّسَاءِ تَصَدَّقْنَ وَلَوْ مِنْ حُلِيِّكُنَّ إلخ. جس کا ترجمہ یہ ہے کہ اے عورتو! خیرات کرو، اگرچہ اپنے زیور ہی میں سے ہو، کیوں کہ مجھ کو دکھلایا گیا ہے کہ زیادہ تر اہلِ دوزخ عورتیں ہیں۔ یہ حدیث اپنے موقع پر صحیح ہے اور یہ بات مسلّم ہے کہ عورتوں میں بوجہ کثرت جہل کے کوتاہیاں بہت ہیں، اس لیے وہ دوزخ میں زیادہ جائیں گی۔ مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ عورتیں اپنی نجات سے مایوس ہو جائیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان کوتاہیوں کا علاج کرنا چاہیے۔ وہ یہ کہ ان کوتاہیوں کو دور کیا جائے اور اعمالِ صالحہ زیادہ کیے جائیں۔ ان ہی اعمال صالحہ میں سے ایک خیرات بھی ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ بس خیرات ہی علاج ہے تمام کوتاہیوں کا (مثلاً نماز نہ پڑھے اور خیرات کردے، یا حج نہ کرے اور خیرات کردے، یا روزہ باوجود قدرت کے نہ رکھے اور خیرات کردے وغیرہ وغیرہ یہ کسی کے نزدیک بھی درست نہیں)۔

ان پیشہ ور واعظوں نے حدیث بھی اختیار کی تو وہ جس میں ان کا فائدہ ہو، یعنی چندہ ملے۔ حدیث مذکور میں یہ بات بھی تو قابل غور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مِنْ حُلِيِّكُنَّ فرمایا ہے، مِنْ حُلِيِّ الزَّوْجِ نہیں فرمایا۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ خیرات کرنے کی ترغیب اپنے مملوک زیور میں ہے نہ کہ خاوند کے مملوک میں۔[1] عرب کی عادت تھی کہ اثاث البیت میں سے ہر چیز

[1] حدیث میں بروایت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ آیا ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے: عورت کو جائز نہیں ہے کچھ دینا بلا اجازتِ خاوند کے۔ اور بروایت ابواُمامہ رضی اللہ عنہ آیا ہے کہ نہ خرچ کرے عورت خاوند کے گھر میں سے کچھ بلا اذنِ خاوند کے۔ عرض کیا گیا: کھانا بھی کسی کو نہ دے؟ فرمایا: کھانا تو سب سے بہتر مال ہے۔ (کاتب از جمع الفوائد، باب فضل الصدقۃ)

شوہر اور بیوی کے درمیان بٹی ہوئی تھی، عورت کی الگ، مرد کی الگ، جیسے آج کل یورپ میں ہے کہ صاحب کی چیزیں الگ ہوتی ہیں، میم صاحبہ کی الگ۔ تو مِنْ حُلِیِّکُنَّ کے معنی یہی ہوں گے کہ اس زیور میں سے خیرات کرو جو تمہاری ملک ہو، نہ اس زیور میں جو تم پہنے ہوئے ہو اور خاوند کی ملک ہو۔

گھروں میں املاک متمایز ہونے چاہئیں:

آج کل ہم لوگوں کی معاشرت اس قدر گندی ہوگئی ہے کہ کسی کے حق کی بھی پروا نہیں رہی اور جہالت کی یہ حد ہے کہ ہم کو یہ بھی یاد نہیں رہا کہ صفائی معاملات اور تمایزِ حقوق کا طریقہ ہمارے یہاں کا تھا جو اب یورپ میں ہے۔ معاملہ کی صفائی اسی کو مقتضی ہے کہ میاں بیوی کے املاک ممتاز ہوں۔ ہندوستان میں بھی یہی رواج ہو جاوے تو اچھا ہے، مگر ہمارے یہاں تو حالت یہ ہے کہ گھروں میں یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ چیز کس کی ہے اور وہ چیز کس کی؟ اس کی چیز پر وہ قابض ہے اور اس کی چیز پر وہ۔ عورت کے پاس زیور ہوتا ہے تو اس میں امتیاز نہیں کہ کون سا باپ کے گھر کا ہے اور کون سا خاوند کے گھر کا۔ پھر وہ عورت کی ملک کر دیا گیا یا عاریت ہے؟ اگر کوئی مرد اپنے گھر میں اس کی تنقیح کرنا چاہے کہ میری ملک کون سی اور دوسرے کی کون سی، تو اس پر بڑی انگشت نمائی ہوتی ہے اور سارے کنبہ میں بدنام کیا جاتا ہے کہ لو صاحب! اپنی ذرا ذرا سی چیز فلاں شخص الگ کرتا ہے اور اس قدر کنجوس ہے، اس قدر بخیل ہے کہ اپنی چیز کو کسی کا ہاتھ لگنا گوارا نہیں کرتا۔

مطلب یہ کہ سخی وہ ہے جو بالکل بدانتظام، مغفّل اور مجہول ہو، جس کو نہ اپنی ملک کی خبر ہو، نہ دوسرے کی۔ پھر اس سخاوت کا لطف جب آتا ہے جب ان میں سے کوئی کھسک جاوے اور ترکہ تقسیم کیا جاوے۔ اس وقت ایک کہتا ہے: یہ چیز مرنے والے نے مجھ کو دے دی تھی۔ ایک کہتا ہے: یہ چیز میت کی نہیں تھی میری تھی۔ ایک عورت کہتی ہے: یہ سامان میرے باپ کے گھر کا ہے۔ دوسری کہتی ہے: میرے باپ کے گھر کا ہے۔ اب کوئی سبیل نہیں کہ اس جھگڑے کو کس طرح طے کیا جائے۔ پھر وہ جوتی پیزار ہوتی ہے کہ دیکھنے والے ہنستے ہیں۔ اور جو کوئی خاندان بڑا مہذب ہوا تو وہاں یہ جوتی پیزار تو نہیں ہوتی، کیوں کہ یہ باتیں تہذیب اور شرافت

کے خلاف ہیں مگر دلوں میں رنجشیں اور عداوتیں پیدا ہوجاتی ہیں، شکایتوں کی نوبت آتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گھر جیل خانہ بن جاتا ہے۔

املاک متمایز نہ ہونے میں دینی اور دنیوی خرابی:

یہ تو اس معاشرت میں دنیا کی خرابی ہے اور دین کی خرابی یہ ہے کہ دوسرے کی ملک میں بلا اجازت تصرف کرنے سے آدمی گناہ گار ہوتا ہے اور وہ چیز ضائع ہوجاوے تو ضامن ہوتا ہے، قیامت کا معاملہ بہت نازک ہے۔ تین پیسے جس کے ذمہ رہ جاویں گے اس کی سات سو مقبول نمازیں چھین کر صاحبِ حق کو دلوادی جاویں گی۔ یہ کس قدر خوف کی بات ہے کہ ساری عمر نماز پڑھی اور قیامت میں سب چھین لی گئی۔ یہ نتیجہ ہے گول مول باتوں کا، دنیا بھی برباد کیوں کہ رنجشیں پیدا ہوتی ہیں، جس سے سارے گھر کی زندگی تلخ ہوجاتی ہے، اور آخرت بھی برباد کہ کی کرائی عبادت اپنے پاس نہ رہی۔

ہمارے یہاں ایک شخص آئے کہ میری بی بی مرگئی ہے، اس کا ترکہ موافق قواعدِ شریعت کے تقسیم کردو۔ میں نے کہا: بی بی کی مملوک چیزوں کی فہرست بنا کر میرے پاس لاؤ۔ اس سوال کے جواب میں ان کو اس قدر مصیبت ہوئی کہ پریشان ہوگئے، کیوں کہ پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ کونسی چیز ان کی ملک ہے اور کون سی چیز بیوی کی۔ میں نے کہا: اس مصیبت کے ساتھ یہ جرمانہ الگ ہے کہ جس چیز میں شبہ رہے وہ سب بی بی کی ملک سمجھی جائے۔ سب وارثوں کو جمع کرو، سب اپنی اپنی چیز الگ کرلیں، جس میں شک ہو وہ سب میت کی ملک سمجھو، اس میں میراث جاری ہوگی۔ چناں چہ یہی کیا اور بڑی مشکل سے ترکہ تقسیم ہوسکا۔ یہ بھی اسی شخص کی دین داری تھی کہ مصیبت اٹھائی اور کام کرکے چھوڑا۔

غرض جیتے جی تو سب کو اچھا معلوم ہوتا ہے کہ سب سامان گڑبڑ رہے اور کسی چیز میں کسی کا نام لگنا ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ مگر ایک کے مرنے کے بعد بڑی مصیبت پیش آتی ہے۔ اس خرابی کی وجہ یہ ہے کہ ہماری معاشرت گندی ہے اور بات گول مول رہتی ہے۔ ہم کو ابتدا ہی میں لازم ہے کہ جب کوئی زیور یا کوئی چارپائی بنے یا کوئی چیز خریدی جائے تو اسی وقت زبان سے کہہ دے کہ یہ سامان تمہارا ہے یا ہمارا ہے، بس معاملہ صاف ہوجائے۔ یہ تو اثاثُ البیت کے متعلق ہوا۔

گھر کے خرچ میں بھی تصریح ملکیّت کی ہونی چاہیے:

گھر کا خرچ دینے میں بھی یہی گڑ بڑ ہے۔ میاں جو کچھ کماتے ہیں بی بی کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں۔ بی بی سمجھتی ہے کہ یہ سب مجھے دے دیا، یعنی میری ملک کر دیا اور جس طرح چاہتی ہیں کھاتی اڑاتی ہیں۔ اسی میں سے خیرات کرتی ہیں، اسی میں سے اپنے میکہ والوں کو خوب دل کھول کر دیتی ہیں، کیوں کہ اطمینان ہے کہ میری ملک ہے۔ بعض وقت جب میاں دیکھتے ہیں کہ اس بے دردی کے ساتھ میری کمائی اڑائی جارہی ہے اور باز پرس کرتے ہیں تو بی بی صاحبہ کہتی ہیں کہ یہ رقم تم نے مجھے دے دی تھی، لہٰذا مجھے اختیار ہے۔ جہاں چاہوں خرچ کروں۔ میاں کہتے ہیں: میں تجھے کیوں دیتا، میں نے تو بطورِ امانت دیا تھا۔

غرض خوب تکرار ہوتی ہے۔ یہ خرابی اسی گول مول بات کی ہے۔ معاملہ صاف رکھو، جو کچھ دو اس کے متعلق تصریح کردو کہ یہ کس مد میں دیا ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ بیوی کو جو کچھ گھر کے خرچ کے لیے بھی دو اس کے متعلق بھی تصریح کردو کہ یہ رقم امانت ہے، گھر کے خرچ میں ہی صرف کر سکتی ہو۔

بی بی کو جیب خرچ بھی دینا چاہیے:

لیکن بی بی کا یہ بھی حق ہے کہ اس کو کچھ رقم ایسی بھی دو جس کو وہ اپنے جی آئی خرچ کر سکے، جس کو جیب خرچ کہتے ہیں۔ اس کی تعداد اپنی اور بیوی کی حیثیت کے موافق ہو سکتی ہے۔ مثلاً روپیہ دو روپیہ، دس بیس، پچاس روپیہ، جیسی گنجائش ہو۔ یہ رقم خرچ سے علیحدہ دو۔ لیکن صاف کہہ دو کہ وہ رقم تو صرف گھر کے خرچ کی ہے اور یہ رقم تمہارا جیب خرچ ہے، یہ تمہاری مِلک ہے اس کو جہاں چاہو خرچ کرو۔ جب تم جیب خرچ الگ دو گے تو تمہارا یہ کہنے کو منہ ہوگا کہ یہ رقم جو گھر کے خرچ کے لیے دی ہے امانت ہے۔ کیوں کہ آدمی کے پیچھے بہت سے خرچ ایسے بھی لگے ہوئے ہیں جو اپنی ذاتِ خاص کے ساتھ ہیں۔ اگر بیوی کو کوئی رقم ذاتِ خاص کے خرچ کے لیے نہ دی گئی کہ جس کو جیب خرچ کہتے ہیں تو وہ امانت میں خیانت کرنے پر مجبور ہوگی۔ اس صورت میں اس پر تشدد کرنا ایک گونہ ظلم اور بے حمیتی ہے۔

یہ طریقہ ہے صحیح معاشرت کا، اس میں جانبین کا دین محفوظ رہ سکتا ہے، مگر ہم لوگوں کے رسم ورواج کچھ ایسے خراب ہوگئے ہیں کہ اگر اب ایسا کیا جاوے کہ گھر کی چیزوں کو الگ الگ میاں بیوی کے نامزد کیا جاوے تو ایک اچنبھے کی بات معلوم ہوگی اور سب ناک بھوں چڑھانے لگیں گے۔ تمام برادری اور کنبہ میں چرچا ہونے لگے گا۔ چناں چہ ہمارے یہاں ایک بی بی نے ایک کٹورا ہدیۃً دیا، تو میں نے پوچھا: یہ تم نے کس کو دیا ہے، مجھ کو یا گھر کے لوگوں کو؟ تو اب سوچنے لگیں کہ کیا جواب دوں؟ کیوں کہ وہ تو رسم ورواج کے موافق اس واسطے لائی تھیں کہ گھر میں کام آوے گا۔ اس سے کیا بحث کہ کس کی ملک ہوگا؟ جب وہ پہلے سے نیت کرکے لائی ہی نہ تھیں تو میرے سوال کے جواب میں کیا کہتیں؟ آخر بہت سوچنے کے بعد یوں کہا: اجی! میں نے تو دونوں کو دیا ہے۔ میں نے کہا: خیر! یہی معلوم ہوگیا کہ یہ کٹورا مشترک ہے۔

اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے یہاں ایک چیز بھی گول مول نہیں۔ مثلاً چارپائیاں گھر میں ہیں، ان میں ایک چارپائی میری ہے، ایک دوست نے ایک اچھی سی چارپائی دی تھی، اس کو میں نے اپنے نام کرلیا ہے، باقی چارپائیاں گھر کے لوگوں کی ہیں۔ اسی طرح ہر چیز بٹی ہوئی ہے۔ یوں برتنے میں سب کے آتی ہیں، مگر یہ تو معلوم ہے کہ یہ ملک کس کی ہے؟ موت حیات سب کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ اگر کوئی آدمی گھر میں سے کم ہوجائے تو صاف معاملہ کی صورت میں گڑبڑ تو نہ ہوگی کہ یہ چیز کس کی ہے اور یہ کس کی؟ وہ کہے: فلانے کی، اور وہ کہے: فلانے کی۔ سارے گھروں میں یہ انتظام ہونا چاہیے اور اس سے لوگوں کو وحشت ہوتی ہے، وہ برا مانتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ رسم عام نہیں ہے، اگر ایک دو آدمی ایسا کرتے ہیں تو نئی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ اگر یہی رسم عام ہوجائے تو نہ کوئی برا مانے گا، نہ اس سے وحشت ہوگی اور اس کے فوائد دیکھ کر سب قائل ہوجاویں گے اور تحسین کرنے لگیں گے۔

زیور میں بھی یہی چاہیے کہ جب بنوایا جائے صاف کہہ دیا جائے کہ بیوی! تمہاری مِلک ہے اور اگر ان کی مِلک کرنا نہیں ہے تو صاف کہہ دیا جائے کہ مِلک میری ہے اور تمہارے واسطے عاریت ہے، صرف پہننے کی اجازت ہے۔ اب جو ایسا نہیں کیا جاتا تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زیور کے متعلق جو حقوقِ شرعی ہیں ان میں یہی کوتاہی ہوتی ہے۔ مثلاً زکوٰۃ، کہ میاں بے فکر ہیں

کہ میرے کام میں تھوڑا ہی آرہا ہے، میرے اوپر زکوٰۃ کیوں ہو، اور بیوی بے فکر ہے کہ میری مِلک تھوڑا ہی ہے، نتیجہ یہ ہے کہ زکوٰۃ کوئی بھی نہیں دیتا۔ جب خاوند کھسک گئے تو اب بیوی صاحبہ کہتی ہیں کہ یہ میری ملک ہے، انھوں مجھے دے دیا تھا۔

عجیب بات ہے کہ یہ زیور تمام عمر تو پہننے کے لیے تھا، اس لیے زکوٰۃ شوہر کے ذمہ واجب کی جاتی ہے اور بعد مرنے کے مالک بننے کے لیے بیوی صاحبہ موجود ہیں۔ غرض خرچ کے لیے خاوند مالک اور آمدنی کے لیے بیوی، یہ خرابی کاہے سے پیدا ہوئی؟ صرف اس وجہ سے کہ مِلک علیحدہ نہیں کی گئی۔ اور اگر بنوانے کے بعد ہی تصریح کردی جاتی کہ یہ کس کی ملک ہے تو یہ کوتاہی نہ ہوتی اور زکوٰۃ دینے کے وقت یہ حیلہ بھی ذہن میں نہ آتا کہ ہر چیز میری تھوڑا ہی ہے، بس معاملہ صاف ہونا چاہیے۔ اگر زیور بیوی کی ملک کردیا گیا ہے تو زکوٰۃ اسی کے ذمہ ہوگی۔ اور اگر عاریۃ دیا گیا ہے تو زکوٰۃ خاوند کے ذمہ ہوگی (یہ اور بات ہے کہ بیوی کی طرف سے بھی اس کی اجازت سے خاوند ادا کردے۔ زکوٰۃ اس طرح بھی ادا ہوجاتی ہے)۔

ایک خرابی اور لیجیے کہ زیور ہزاروں روپے کا بیوی صاحبہ کو دیتے جاتے ہیں، مگر یہ تصریح نہیں کرتے کہ یہ زیور مہر میں محسوب ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بیوی کو سب کچھ دے دیا، مگر مہر کا ایک پیسہ بھی ادا نہیں۔ لاکھ روپے خرچ ہوگئے، مگر قرض دار کے قرض دار ہی رہے۔ جو حق العبد ہے اور حق العبد کا جو نتیجہ ہے وہ آپ سن چکے ہیں کہ تین پیسہ کے بدلے سات سو مقبول نمازیں چھین لی جائیں گی۔ پھر یہ کیا عقل مندی ہوئی کہ خرچ تو دَینِ مہر سے زیادہ ہوگیا، مگر قرضہ بدستور ذمہ باقی رہا۔ ہاں جب دنیا میں مہر کا مطالبہ ہوتا ہے کہ بیوی مر گئیں اور وارثوں نے مہر کا دعویٰ کیا یا طلاق کا اتفاق ہوا اور بیوی نے مہر کا دعویٰ کیا، اب شوہر صاحب کہتے ہیں کہ یہ سب زیور تو میں نے مہر میں دیا تھا۔ کوئی اس سے پوچھے کہ خدا کے بندے! خدا تو نیت کو جانتا ہے، بندوں کو نیت کی کیا خبر؟ تو نے کب کہا تھا کہ یہ زیور مہر میں ہے، یوں تم کسی کو لاکھ روپے بخش دو۔ اگر اس کا ایک پیسہ آپ کے ذمہ قرض ہے، تو وہ تمہارے ذمہ سے ساقط نہ ہوگا۔ قرض جب ادا ہوتا ہے جب یہ کہہ کردو کہ یہ قرض کی رقم ہے، تو اگر زیور مہر میں دینا ہے تو دیتے وقت تصریح کردینا چاہیے کہ یہ مہر میں ہے اور اس کا حساب لکھو یا ذہن میں رکھو۔ غرض گول مول

بات کیوں رکھتے ہو، یہ حقوق کا معاملہ ہے، ایک پیسہ بھی رہ جائے گا تو قرض ہی رہ جائے گا۔ غرض جو کام ہو باضابطہ ہو، گول مول نہ ہو۔

بیان یہ ہو رہا تھا کہ عرب میں یہی دستور تھا کہ میاں کے املاک علیحدہ، بیوی کے املاک علیحدہ ہوتے تھے۔ تو جب حدیث میں لفظ مِنْ حُلِیِّکُنَّ ہے تو اس کے معنی یہی ہوں گے کہ اس زیور میں سے خیرات کرو جو تمہاری مِلک ہے، نہ کہ اس میں سے جو خاوند کی مِلک ہے۔ مگر پیشہ ور واعظ اس کا کچھ خیال نہیں کرتے۔ وہ عورتوں کو ڈرانا ہی جانتے ہیں کہ تم دوزخی ہو، خیرات کرو، اور جو کچھ ہے سب دے ڈالو، خواہ کسی کا ہو، تمہاری ملک ہو یا خاوند کی۔ ایسی گڑبڑ جیسی ہندوستان میں ہے کہیں بھی نہیں ہے۔ عرب میں مہر کے متعلق اب تک یہ رسم ہے کہ عورتیں مردوں کی چھاتی پر چڑھ کر مہر وصول کرتی ہیں۔ اور ہندوستان میں اس کو بڑا عیب سمجھا جاتا ہے۔ ہندوستان کی عورتیں مہر کو زبان پر بھی نہیں لاتیں اور خاوند کے مرتے وقت اکثر بخش ہی دیتی ہیں۔

میں کہا کرتا ہوں کہ ہندوستان کی عورتیں حوریں ہیں، حسن و جمال میں نہیں بلکہ اخلاق میں۔ یہاں کی عورتیں۔ ﴿حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِي الْخِيَامِ﴾ (رحمن: ۷۲) کی مصداق ہیں۔ ایک بڑی صفت عفت کی تو ان میں ایسی ہے کہ اس کو دیکھتے ہوئے ان پر یہ آیت صادق آتی ہے: ﴿فِيْهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ﴾ (رحمن: ۷٤) گھروں میں بیٹھنے والیاں تو ہیں ہی، یہاں کی باہر پھرنے والیاں بھی اکثر پاک صاف ہیں۔ جب گھر سے نکلتی ہیں تو نگاہیں نیچی کیے ہوئے، گھونگٹ نکالے ہوئے، راستہ میں کسی کو سلام تک نہیں کرتیں۔ سلام کرنا فی نفسہ ہنر سمجھا جاتا ہے اور ہے بھی، مگر عورتیں غایت حیا سے آپس میں بھی سلام نہیں کرتیں۔ ان کو مردوں سے تو شرم ہے ہی، غیر عورتوں سے اور بڑی عمر والی عورتوں سے بھی شرم آتی ہے۔ غالباً اس شرم ہی کی وجہ سے زبانی سلام متروک ہوا۔ گو ایسی شرم قابلِ ترک ہے جس سے سنت متروک ہو جاوے۔ عورتیں مردوں کو گو سلام نہ کریں مگر آپس میں تو سلام کر لیا کریں اور مردوں کو بھی جو محرم ہوں ان کو سلام کر لیا کریں۔ تو مطلقاً سلام ترک کرنا خوبی کی بات نہیں، مگر منشا اس کا وہی فرطِ حیا تھی۔

اس حیا کی ایک فرع یہ ہے کہ اگر کوئی مردان سے کوئی بات پوچھے تو اکثر جواب نہیں دیتیں یا دیتی ہیں تو صرف اشارہ سے، حتی کہ باہر پھرنے والیوں کی عفت کا بھی یہی حال ہے کہ اپنے مرد کے سوا دوسری طرف کبھی تمام عمر بھی ان کا خیال نہ گیا۔ یوں سو پچاس میں کوئی ایک بدذات ایسی ہو جاوے تو قابل شمار نہیں۔ اور اگر عورتوں کو کسی میں یہ عیب معلوم ہو جاوے تو اس کو برادری سے خارج کر دیتی ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ مرد فی صدی ایک نکلے گا جو نظر یا خیال سے محفوظ ہو۔

عورتوں کی عفت:

اور عورتوں میں فی صدی شاید ایک نکلے جو ناپاک ہو۔ غرض عورتوں میں خصوصاً ہندوستان کی عورتوں میں عیب ہی عیب نہیں، بہت سے فضائل بھی ہیں۔

مردوں پر جاں نثاری:

مردوں کی جاں نثار اس قدر ہیں کہ خاوند سے لڑیں گی، روئیں گی، جھیکیں گی، مگر کب تک؟ جب تک بے فکری اور فرصت ہو۔ اور جہاں خاوند کا ذرا کان گرم ہوا اسی وقت لڑائی جھگڑا سب بھول گئیں۔ اب یہ حالت ہے کہ نہ کھانے کا ہوش ہے، نہ پہننے کا ہوش ہے، رات بھر کھڑے گزر گئی، کسی وقت پنکھا ہاتھ سے نہیں گرتا۔ کوئی دیکھنے والا نہیں کہہ سکتا کہ یہ وہی ہیں جو ایک وقت میں لڑ رہی تھیں۔ بس اس وقت اپنے آپ کو فنا کر دیتی ہیں۔

عورتوں کا ایثار:

عورتوں میں ایثار اس قدر ہے کہ روز مرہ کھانا اس وقت کھاتی ہیں جب مردوں کو پہلے کھلا لیتی ہیں۔ اور اچھے سے اچھا کھانا اوپر کا تار مردوں کے لیے نکالتی ہیں، نیچے کا تلچھٹ اور بچا کھچا اپنے واسطے۔ اگر کسی وقت کوئی مہمان بے وقت آ گیا تو خاوند کی بات کو، عزت کو ہرگز نیچا نہ کریں گی، جو کچھ گھر میں ہے فوراً مہمان کو کھلا دیں گی خود فاقہ کر دیں گی۔ یہ اخلاق ایسے پاکیزہ ہیں کہ ان سے بڑے بڑے درجے حاصل ہو سکتے ہیں اکثر مردوں کو یہ اخلاق حاصل ہی نہیں۔ البتہ ہماری عورتوں میں ایک تھوڑی سی کسر ہے، اگر وہ مٹ جائے تو یہ سچ مچ کی حوریں بن جائیں گی، وہ کسر کیا ہے؟

عورتوں میں بدزبانی کا بڑا عیب ہے:

کہ ان کی زبان نہایت خراب ہے، ان کی زبان وہ اثر رکھتی ہے جیسے بچھو کا ڈنک، کہ ایک ذراسی حرکت میں آدمی بلبلا جاتا ہے۔

اکبر نہ دب سکے کبھی برٹش کی فوج سے
لیکن شہید ہوگئے بیوی کی نوج سے

بدزبانی کی ایک لطیف تدبیر:

ایک بزرگ نے اس کا خوب علاج کیا تھا۔ ان سے ایک عورت نے شکایت کی کہ خاوند سے روز لڑائی رہتی ہے، کوئی تعویذ ایسا دیجیے کہ لڑائی نہ ہو۔ انھوں نے کہا کہ ایک بوتل میں پانی لے آؤ، میں پڑھ دوں گا، اس سے لڑائی نہ ہوگی۔ وہ بوتل میں پانی لائی، انھوں نے اس پر کچھ جھوٹ موٹ پڑھ دیا اور فرمایا کہ جب خاوند گھر میں آیا کرے تو اس پانی کا ایک گھونٹ منہ میں لے کر بیٹھ جایا کر، پھر لڑائی نہ ہوگی۔ اس نے ایسا ہی کیا، واقعی لڑائی ختم ہوگئی۔ پانی کا دم کرنا تو برائے نام تھا، اصل تدبیر یہ تھی کہ جب پانی منہ میں لے کر بیٹھ جائے گی تو زبان قینچی کی طرح نہ چلے گی اور لڑائی ہوتی تھی اس کی بدزبانی سے، اس لیے ان بزرگ نے اس کے بند کرنے کی یہ حکیمانہ تدبیر کی۔ اب بھی عورتیں اگر کسی طرح زبان بند کرلیں تو واقعی کبھی لڑائی نہ ہو۔

لوگ آج کل اس کے لیے تعویذ وغیرہ مانگتے پھرتے ہیں، سب واہیات ہے۔ ہاں یہ عمل اگر کوئی کرادے جو ان بزرگ نے کیا تھا تو اس کو تو میں بھی کروں گا کہ بوتل میں پانی لاوے، میں جھوٹ موٹ پڑھ دوں گا، اور جب میاں بیوی کی لڑائی شروع ہو بیوی ایک گھونٹ پانی کا منہ میں لے کر بیٹھ جائے اور ان بزرگ کی تو چھُو میں بھی کچھ اثر ہوگا۔ یہاں چھو میں تو کچھ اثر ہے نہیں، مگر یہ وعدہ کرتا ہوں کہ ان شاء اللہ تعالیٰ لڑائی بند ہو جائے گی۔ خدا جانتا ہے بے مثل علاج ہے۔ یہ تو حکمتِ عملی تھی، اصلی بات یہی ہے کہ عورتوں کی بدزبانی جڑ ہے بگاڑ کی۔ یہ عیب عورتوں میں سے نکل جاوے تو یہ سچ مچ کی حوریں بن جاویں۔

اور عورتوں کے یہ فضائل جو میں نے بیان کیے ہندوستان میں بھی زیادہ تر ہمارے نواح

کے ساتھ خاص ہیں۔ بڑے شہروں میں عورتوں میں یہ فضائل کم پائے جاتے ہیں۔ بھوپال میں سنا ہے کہ آئے دن عورتیں قاضی کے یہاں کھڑی رہتی ہیں۔ ذرا ان کے کسی آرام میں کمی ہوئی اور عدالت میں پہنچیں۔ یہاں کی طرح نہیں کہ عورتیں عدالت کے نام سے بھی کانپتی ہیں۔ چاہے مرجائیں، مگر عدالت میں نہیں جاسکتیں۔ یوں آپس میں، عزیزوں میں، ہزار ہا باتیں اور ہزار ہا شکایتیں کرلیں گی، یہ تو ان کا مشغلہ ہی ہے، مگر جب کچہری کا نام آوے گا تو کانوں پر ہاتھ رکھ لیں گی کہ خدا نہ کرے جو حاکم کے یہاں ہم جاویں۔ یہ میں نہیں کہتا کہ ہمارے اطراف میں کوئی عورت بھی ایسی نہیں جو عدالت میں جاتی ہو۔ ہزاروں میں دو ایک ایسی بھی نکلیں گی، مگر غالب حالت عورتوں کی اس نواح میں یہی ہے کہ عدالت میں جانے سے گھبراتی ہیں۔

حکایت:

یہاں ایک بزرگ حافظ صاحب تھے، ان کے صاحب زادے بیوی کی رعایت بہت کرتے تھے اور واقعی بیوی کی رعایت کرنا بھی چاہیے، خواہ وہ پھوہڑ ہو یا بدتمیز ہو۔ کیوں کہ اس نے تمہارے واسطے اپنی ماں کو چھوڑا، باپ کو چھوڑا، سارے کنبہ کو چھوڑا۔ اب اس کی نظر صرف تمہارے ہی اوپر ہے، جو کچھ ہے اس کے لیے ایک شوہر کا دم ہے۔ بس انسانیت کی بات یہی ہے کہ ایسے وفادار کو کسی قسم کی تکلیف نہ دی جائے اور جو کچھ ان سے بے تمیزی یا بے ادبی ہو جائے اس کو ناز سمجھا جائے، کیوں کہ ان کی عقل کم ہے، تمیز نہیں ہے، ان کو بات کرنے کا سلیقہ نہیں، اس لیے گفتگو کا پیرایہ ایسا ہو جاتا ہے جس سے مردوں کو تکلیف پہنچتی ہے، مگر اس بدتمیزی کی حقیقت ناز ہے۔ آخر وہ تمہارے سوا اور کس پر ناز کرنے جائیں۔ دنیا میں ایک تم ہی ان کے خریدار ہو:

ناز براں کن کہ خریدار تست

صاحبو! سوچنے کی بات ہے کہ ہم خدا تعالیٰ کے محکوم ہیں اور وہ ہماری کیا کیا رعایتیں کرتے ہیں۔ وہ کون سی بدتمیزی ہے جو بندے خدا تعالیٰ کے ساتھ نہیں کرتے۔ مگر دیکھیے! اس کے مقابلہ میں حق تعالیٰ کا معاملہ بندوں کے ساتھ کیسا ہے کہ رزق برابر دیتے ہیں، کوئی عذاب نازل نہیں فرماتے۔ اور وجہ یہی ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ یہ سب میرے محکوم ہیں، میرے سوا ان

کا کون ہوسکتا ہے اور جو کچھ بدتمیزیاں کرتے ہیں اپنی حماقت سے کرتے ہیں۔ اس واسطے بندوں کی ہر طرح رعایت فرماتے ہیں۔ یہی معاملہ ہم کو اپنے محکومین کے ساتھ کرنا چاہیے۔

چناں چہ جن بزرگوں کے صاحب زادے کا ذکر کر رہا ہوں وہ اپنی بیوی کی بہت رعایت کرتے تھے۔ حالاں کہ وہ فضول خرچ تھی، لیکن یہ اس کو نباہتے تھے اور انھوں نے اپنی اس فضول خرچ بیوی کا نام باولی رکھا تھا۔ جب اس کی کوئی بات کرتے تو یوں کہا کرتے تھے کہ میری باولی ایسی ہے اور میری باولی ویسی ہے۔ وہ اللہ والے تھے، ان کی نظر عیبوں پر نہ پڑتی تھی بلکہ ایک خوبی پر پڑتی تھی جس کے سامنے سب عیوب مٹ جاتے تھے وہ ایک بہت بڑی صفت تھی۔ خدا کے فضل سے ہمارے یہاں کی شریف بیبیوں میں سب ہی میں وہ صفت موجود ہے جو بہت ہی زیادہ قابلِ قدر ہے۔ اور جب کبھی کوئی اس بی بی کی مذمت کرتا تو وہ اسی خوبی کا ذکر فرما کر جواب دیتے۔ وہ یہ کہ اگر خاوند بے توجہی سے یا اور کسی وجہ سے لڑ بھڑ کر یا ناداری کی وجہ سے یا قید ہو کر گھر سے چلا جائے اور پچاس برس تک باہر رہے، اپنی خبر تک بھی نہ دے کہ میں مر گیا ہوں یا زندہ ہوں اور بیوی کی معاش بھی کوئی نہ ہو، اس پر بھی وہ جس وقت آئے گا بیوی کو اسی کونے میں بیٹھا دیکھ لے گا جس میں چھوڑ گیا تھا۔ آنکھوں سے دیکھ لے گا کہ نامراد مر رہی ہے، سڑ رہی ہے، مُردوں سے بدتر حالت ہے، مگر یہ نہیں ہوا ہوگا کہ امانت میں خیانت کی ہو یا کسی اور پر نگاہ ڈالی ہو۔ یہ صفت ایسی ہے کہ اس کے واسطے سب ناز گوارا کیے جاسکتے ہیں۔ اس صفت کے سامنے کسی عیب پر بھی نظر نہیں پڑنا چاہیے۔

اہل اللہ زن مرید نہ تھے بلکہ قدر شناس تھے:

اللہ والوں نے جو اپنی بیبیوں کی بہت رعایتیں کی ہیں جن کو سن کر تعجب ہوتا ہے، ان کا منشا ایسی ہی صفات تو ہیں۔ وہ زن مرید نہ تھے بلکہ قدر شناس تھے۔ انھوں اچھی اچھی نیتوں سے تکلیفیں برداشت کی ہیں۔

ایک بزرگ کو ان کی بیوی بہت دق کرتی تھی:

ایک بزرگ تھے جن کی بیوی ان کو بہت ستاتی تھی، یہاں تک کہ لوگوں کو بھی معلوم ہوگیا

کہ بیوی ان کو بہت دق کرتی ہے۔ بعض لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت! ایسی بیوی کو طلاق دے دینا چاہیے۔ فرمایا: طلاق تو میرے اختیار میں ہے، مگر یہ تو سوچو کہ اگر اس نے کسی اور سے نکاح نہ کیا تب تو یہ تکلیف اٹھائے گی، اور اگر کسی اور سے نکاح کیا تو اس مسلمان کو تکلیف پہنچے گی۔ اس سے اچھا یہ ہے کہ میں ہی تکلیف اٹھالوں اور مسلمانوں کا وقایہ بن جاؤں کہ جب تک میں موجود ہوں کسی دوسرے مسلمان کو تکلیف کیوں پہنچے۔ غرض عورتوں میں بدزبانی کا تو بڑا عیب ہے، مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی صفت ہے کہ ان کم بدبختی ماریوں کے دل میں خاوند کی محبّت بے حد ہوتی ہے جو موقع پر ظاہر ہوتی ہے۔

چناں چہ لکھنؤ کا ایک قصّہ ہے کہ ایک بزرگ کی بیوی بہت ہی بدزبان تھی، انہوں نے اس کی اصلاح کی بہت تدبیریں کیں کچھ نفع نہ ہوا۔ ایک دن انہوں نے کہا: کم بخت! تو بہت ہی بدقسمت ہے، کتنی کتنی دور سے میرے یہاں لوگ آتے ہیں اور ان کو نفع ہوتا ہے، تو میرے یہاں کتنی مدت سے ہے مگر تجھے کچھ نفع نہیں ہوتا۔ بولی: میں بدقسمت کیوں ہوتی؟ میں تو بہت خوش قسمت ہوں کہ ایسے بزرگ ولی اللہ کے پلے سے بندھی ہوں، میری برابر کوئی ہو تو لے، بدقسمت تم ہو کہ تمھیں مجھ جیسی بری عورت ملی۔ اللہ کی بندی یہاں بھی زبان درازی سے نہ چوکی، خاوند کو بدقسمت بنا کر چھوڑا۔ مگر اس بدتمیزی میں بھی اعتقاد ٹپکتا ہے کہ ان کو بزرگ اور ولی اللہ کہتی جاتی ہے، اس کا منشا وہی محبّت ہے۔ میں تجربہ سے بہ قسم کہتا ہوں کہ یہاں کی عورتوں کی رگ رگ میں خاوند کی محبّت گھسی ہوتی ہے، مگر ان میں تھوڑا سا پھوہڑ پنا ہے کہ زبان کو قابو میں نہیں رکھ سکتیں۔

ماں باپ لڑکیوں کو تعلیم نیک نہیں دیتے:

اور اس میں قصور اللہ رحم کرے ماں باپ کا ہے کہ وہ لڑکیوں کی تعلیم کا انتظام واہتمام بالکل نہیں کرتے۔ اور تعلیم سے میری مراد ایم اے، بی اے نہیں۔ یہ ایم اے بن کیا کریں گی؟ یہ تو میمیں ہیں۔ اور بی اے کی بھی ضرورت نہیں کیوں کہ ”بی“ تو خود ہیں ”اے“ بڑھانے کی کیا ضرورت؟

عورتوں کو انگریزی تعلیم مضر ہے:

آج کل یہ بھی ایک رواج ہے کہ عورتوں کو بھی ایم اے، بی اے بناتے ہیں۔ کیا ان کو نوکری کرنا ہے جو اتنی بڑی ڈگریاں حاصل کی جائیں؟ انگریزی نے مردوں ہی کو کیا فلاح دی ہے جو عورتوں کو دے گی۔ آج کل نوجوانوں میں عورتوں کی تعلیم کے متعلق بھی رواج نکلا ہے۔

عورتوں کو جغرافیہ پڑھانا:

چناں چہ ایک شخص کانپور میں اپنی بیوی کو جغرافیہ پڑھاتے تھے۔ میں نے ایک وعظ میں کہا: عورتوں کو جغرافیہ پڑھانے کی کیا ضرورت ہے؟ کہنے لگے: اور اگر یہ ضرورت بتلائی جاوے کہ ان میں روشن دماغی پیدا ہوگی؟ میں جواب میں عرض کرتا ہوں کہ جی ہاں، بجا ہے اور یہ بھی مصلحت ہے کہ اگر بھاگنے کا ارادہ کریں تو کوئی دقت بھی نہ ہو، کیوں کہ جغرافیہ سے ان کو معلوم ہو چکا ہے کہ ادھر جنکشن غازی آباد میں ہے، ادھر لکھنؤ میں ہے۔ اس طرح جہاں چاہیں پہنچ سکتی ہیں۔ اس شخص پر اس بات کا اس قدر اثر ہوا کہ وعظ کے بعد ملے اور اسی وقت توبہ کی کہ اب لڑکیوں کو جغرافیہ نہیں پڑھاؤں گا۔ میں کہتا ہوں کہ ان کو مذہبی تعلیم دیجیے، فقہ پڑھایئے، تصوف پڑھایئے، قرآن کا ترجمہ تفسیر پڑھایئے جس سے ان کی ظاہری و باطنی اصلاح ہو، یہ کیا واہیات ہے کہ جغرافیہ پڑھا رہے ہیں۔

اصل میں جغرافیہ کی ضرورت بادشاہوں کو ہے کہ ان کو کہیں چڑھائی کرنا ہو تو سہولت ہو، یا تاجروں کو مال منگانے، بھیجنے میں آسانی ہو، عام لوگوں کو اس سے کیا فائدہ؟ خصوصاً عورتوں کو۔ اور اگر جغرافیہ محض اس لیے حاصل کیا جاتا ہے کہ:

علم شے بہتر از جہل شے

تو میں کہوں گا کہ دنیا میں سینکڑوں علوم وفنون ہیں آخر کس کس کو حاصل کیا جاوے گا؟ سب کو حاصل کرنا تو محال ہے، لامحالہ ترجیح پر عمل کیا جائے گا۔ اور کسی علم کو دوسرے پر ترجیح محض ضرورت کی وجہ سے ہو سکتی ہے، یعنی جو فن جس کے لیے کارآمد اور ضروری ہو اس کو حاصل کرنا چاہیے۔ کیوں کہ غیر ضروری کے پیچھے پڑنے سے آدمی ضروری سے رہ جاتا ہے اور اس کا

حماقت ہونا ظاہر ہے۔ مگر آج کل یہ خبط عام ہو رہا ہے کہ ضروری اور غیر ضروری سے بحث نہیں کرتے۔ بس جو فن سامنے آ گیا اسی کے پیچھے پڑ گئے۔

غرض سلاطین کو چاہیے کہ وہ جغرافیہ پڑھیں، اصل ضرورت تو ان کو ہے۔ مگر خیر ہندوستان میں مرد بھی اس واسطے پڑھ سکتے ہیں کہ نوکری کی مصیبت ان کے سر ہے، جو بدون ڈگری حاصل کیے نہیں مل سکتی اور ڈگری بدون جغرافیہ کے نہ ملے گی۔ مگر عورتیں، کیا نوکری کرنے جائیں گی وہ؟ ان کو جغرافیہ کی کیا ضرورت ہے؟ ان کو صرف مذہبی تعلیم دینا چاہیے، تا کہ اخلاق درست ہوں اور تہذیب و آداب اور سلیقہ پیدا ہو۔ مگر اس وقت عورتوں میں یہ تعلیم بھی نہیں۔ اسی وجہ سے ساری خرابیاں ہیں۔ اور اگر کسی کو تعلیمِ نسواں پر توجہ ہوئی بھی تو اس نے تعلیم سے مراد انگریزی تعلیم لے لی:

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

یہ تعلیم تو جہل سے بھی بدتر ہے، جہل میں اتنی خرابیاں نہیں ہیں جتنی اس تعلیم میں ہیں۔

پرانی تعلیم یافتہ عورتیں بہت مہذب ہوتی ہیں:

حضرت! ہم نے پرانی تعلیم یافتہ عورتیں بھی دیکھی ہیں کہ سبحان اللہ! نہایت مہذب، بڑی باحیا، بہت ہی شائستہ اور سلیقہ شعار ہوتی تھیں اور نئی تعلیم یافتہ عورتوں کو بھی دیکھا ہے، یعنی ان کے مضامین اخبارات ورسائل میں نظر سے گذرے ہیں۔ خدا کی پناہ! یہ اس قدر بے شرم، آزاد اور بدسلیقہ و بے باک ہوتی ہیں کہ مضمون دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کسی پردہ نشین، حیادار عورت کا لکھا ہوا ہے۔

ہر علم مفید نہیں:

یاد رکھو! ہر علم مفید نہیں بلکہ بعض علوم مُضر بھی ہوتے ہیں، خواہ ان علوم ہی کی خاصیّت ایسی ہو یا سیکھنے والے کے لحاظ سے مُضر ہوں۔ اس کی نسبت مولانا فرماتے ہیں:

بدگہر را علم و فن آموختن
دادن تیغ است دست راہزن

دیکھیے! تلوار مفید اور ضروری چیز ہے، مگر نہ ہر شخص کے لیے، بلکہ صرف اس شخص کے لیے جس میں قوت ہو اور اس کا چلانا جانتا ہو، ورنہ نتیجہ یہ ہوگا کہ اپنے ہی ہاتھ پیر کاٹ لے گا۔ اگر کوئی یہ سمجھ کر کہ تلوار مفید چیز ہے ذرا سے بچے کے سامنے رکھ دے تو عجب نہیں کہ اس کا گلا ہی کٹ جائے۔ اسی طرح یہ قاعدہ کلیہ صحیح نہیں کہ ہر علم مفید ہے، اور نہ ہر شخص میں ہر علم کے حاصل کرنے کا حوصلہ ہے۔ جامعیّتِ علوم مردوں کا حوصلہ ہے، عورتوں کو ان کی رِیس کرنا حوصلہ سے باہر بات کرنا ہے۔ اس جامعیّت کے حصول کی کوشش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جو صفات عورتوں میں ہونی چاہییں وہ بھی باقی نہیں رہیں گی۔ چناں چہ رات دن اس کا تجربہ ہوتا جاتا ہے۔

ایک جنٹ صاحب کی تعلیم نسواں سے متعلق رائے:

مجھ سے ریل میں ایک جنٹ صاحب نے اپنے تجربے کی بنا پر کہا تھا کہ میں نے یہ تجویز پاس کی ہے کہ عورتوں کو جامع معقولات و منقولات نہیں بنانا چاہیے۔ معقولات تو صرف مردوں ہی کو پڑھانا چاہیے، عورتوں کو صرف منقولات پڑھانا چاہیے۔ دیکھیے! تعلیمِ جدید کی خرابیاں اب ان لوگوں کو بھی محسوس ہو چکی ہیں جو اس کے حامی بلکہ موجد تھے۔ وہ جنٹ صاحب کہتے تھے کہ تاریخ اور جغرافیہ سے عورتوں کو کچھ نفع نہیں۔

آج کل کے نوجوان پر عُلَما کا قول تو حجّت نہیں، مگر ایسے لوگوں کا قول ضرور حجّت ہے جو اِن ہی کے ہم خیال تھے اور تجربہ کے بعد دوسری رائے قائم کرنے پر مجبور ہوئے۔ اور درِ حقیقت بات یہی ہے کہ مرد تو تمام علوم کے جامع ہو سکتے ہیں، عورتیں نہیں ہو سکتیں۔ جامعیّت کے لیے بڑے حوصلے کی ضرورت ہے جو عورتوں میں نہیں ہے، مگر آج کل سب کو عقل کا ہیضہ ہو رہا ہے۔ آزادی کا زمانہ ہے، ہر ایک خود مختار ہے۔ چناں چہ عورتیں بھی کسی بات میں مردوں سے پیچھے رہنا نہیں چاہتیں۔ ہر علم و فن کی تکمیل کرنا چاہتی ہیں، تصنیفیں کرتی ہیں، اخبارات میں مضامین بھیجتی ہیں۔

ایک عورت کی تصنیف کا قصّہ:

چناں چہ ان ہی دنوں ایک کتاب میرے پاس بھی رائے لینے کے لیے آئی تھی۔ اس میں

اس قسم کے مضامین تھے کہ اول تو مسلمانوں کی شکایت تھی کہ یہ کسی قسم کی ترقی نہیں کرتے، نہ دین کی نہ دنیا کی۔ (دین کا نام تو برائے نام لیا جاتا ہے، مقصود یہ ہے کہ دنیا کی ترقی نہیں کرتے) قوم کی قوم پستی میں جا پڑی ہے۔ مسلم جماعت دوسری قوموں کی نظر میں سخت حقیر ہو رہی ہے اور حقیر بن کر رہنا اسلامی جمعیّت کے خلاف ہے۔ اس کے بعد اس کتاب میں لکھا ہے کہ آج کل کے مسلمان ہاتھ پیر تو بالکل نہیں ہلاتے، نہ لکھتے ہیں، نہ پڑھتے ہیں، نہ کماتے ہیں۔ جب ان سے کسی کام کو کہا جاتا ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ بلا تقدیر کے کچھ نہیں ہوسکتا، اور جب پریشان ہوتے ہیں تو وظیفے پڑھتے ہیں، دعائیں مانگتے ہیں۔

پھر اس دعا کے مضمون کے بعد لکھا ہے کہ اللہ میاں کہتے ہیں کہ بھائی! مجھے اور بھی کچھ کام ہے یا تمہاری ہی سنتا رہوں، تم تو ہر وقت دعا ہی مانگتے رہتے ہو۔ میں نے جو تم کو ہاتھ پاؤں دے دیئے ہیں ان کو ہلاؤ۔ ان ہی سے اپنا کام نکالو، مجھے کیوں ستائے جاتے ہو؟ نعوذ باللہ، نعوذ باللہ۔ گویا یہ بی بی اللہ میاں کے یہاں پیش کار ہیں کہ اللہ میاں نے ان سے ہی یہ خاص خاص باتیں کہہ دی ہیں، پھر ان کے ذریعے سے دوسروں کو پہنچائی جاتی ہیں۔ کیا کوئی مسلمان ایسی کتاب میں موافقت رائے کرسکتا ہے؟ اور آج کل یہ بھی پیسے کمانے کی ایک آسان ترکیب ہے کہ علما کے پاس ایسی کتابیں بھیجی جاتی ہیں اور ظاہر میں یہ کہا جاتا ہے کہ اگر ان میں کوئی نقص ہو تو اس کی اصلاح کردی جائے۔ اصلاح تو جیسی مقصود ہوتی ہے معلوم ہے۔ اصلی غرض یہ ہے کہ ان پر تقریظ لکھ دی جائے، تاکہ زیادہ اشاعت ہوسکے۔ چناں چہ بعض با اخلاق علماء تقریظ بھی لکھ دیتے ہیں، مگر میں کہتا ہوں کہ یہ سخت غلطی ہے، کیوں کہ اس سے ان کو اس بے ہودہ تعلیم کی اور تائید مل جاتی ہے۔ مجھ سے کوئی پوچھے تو ان کتابوں کی اصلاح یہ ہے کہ سب کو جمع کر کے ایک دم جلا دیا جائے، کیوں کہ ہر چیز میں اعتبار غالب کا ہوا کرتا ہے اور ایسی کتابوں میں غالب شر ہی ہے اور شر کا علاج یہی ہے کہ سب کو جلا دو۔

اخباروں میں عورتوں کے مضامین مع پتا و نشان:

ایک اور آفت یہ ہے کہ تعلیم یافتہ عورتیں اخباروں میں مضامین دیتی ہیں اور ان میں اپنا

نام اور میاں کا نام اور پورا پتہ، حتیٰ کہ محلّہ کا نام اور گلی اور مکان نمبر بھی ہوتا ہے۔ یہ شاید اس واسطے کہ لوگوں کو ان سے خط و کتابت میں، میل ملاقات میں دقت نہ ہو۔ نہ معلوم ان کی غیرت کہاں گئی؟ ان بیبیوں نے تو حیا کو بالکل ہی بالائے طاق رکھ دیا۔ اور خدا جانے ان کے مردوں کی غیرت کہاں گئی؟ انھوں نے اس کو کیوں کر گوارا کیا۔ یوں کہیے کہ بس طبیعتیں ہی مسخ ہوگئی ہیں۔

ایک پرچہ میں عورت کا پیر سے عاشقانہ خطاب:

میرے پاس ایک ماہواری پرچہ آیا تھا، جس میں ایک بی بی کی اپنے پیر کی شان میں غزل تھی۔ جس میں پیر کو اس طرح خطاب تھا جس طرح عاشق و معشوق میں ہوا کرتا ہے۔ تمنّائے وصال کا اظہار، خد و خال کی تعریف، اس کو پڑھ پڑھ کر غیرت آتی تھی۔ میں نے لکھ دیا کہ آج سے یہ رسالہ میرے پاس ہرگز نہ آوے۔ مجھے اس قدر جوشِ غیرت ہوتا ہے کہ پھاڑ کر پھینک دوں۔ تعجب کی بات ہے کہ پڑھنے والے کو غیرت آوے اور جس کے گھر کا قصّہ ہے اس کو غیرت نہ آوے۔

ایک اور لڑکی کی تصنیف کردہ کتاب میرے پاس آئی جس کو میں نے پڑھا تو وہ بہت نافع معلوم ہوئی، اس میں کوئی نقصان کی بات نہ تھی، مگر اخیر میں مصنّفہ کا پورا نام اور پتہ لکھا ہوا تھا کہ فلانی فلاں محلّہ کی رہنے والی۔ میں حیران ہوا کہ اگر تصدیق کرتا ہوں تو پورا پتہ لکھنے کے واسطے بھی سند ہوجائے گی، کیوں کہ نام اور پتہ وغیرہ سب لکھا ہوا ہے۔ اور تصدیق نہیں کرتا ہوں تو سوال ہوسکتا ہے کہ اس میں کون سی بات مضر تھی جو تصدیق نہ کی۔ اس تردد میں تھا کہ ایک ترکیب سمجھ میں آ گئی، وہ یہ کہ میں نے مصنّفہ کا نام کاٹ دیا اور بجائے اس کے لکھ دیا: راقمہ: اللہ کی بندی۔ اور تقریظ میں لکھ دیا کہ یہ کتاب نہایت عمدہ ہے اور سب سے زیادہ خوبی اس میں یہ ہے کہ یہ ایک ایسی بی بی کی تصنیف کردہ ہے جو کہ بڑی حیا دار ہیں کہ انھوں اپنا نام بھی اس پر نہیں لکھا۔

یہ ترکیب نہایت اچھی رہی، اس واسطے کہ اگر وہ میری تصدیق اپنی کتاب پر چھاپیں گی تو اپنا نام نہیں لکھ سکتیں اور اگر اپنا نام لکھیں گی تو میری تصدیق نہیں چھاپ سکتیں۔ چلو! میرا پیچھا

چھوٹا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ عورتوں کو اپنی تصنیف پر اپنا نام لکھنے سے کیا مقصود ہے؟ اگر ایک مفید مضمون دوسری عورتوں کے کان تک پہنچانا ہے تو اس کے لیے نام کی کیا ضرورت ہے؟ مضمون تو بغیر نام کے بھی پہنچ سکتا ہے، پھر نام کیوں لکھا جاتا ہے؟ اس کی وجہ سوا اس کے کیا ہو سکتی ہے کہ دوسروں سے تعلقات پیدا کرنے ہیں۔

سو بیبیو! یاد رکھو کہ تم کو تو تعلّق ایک ہی شخص سے رکھنا ہے۔ یعنی شوہر سے۔ تمہارا ساتھ تو تمام عمر کے لیے اسی کے ساتھ ہے۔ اول تو مردوں کے واسطے بھی میں کہتا ہوں کہ کتاب پر نام لکھنے کی ضرورت نہیں، کیوں کہ مقصود خدمتِ خلق ہے۔ خدمت نام سے نہیں ہوتی تو نام لکھنے میں سوائے شہرت اور نفس پرستی کے کیا ہے؟ مگر خیر مردوں کے لیے چنداں حرج بھی نہیں، بلکہ اس میں ایک یہ مصلحت بھی ہو سکتی ہے کہ مصنّف کے ثقہ یا غیر ثقہ ہونے سے کتاب کا درجہ اور اس کی روایات کا درجہ متعیّن ہو جاتا ہے۔ مگر عورت کے لیے تو کسی طرح بھی نام لکھنا مناسب نہیں ہے، عورت کو تو کوئی تعلّق سوائے خاوند کے کسی سے بھی نہیں رکھنا چاہیے۔ اس کا مذہب تو یہ ہونا چاہیے:

دلا رامے کہ داری دل درد بند
دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

اگر تم محبوب رکھتے ہو تو دل کا تعلّق اسی سے رکھو اور اپنی نگاہ کو سارے عالم سے بند ہی کرلو۔

بلکہ قرآن مجید کے اندر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اجنبی مردوں کے ساتھ ایسا برتاؤ کریں جس سے نفرت پائی جائے نہ کہ محبّت والفت۔ أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ! اس کو لوگوں نے تہذیب سمجھ لیا ہے۔

عورت کی تہذیب یہ ہے کہ اجنبی سے روکھا برتاؤ کرے:

حالاں کہ عورت کے لیے تہذیب یہی ہے کہ غیر آدمی سے رُوکھا برتاؤ کرے۔ افسوس ہے کہ مسلمانوں نے قرآن کو چھوڑ دیا۔ حق تعالیٰ تو یوں فرماتے ہیں:

﴿فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِیْ فِیْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّ قُلْنَ قَوْلًا

مَّعْرُوْفًاo﴾ (الأحزاب: ٣٢).

یعنی کسی سے نرم لہجہ سے بات نہ کرو۔ دیکھیے ! اس آیت کی مخاطب وہ عورتیں ہیں جو مسلمانوں کی مائیں تھیں یعنی ازواجِ مطہرات ، ان کی طرف کسی کی بُری نیت جا ہی نہیں سکتی تھی، مگران کے لیے بھی یہ سخت انتظام کیا گیا،تو دوسری عورتیں تو کس شمار میں ہیں؟ چناں چہ اس کے شروع میں ہی یہ لفظ ﴿لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ﴾ (الأحزاب: ٣٢)موجود ہے، یعنی تم اورعورتوں جیسی نہیں ہو، بلکہ اوروں سے افضل ہو۔ پھر بھی فرماتے ہیں کہ مردوں کے ساتھ نرم لہجے سے بات مت کرو۔ جب بات کرنا ہوتو خشک لہجہ سے کرو،جس سے مخاطب یہ سمجھے کہ بڑی کھری اورتری اور تلخ مزاج ہیں،تا کہ لاحول ہی پڑھ کر چلا جائے ۔نہ یہ کہ نرمی سے گفتگو کرو کہ میں آپ کی محبّت کا شکریہ ادا کرتی ہوں، مجھے جناب کے الطاف کریمانہ کا خاص احساس ہے،جیسا کہ آج کل کے رسالوں میں عورتوں کے مضامین نکلتے ہیں۔ یہ مضامین زہرِ قاتل ہیں،آفت ہیں،طرح طرح کے مفاسد اس پر مرتب ہوتے ہیں۔بعض لوگ اس پر یہ کہہ دیتے ہیں کہ صاحب! بتلائیے ! کیا فساد ہورہا ہے،ہم کوتو نظر نہیں آتا۔ میں کہتا ہوں کہ اول تو فساد موجود ہے اور اگر تم کونظر نہیں آتا تو ممکن ہے کہ بہت قریب آگے چل کر یہ لہجہ کچھ رنگ لاوے گا۔ اُس وقت سب کو معلوم ہوگا اور اِس وقت مجھ کو معلوم ہورہا ہے۔ جیسا کہا گیا ہے:

من ازاں حسن سوز افزوں کہ یوسف داشت دانستم
کہ عشق از پردۂ عصمت بروں آرد زلیخا را

اہلِ نظر شروع ہی میں کھٹک جاتے ہیں کہ یہ چیز کسی وقت میں رنگ لائے گی۔ اور اس کی دلیل بھی خود اس آیت میں ہی موجود ہے کہ ﴿فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ﴾ کے بعد ہی بطور نتیجہ کے فرماتے ہیں: ﴿فَيَطْمَعَ الَّذِیْ فِیْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ﴾ (الأحزاب: ٣٢) کہ اگر خضوع فی القول یعنی نرم لہجہ سے بات کی گئی تو جس کے دل میں روگ ہے اس کے دل میں لالچ پیدا ہوگا اور وہ لہجہ کی نرمی سے سمجھ لے گا کہ یہاں قابو چل سکتا ہے، پھر وہ اس کی تدبیریں اختیار کرے گا۔

دیکھیے ! خود حق تعالیٰ لہجہ کی نرمی کا یہ اثر بتارہے ہیں، پھر کسی کی کیا مجال ہے کہ اس اثر کا

انکار کرے۔ میں اپنی طرف سے تو نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ الفاظِ قرآنی صاف بتاتے ہیں۔ عورتوں کا مردوں سے نرم گفتگو کرنا یہ اثر رکھتا ہے کہ ان کے دلوں میں طمع پیدا ہوتی ہے۔ پھر اس پر بھی بس نہیں کیا، بلکہ اس کے بعد یہ حکم بھی ہے ﴿وَّ قُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا﴾ (الأحزاب: ۳۲)، جس کا ترجمہ یہ ہے کہ جب بات کرو بھی تو ایسی بات کرو جس کو شریعت میں اچھا مانا گیا ہو۔ ایک تو یہ کہ بے ضرورت الفاظ مت بڑھاؤ، کیوں کہ شریعت اس کو کسی کے لیے پسند نہیں کرتی۔ شریعت نے کم بولنے ہی کو پسند کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ ہر بات کو سوچ کر کہو، کوئی بات گناہ کی منہ سے نہ نکل جاوے۔

مختصر ترجمہ معروف کا معقول ہے، تو یہ معنی ہوئے کہ معقول بات کہو۔ معقول بات وہی ہوتی ہے جس سے کوئی برا نتیجہ پیدا نہ ہو۔ جب ثابت ہو چکا کہ لہجہ کی نرمی سے بھی عورتوں کے لیے برا نتیجہ پیدا ہوتا ہے تو محبّت پیار کی باتوں سے کیوں برا نتیجہ پیدا نہ ہوگا، جس کو آج کل تہذیب میں داخل سمجھا گیا ہے۔ تو اس قسم کی باتیں عورتوں کے لیے معقول نہیں بلکہ نا معقول ہیں۔ اور یہ کچھ تعجب کی بات نہیں ہے کہ ایک بات ایک کے لیے معقول ہو اور دوسرے کے لیے نا معقول، ایک کے لیے سختی سے بات کرنا اور بے رُخی سے جواب دینا معقول ہوسکتا ہے اور دوسرے کے لیے نا معقول۔

مردوں کی تہذیب اور ہے، عورتوں کی اور:

تمہارے لیے یعنی مردوں کے واسطے باہمی کلام کا معقول طریقہ یہ ہے کہ نرمی سے بات کرو، کسی کو سخت جواب نہ دو، روکھا پن نہ برتو۔ اور عورتوں کے لیے معقول طریقہ یہ ہے کہ اجنبی کے ساتھ نرمی سے بات نہ کریں اور سختی سے جواب دیں اور روکھا برتاؤ کریں۔

در حق او مدح در حق تو ذم
در حق او شہد در حق تو سم

مولانا فرماتے ہیں کہ ایک ہی بات کسی کے لیے داخلِ مدح ہوتی ہے اور دوسرے کے لیے داخلِ ذم ہوتی ہے۔ جیسے اس شبان کی گفتگو جو حق تعالیٰ کی شان میں کہہ رہا تھا کہ آپ

کہاں ہیں؟ میں آپ کو دودھ پلاؤں اور کپڑوں کی جوئیں دیکھوں وغیرہ وغیرہ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ گفتگو سن کر غصّہ آ گیا اور اس کو ڈانٹا، مگر حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو متنبہ فرمایا کہ ہمارے ساتھ ہر شخص کا تعلّق جداگانہ ہے۔ اس حکایت کا حاصل یہی ہے کہ یہ باتیں تمہارے حق میں بری ہیں، مگر اس کے حق میں بری نہیں۔

اسی اعتبار سے اس وقت میں نے یہ شعر پڑھا ہے، مطلب یہ ہے کہ ایک ہی بات مردوں کے لیے بری اور عورتوں کے لیے اچھی ہو سکتی ہے۔ عورتوں کے لیے یہی مناسب ہے کہ جب غیر مردوں سے بات کریں تو خوب روکھے اور سخت لہجہ میں اور ڈانٹ ڈپٹ کے ساتھ کریں۔ اول تو مردوں سے بولنا ہی نہیں چاہیے مگر بضرورت بولنا جائز ہے، تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ سختی سے گفتگو ہو تا کہ دوسرے کے دل میں کشش اور میلان پیدا نہ ہو۔ اور یہ طریقہ عورتوں کے لیے علاوہ شرعی حکم ہونے کے طبعی بھی ہے۔ افسوس ہے کہ ایک فطری اچھی خصلت کو قصداً بگاڑا جا رہا ہے۔ دیہات میں دیکھیے کہ بھنگن و چماری سے بھی خطاب کیجیے تو وہ منہ پھیر کر اول تو اشارے سے جواب دے گی۔ مثلاً راستہ پوچھیے، تو انگلی اٹھا کر بتا دے گی کہ ادھر ہے، اور اگر بولنا ہی پڑے تو بہت تھوڑے سے الفاظ میں مطلب کو ادا کر دے گی۔ نہ اس میں القاب ہوں گے نہ آداب، نہ ضرورت سے زیادہ الفاظ، نہ آواز نرم ہوگی، بلکہ اس طرح بولے گی کہ جیسے کوئی زبردستی بات کرتا ہے۔ چوں کہ دیہات والوں میں یہ اخلاقِ طبعی موجود ہوتے ہیں اور ان سے انحراف کے اسباب وہاں نہیں پائے جاتے، اس واسطے دیہاتیوں کے اخلاق و عادات اپنی جبلّی حالت پر ہوتے ہیں۔

حیا عورت کے لیے طبعی امر ہے:

حیا عورت کے لیے طبعی امر ہے اور اس کے آثار ان دیہاتی عورتوں میں جن پر زوالِ حیا کے اسباب نے اثر نہیں کیا ہے موجود ہیں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ طبعی بات عورت کے لیے یہی ہے کہ غیر مردوں سے میل جول نہ کرے اور کوئی ایسی بات قول میں یا فعل میں اختیار نہ کرے جس سے میل جول یا کشش پیدا ہو۔ یہی شریعت کی تعلیم ہے، تو شریعت فطرت کے بالکل موافق ہے، مگر افسوس ہے کہ آج کل طبعی اخلاق سے بُعد ہو گیا ہے اور جو باتیں بری سمجھی

جاتی تھیں وہ اچھی سمجھی جانے لگیں، حتیٰ کہ اس قسم کے مضامین اور ایسے خیالات اور ایسے جذبات جن سے خواہ مخواہ میلان ہو آج کل ہنر سمجھے جانے لگے۔ اس سے بہت ہی پرہیز کرنا چاہیے، اللہ محفوظ رکھے۔ یہ اثر اس نئی تعلیم کا ہے، اس لیے یہ تعلیم تعلیم نہیں بلکہ تجہیل ہے اور عورتوں کے لیے تو نہایت ہی مضر ہے۔

عورتوں کے لیے تعلیم کا وقت بچپن کا وقت ہے، مگر آج کل شہروں میں بچپن ہی سے لڑکیوں کو نئی تعلیم دی جاتی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس تعلیم کے آثار و نتائج ان کی رگ و پے میں سرایت کر جاتے ہیں پھر دوسری کوئی تعلیم ان پر اثر کرتی ہی نہیں۔ لڑکیوں کی مثال بالکل کچی نرم لکڑی کی سی ہے، اس کو جس صورت پر قائم کر کے خشک کر دو گے تمام عمر ویسی ہی رہے گی۔ جب بچپن ہی سے نئی تعلیم دی گئی، نئے اخلاق سکھائے گئے، نئی وضع قطع، نیا طرزِ معاشرت ان کی نظروں میں رہا تو وہ اسی میں پختہ ہو گئیں۔ بڑی ہو کر ان کی اصلاح کسی طرح نہیں ہو سکتی۔

لڑکیوں کو پرانی تعلیم دینا چاہیے:

لہٰذا ضرورت ہے کہ بچیوں کو بجائے نئی تعلیم کے پرانی تعلیم دیجیے، تاکہ وہی تعلیم ان کی رگ و پے میں رچ جائے۔ پھر آپ دیکھیں گے کہ بڑی ہو کر وہ کیسی باحیا، سلیقہ شعار، دین دار سمجھ دار ہوں گی۔

لڑکیوں کا اشعار یاد کرنا:

بعض جگہ ہم نے دیکھا ہے کہ لڑکیوں کو اشعار یاد کرائے جاتے ہیں، وہ ان کو گاتی ہیں اور لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ تو تصوف کے اشعار ہیں جن سے اخلاق کی درستی ہوتی ہے۔ میں کہتا ہوں: تصوف بے شک ایسی ہی چیز ہے، تصوف ہر خوبی کی جان ہے، مگر اشعار کا نام تصوف نہیں ہے۔ نظم کے ساتھ اس کو کوئی خصوصیّت نہیں ہے۔

تصوّف کی حقیقت:

بلکہ تصوف نام ہے درستیٔ ظاہر و باطن کا، تو کیا ظاہر و باطن کی درستی نظم ہی سے ہو سکتی ہے نثر سے نہیں ہو سکتی؟ بلکہ میں کہتا ہوں کہ درستیٔ اخلاق تو نثر ہی سے ہو سکتی ہے، نظم سے نہیں ہو سکتی،

کیوں کہ اصلاحِ اخلاق مجاہدہ اور مشقت سے ہوتی ہے جس میں ترکِ لذات کرنا پڑتا ہے اور شعر وشاعری اور نظم اور غزل خوانی تو لذات میں داخل ہے، اس سے اصلاح کیا ہوتی؟ غرض تصوف نام شعر وشاعری اور دیوانِ حافظ پڑھنے کا نہیں ہے، صرف یہ دیکھ کر یہ شعر دیوانِ حافظ کا ہے یہ سمجھ لینا کہ اس کا پڑھ لینا داخلِ تصوف ہے اور یہ کسی حال میں مُضر نہیں ہوسکتا، محض غلطی ہے۔

اہلِ تصوف کے اشعار سب کو مفید نہیں:

کیوں کہ ان حضرات کے اشعار سب کو مفید نہیں ہوتے، بلکہ بہت سے لوگوں کو مضر ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اہلِ حال تھے۔ ان کے حال کا اثر ان کے کلام میں بھی موجود ہے اور ہر شخص اس حالت کا تحمّل نہیں کرسکتا، خاص کر عورتیں کیوں کہ ضعیف القلب ہوتی ہیں، ان پر تو اندیشہ ہے کہ اگر اچھی حالت بھی غالب ہوگئی تو بیمار ہوجائیں گی۔ تصوف تو عورتوں کو ان اشعار سے کیا حاصل ہوتا صحت جسمانی بھی جاتی رہے گی۔ غرض شعر اشعار کا پڑھنا پڑھانا عورتوں کے لیے ٹھیک نہیں بلکہ فتنہ ہے۔

عورتوں کے لیے کس قسم کی کتابیں مناسب ہیں:

عورتوں کے لیے تو بس ایسی کتابیں مناسب ہیں جن سے خدا کا خوف، جنّت کی طمع، دوزخ سے ڈر پیدا ہو۔ اس کا اثر عورتوں پر بہت اچھا ہوتا ہے۔ اب اس تعلیم کو تو لوگوں نے چھوڑ دیا اور وہ تعلیم اختیار کرلی جو مُضِر ہے۔ جو تعلیم مفید اور ضروری تھی اس میں تو کمی ہوتی جاتی ہے بلکہ ناپید ہوتی جاتی ہے، اسی تعلیم کے نہ ہونے کے یہ نتائج ہیں کہ عورتوں کے اخلاق درست نہیں ہوتے۔ اور باوجودیکہ ان میں محبّت اور جاں نثاری اور ایثار کا مادہ بہت زیادہ ہے، پھر بھی خاوند سے ان کی نہیں بنتی، کیوں کہ مذہبی تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے ان میں پھوہڑپنا اور بے باکی موجود ہے کہ جو کچھ زبان پر آجائے بے دھڑک بک ڈالتی ہیں جس سے خاوند کو تکلیف پہنچتی ہے اور خانہ جنگیاں پیدا ہوتی ہیں، زندگی تلخ ہوجاتی ہے۔ اس لیے میں پھر کہتا ہوں کہ عورتوں کو وہ تعلیم دو جس کو پرانی تعلیم کہا جاتا ہے اور وہی تعلیم مصلحِ اخلاق ہے، بقدر کفایت ضرور دینا چاہیے، جس سے ان کی آخرت اور دنیا سب درست ہوجائیں، عقائد صحیح ہوں، عادات درست ہوں،

معاملات صاف ہوں، اخلاق پاکیزہ ہوں۔ پھر ہم دیکھیں معاشرت کیسے اچھی نہیں ہوتی۔ معاملات کی صفائی ہی کا بیان ہو رہا تھا جس پر اتنا مضمون بڑھ گیا۔

بیان یہ تھا کہ گھروں کے اندر بہت گھال میل ہے جس سے معاشرت خراب اور زندگی وبال جان ہوتی ہے۔ آپس میں رنجشیں ہوتی ہیں اور آخرت بھی برباد ہوتی ہے، کیوں کہ اہلِ حق کے حقوق تلف ہوتے ہیں جس پر آخرت میں سخت مواخذہ ہوگا۔ عورتوں میں جو واعظ وعظ کہنے کے لیے پہنچتے ہیں وہ بھی ضروریات کی، مثلاً معاملات کی صفائی اور گھر کے سامان میں گھال میل نہ ہونے کی تعلیم نہیں کرتے۔ پس واعظوں کو تو وہی حدیث یاد ہے:

يَا مَعْشَرَ النِّسَاءِ تَصَدَّقْنَ مِنْ حُلِيِّكُنَّ

پس ان کو چندہ دے دو، چاہے کسی کا مال ہو۔

اور اس حدیث میں سے بھی صرف تصدقن کا لفظ ان کا مطمحِ نظر ہوتا ہے، حالاں کہ آگے مِنْ حُلِيِّكُنَّ بھی موجود ہے جس کا مطلب میں نے ابھی بیان کیا: اپنے مملوک زیور میں سے دو۔ اور اسی پر یہ مضمون چلا تھا کہ عرب میں مرد و عورت کی مملوکہ چیزیں الگ الگ ہوتی تھیں، مگر ہمارے یہاں اس میں گڑبڑ ہے۔ خود ان کے زیور میں بھی شبہ ہے کہ ان کا، یا شوہر کا یا شرکت کا۔

سو واعظوں کا یہ طرزِ عمل ایسا ہی ہے جیسا کسی نے ایک شخص سے پوچھا کہ قرآن شریف کی کون سی آیت سب سے زیادہ پسند ہے؟ کہا: ﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا﴾ (البقرة: ٦٠)، کہا: دعا کون سی پسند ہے؟ کہا: ﴿رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ﴾ (المائدة: ١١٤)، یعنی اے اللہ! لگا لگایا خوان کھانے کا اتار دیجیے کہ سوائے کھالینے کے کچھ نہ کرنا پڑے۔ اس شخص کو اپنے مطلب ہی کی آیت اور مطلب ہی کی دعا یاد تھی۔ ایسے ہی ہمارے واعظ صاحبان کو بھی اپنے مطلب کی ایک ہی حدیث یاد ہے: يَا مَعْشَرَ النِّسَاءِ تَصَدَّقْنَ، کہ بس خیرات کردو اور زیور ان کو دے دو، جگنو اتار دو، چمپاکلی اتار دو، کانوں کی سب بالیاں اتار دو۔ یہ بھی مت دیکھو کہ اپنی ہیں یا دوسرے کی، اور ان کا دینا بھی جائز ہے یا ناجائز، اور داخلِ خیرات ہے یا داخلِ سیئات۔ بس یہ حدیث پڑھ کر بے چاریوں سے چندہ وصول کر لیتے ہیں اور اس کے لیے طرح

طرح کی ترکیبوں سے کام لیتے ہیں۔ واعظوں کا بیان بڑا لچھے دار ہوتا ہے جس سے عورتیں بہت جلدی پگھل جاتی ہیں۔

ایک واعظ صاحب کا قصّہ:

چناں چہ ایک جگہ مسجد زیرِ تعمیر تھی، سارا کام ہوگیا تھا صرف فرش باقی تھا۔ تو ایک بزرگ واعظ نے عورتوں میں وعظ کہنا شروع کیا۔ اول تو مسجد بنانے کے فضائل بیان کیے، پھر کہا: اس وقت ایک مسجد زیرِ تعمیر تھی مگر وہ پوری ہوچکی، جس کی قسمت میں جتنا ثواب تھا اتنا حصّہ اس نے لے لیا، مگر افسوس ہے کہ بے چاری عورتیں محروم رہ گئیں، یہ ان کی قسمت ہے۔ یہ غریب گھروں میں بیٹھنے والی ہیں، ان کو کیا خبر کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟ کیا کیا دولتیں لُٹ رہی ہیں؟ واقعی بہت افسوس ہوا کہ عورتیں اس ثواب میں شامل نہ ہوسکیں۔

جب واعظ صاحب نے دیکھا کہ عورتوں پر رنج وحسرت کا کافی اثر ہوچکا تو آپ فرماتے ہیں کہ اخاہ! خوب یاد آیا میاں! ابھی فرش تو باقی ہے ہی، اور مسجد میں اصل چیز فرش ہی تو ہے، فرش ہی پر نماز ہوتی ہے، درودیوار پر تھوڑا ہی پڑھی جاتی ہے۔ واقعی عورتیں بڑی خوش قسمت ہیں کہ اصل چیز ان ہی کے واسطے رہ گئی۔ اب بیبیوں کو حصّہ لینے کا خوب موقع ہے۔ اور اے بیبیو! اگر فرش تم نے بنوا دیا تو کیسا لطف کا واقعہ ہوگا کہ مرد اس پر نماز پڑھیں گے اور فرشتے ان کی نمازیں لے کر دربارِ الٰہی میں جائیں گے، تو یوں کہیں گے کہ لیجیے حضور! بندوں کی نمازیں اور بندیوں کی جانمازیں۔

بس یہ کہنا تھا کہ پردہ کے پیچھے سے چھنا چھن کی آواز آنے لگی۔ کسی نے پازیب اتار کر پھینکی، کسی نے جھانور اور کسی نے پہنچی، کسی نے ہار۔ بندۂ خدا نے ایک شاعرانہ جملہ میں ہزاروں روپیہ کا زیور لے لیا۔ مجھے تو یہ ترکیبیں پسند نہیں، یہ تو پالیسی ہے۔

شریعت میں پالیسی کی تعلیم نہیں:

شریعت نے ہم کو پالیسی کی تعلیم نہیں کی، بلکہ حدود کے اندر رہنے کا حکم دیا ہے، خواہ چندہ آئے یا نہ آئے۔

ایک واعظ صاحب کا قصّہ:

اسی طرح ایک واعظ صاحب کا قصّہ ہے کہ ان کے وعظ میں ایک عورت نے اپنی ایک پازیب دی تو فرمانے لگے کہ ایک پاؤں تو جنّت میں گیا، ایک پاؤں دوزخ میں ہی رہا۔ خیال تو کیجیے کہ یہ کیسی ترکیبیں کرتے ہیں؟ اس بے چاری نے دوسری بھی دے دی۔ واعظ کو آگے نہیں سوجھی، ورنہ یوں کہنے لگتے کہ ہائے افسوس!! ٹانگیں تو جنّت میں گئیں، مگر اُوپر کا جسم جنّت کے باہر ہی رہا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ عورتیں سر سے پیر تک کا زیور سب اُتار کر ان کے حوالہ کر دیتیں۔ عورتیں اکثر بھولی بھالی اور اَن پڑھ ہوتی ہیں۔ واعظ صاحب جو کچھ کہیں وہ اس کو اللہ میاں کا حکم سمجھتی ہیں اور اُس کی تعمیل کرنے کو تیار ہو جاتی ہیں۔ ہم تو ان ترکیبوں کو بالکل ناجائز سمجھتے ہیں۔ اگر خدا کا کام کرنے کو کھڑے ہوئے ہو اسی طرح کرو جس طرح خدا نے بتایا ہے کہ نہ کسی پر بار ڈالو، نہ پالیسی سے کام لو۔ بس سیدھے سادھے الفاظ میں ضرورت کو بیان کر دو۔ پھر اگر وہ کام واقعی خدا کا کام ہے تو نہ مسجد رکے گی، نہ مدرسہ رکے گا۔ اور اگر خدا کا کام نہیں یا خدا کے واسطے نہیں، بلکہ محض تمہارے نفس کی خواہش اور غرض ہے تو اُس کا پورا نہ ہونا ہی اچھا ہے۔

پالیسی کے لیے حدیث وقرآن کو کیوں آڑ بناتے ہو؟

اور اگر کسی کو ترکیب ہی کرنا ہو تو اس کے لیے حدیث وقرآن کو کیوں آڑ بنایا جائے، یہ تو بہت سخت بات ہے ترکیبوں کے لیے قرآن وحدیث سے کام لیا جائے:

حافظا مے خورد رندی کن وخوش باش دلے
دام تزویر مکن چوں دگراں قرآن را

اگر ناجائز کام کرنا ہی ہے تو ناجائز طریقے سے کرو، دین کو اس کے لیے ذریعہ کیوں بناتے ہو؟

غرض واعظوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ اگر ان کو اپنا کوئی مطلب نکالنا ہوتا ہے تو عورتوں کو عذاب سے ڈراتے دھمکاتے ہیں اور ترکیبوں چالاکیوں سے جو کچھ ہوسکتا ہے ان سے وصول کر لیتے ہیں۔ اور اگر فی الوقت کوئی مطلب نکالنا نہیں ہوتا تو پھر ایسے مضامین بیان

کریں گے جن سے وہ غریب مایوس ہو جائیں۔ ہم نے کبھی نہیں دیکھا کہ عورتوں کو وعظ سن کر خدا تعالیٰ کی رحمت کی کچھ امید ہوئی ہو۔ ہاں مایوسی ضرور ہو جاتی ہے، اس لیے عورتیں بھی ایسی بہادر ہیں کہ اِدھر وعظ سنا، اُدھر دو تین منٹ کے بعد ہی اس کے خلاف عمل شروع ہو گیا کہ اُسے کاٹا اسے کوسا۔ ابھی وعظ میں رو رہی تھیں اور ابھی چیخ پکار کر رہی ہیں، دوسروں سے لڑ رہی ہیں۔

اس کی وجہ یہی ہے کہ وعظ میں خوف اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ ان کو نجات سے مایوسی ہو جاتی ہے۔ وہ بھی سمجھ لیتی ہیں کہ ہم دوزخی تو ہیں ہی، پھر نفس کو مارنے میں کیا فائدہ؟ نیک و بد سے کیا واسطہ؟ جس حال میں ہیں اسی حال میں کیوں نہ رہیں؟ آپ نے دیکھا ہوگا جس شریر بچے کو بار بار پیٹا جائے، اٹھتے جوتی بیٹھتے لات کا معاملہ رکھا جائے، وہ بے حیا ہو جاتا ہے، پھر وہ کسی سے نہیں دبتا۔ اسی طرح واعظ صاحب نے ترہیب کے مضامین بیان کر کر کے عورتوں کو نڈر کر دیا ہے۔ مطلب میرا یہ ہے کہ جہاں ترہیب کی ضرورت ہے وہاں ترغیب کی بھی ضرورت ہے۔ اسی لیے قرآن مجید میں ترغیب و ترہیب دوش بدوش ہیں۔

میں نے یہ آیت اس وقت اس لیے اختیار کی ہے کہ اس میں عورتوں کے لیے ترغیب کا مضمون ہے۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ شانہٗ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثٰى﴾

(آل عمران: ۹۵)

میں اوپر بیان کر چکا ہوں کہ اس وقت مقصود بیان صرف تعمیم رحمت حق کا ظاہر کرنا ہے جس پر ﴿مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثٰى﴾ کا لفظ دال ہے اور اسی جزو کا مجھے بیان کرنا مقصود ہے۔ فرماتے ہیں: میں کسی کام کرنے والے کا عمل ضائع نہیں کرتا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ یعنی ہمارے یہاں نیک عمل ہر مومن کا مقبول ہے، یہ نہیں کہ عورت کے عورت ہونے کی وجہ سے کوئی عمل مردود ہو جائے، یا مرد کے مرد ہونے کی وجہ سے کوئی عمل مقبول ہو جائے۔ دوسری آیت میں فرماتے ہیں:

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَ

﴿لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۝﴾ (نحل:۹۷)

یعنی جو کوئی نیک عمل کرے گا، خواہ وہ کوئی مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ کوئی مومن ہو، تو ہم اس کو حیاتِ طیّبہ نصیب کریں گے اور اس کو جزا دیں گے اچھے عمل کی۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ اصول کا قاعدہ ہے کہ جن آیات میں کوئی تصریح عورت یا مرد کی نہیں ہوتی، ان کا مضمون مردوں اور عورتوں سب کو عام ہوتا ہے، اِس بنا پر اس تصریح کی کوئی ضرورت نہیں تھی کہ کوئی عمل کرنے والا مرد ہو یا عورت، پھر ان آیتوں میں لفظ ﴿مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى﴾ کے لانے کا کیا سبب ہے؟ اس کا پتا شانِ نزول سے چلتا ہے۔

شانِ نزول:

شانِ نزول حسبِ روایت ترمذی یہ ہے کہ حضرت اُمِّ سَلَمہ رضی اللہ عنہا نے ایک دفعہ بطورِ حسرت کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ قرآن شریف میں عورتوں کا ذکر کہیں نہیں آتا۔ ان کی خاطر سے حق تعالیٰ نے بعض آیات میں صراحۃً عورتوں کا ذکر فرما دیا، تاکہ یہ حسرت نہ رہے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو یاد نہیں فرماتے۔

حق تعالیٰ کو عورتوں کی رعایت کس قدر ملحوظ ہے؟

دیکھو! عورتوں کی خاطر اللہ میاں کو کس قدر منظور ہے کہ باوجود ضرورت نہ ہونے کے تصریح کے ساتھ عورتوں کا ذکر بھی کر دیا۔ اس کی قدر ہم کو اس وجہ سے نہیں کہ جب سے ہوش سنبھالا، قرآن سنا تو اس میں بہت جگہ ایسے الفاظ سنے جو عورتوں کی شان میں ہیں۔ بس سنتے سُنتے مساوات ہوگئی۔ اب جب ایسی آیتیں پڑھتے ہیں تو کوئی نئی بات معلوم نہیں ہوتی۔ اس کی قدر ان عورتوں کے دل سے پوچھو جن کو یہ حسرت ہو چکی تھی کہ اللہ تعالیٰ ہمارا ذکر نہیں فرماتے، پھر ان کی حسرت کو حق تعالیٰ نے پورا کیا۔ یہ بے چاری قرآن میں ہر جگہ مردوں ہی کا ذکر پاتی تھیں اس سے ان کا دل مرجاتا ہوگا۔ اور یہ خیال ہوتا ہوگا کہ کیا ہم عورتیں حق تعالیٰ کے نزدیک کسی شمار میں بھی نہیں جو کہیں ہمارا ذکر نہیں فرماتے۔ اب سوچیے کہ جس وقت ان کی تمنّا کے موافق قرآن میں الفاظ اُترے ہوں گے تو ان کا کیا حال ہوا ہوگا؟ اس کا لطف دوسرا کوئی

کب سمجھ سکتا ہے؟

حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ کی حکایت کہ حق تعالیٰ نے ان کو پیغام بھیجا:

ایک صحابی ہیں حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ۔ شیخین کی روایت میں ہے کہ اُن سے ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے اُبی! خداوند تعالیٰ کا حکم ہے کہ میں تم کو سورۂ لَمْ یَکُنْ پڑھ کر سناؤں۔ یہ سُن کر ان کو وجد سا آ گیا اور عرض کیا: آللّٰہُ سَمَّانِيْ؟ یعنی کیا اللہ میاں نے میرا نام لیا؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں، اللہ تعالیٰ نے تمہارا نام لیا۔ واقعی اس وقت جو حالت بھی ان کی ہوئی ہو کم ہے۔ سوچیے تو کہ جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پیغام ان کو سنایا ہوگا اگر اُن کو شادیٔ مرگ ہو جاتی تو بجا تھا۔ پھر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا: نَعَمْ! اَللّٰہُ سَمَّاكَ، یعنی ہاں اللہ تعالیٰ نے تمہارا نام لے کر فرمایا۔ بس یہ سن کر وہ پھوٹ کر رو پڑے، اس حالت کا اندازہ کوئی کیا کر سکتا ہے۔

جوشِ محبّت کا رونا:

رہا یہ کہ پھر رونا کس لیے تھا؟ تو حضور! یہ رونا نہ شادی کا تھا، نہ رنج کا تھا، بلکہ گرمیٔ عشق کا تھا۔ اس کی تحقیق مشکل ہے۔ یعنی سمجھتے ہیں کہ خوشی کا رونا تھا، مگر یہ بات نہیں۔ حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ کی بھی تحقیق ہے کہ یہ رونا محبّت کے جوش کا تھا کہ ان کو یہ خیال ہوا کہ اے اللہ! میں اس قابل کہاں تھا کہ آپ میرا نام لیں۔ اس خیال سے محبّت کا جوش اٹھا اور گریہ طاری ہوا۔

بلبلے برگ گل خوش رنگ:

حضرت حافظ شیرازی رحمہ اللہ نے بھی ایک مثالی قصّہ کے پیرایہ میں اس حقیقت کو ذکر کیا ہے، فرماتے ہیں:

بلبلے برگ گلِ خوش رنگ در منقار داشت
واندراں برگ ونوا خوش نالہائے زاد داشت

یعنی ایک بلبل پھول کی پنکھڑی چونچ میں لیے ہوئے بہت کچھ آہ و نالہ کر رہا تھا۔

گفتمش در عین وصل ایں نالہ وفریاد چیست؟
گفت مارا جلوہ معشوق در ایں کار داشت

یعنی میں نے اس سے کہا کہ تجھے تو اس وقت وصل گل حاصل ہے، چونچ میں پنکھڑی لیے ہوئے ہے۔ یہ تو خوشی کا وقت ہے، اس وقت نالہ وفریاد کیسا؟

اس نے جواب دیا کہ جلوۂ معشوق کا اثر یہی ہے کہ نالہ وفریاد کیا جائے، اس کی تجلّی کے ظہور کا اثر یہی ہے۔ کہتے ہیں نا:

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

کیوں صاحب! ایسے وقت میں کہ محبوب گھر میں آجائے، گھر کا کیا دیکھنا۔

غایتِ قرب میں تحیر ہوتا ہے:

بات یہ ہے کہ غایتِ قرب سے تحیر پیدا ہوجاتا ہے اور بار بار یہ خیال ہوتا ہے کہ ہم اور ہمارا گھر اس قابل کہاں تھا کہ وہ تشریف لائیں، اس واسطے حیران ہوکر کبھی اپنے آپ کو دیکھتا ہے اور کبھی گھر کو، اور سمجھتا ہے کہ میں اور میرا گھر تو اس قابل تھا نہیں کہ یہ دولت نصیب ہو، اسی کا نام تحیّر ہے۔ اسی طرح وہ بلبل عین وصال کے وقت تحیر میں تھا۔ یہ حالت حضرت اُبیّ بن کعب رضی اللہ عنہ پر طاری ہوئی۔ یہ جوشِ محبّت تھا، ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اس قابل ہوں کہ خدا تعالیٰ میرا نام لیں۔ واقعی وجد کی بات ہے۔ چناں چہ ان پر وجد طاری ہوا اور رونے لگے۔ محبوب کی مجلس میں عاشق کا ذکر ہی آجاوے تو وجد کے لیے کافی ہے۔ ایک صاحب فرماتے ہیں:

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

غرض اس وقت اس لفظ ﴿أَوْ أُنْثَىٰ﴾ کی اس لیے قدر نہیں محسوس ہوتی کہ تمام عمر سے ہمیں قرآن میں یہ لفظ موجود ملا ہے۔ اس کی قدر اُن سے پوچھی جائے جن کی حسرت وتمنّا کے بعد یہ لفظ نازل ہوا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک عاشق کو محبوب کے دربار کے قریب تک

پہنچنے کا موقع تو ملتا ہے، مگر محبوب کبھی اس کی طرف توجہ نہیں کرتا دوسروں سے ہی بات چیت کرتا رہتا ہے اور یہ اس حسرت میں گُھلا جاتا ہے کہ افسوس! میرا نام بھی تو کبھی اس کی زبان پر نہیں آتا۔ اس نے کسی خاص مقرب بارگاہ سے اپنی حسرت کو ظاہر کیا، اس نے محبوب کے کان تک یہ بات پہنچادی۔ جب دوسرے وقت محبوب نے مجلس میں کوئی چیز مثلاً پان تقسیم کیے اور خادم سے کہا کہ سب صاحبوں کو پان دے دو اور فلاں صاحب کو ضرور دینا، عاشق کا نام لے کر کہا، تو آپ اندازہ کیجیے کہ اس وقت اس عاشق کی کیا حالت ہوگی؟ یقیناً اس کو وجد آ جاوے گا اور ناچتا پھرے گا۔ مگر دوسرے حُضّارِ مجلس کے نزدیک یہ بات بھی کچھ نہ ہوگی، وجہ یہ ہے کہ اس کو بڑی تمنّا کے بعد یہ دولت نصیب ہوئی ہے اور دوسروں کو بلا تمنّا کے نصیب تھی۔

صاحبو! ہم لوگوں کو قرآن پورا مکمّل جمع شدہ مل گیا ہے، ہم اس قسم کی آیتیں ہر دور میں پڑھتے ہیں اور کبھی اس طرف خیال بھی نہیں گیا کہ ان میں کیا دولت بھری ہوئی ہے؟ اس کو حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا یا اس وقت کی دوسری بیبیوں سے پوچھنا چاہیے کہ ان آیتوں کو سن کر اُن کی کیا حالت ہوئی ہوگی؟

اے بیبیو! کیا یہ تھوڑی بات ہے کہ حق تعالیٰ نے تم کو خاص طور سے یاد فرمایا اور یاد بھی کس طرح فرمایا کہ مردوں کے برابر بٹھا دیا، کیوں کہ اس آیت میں جن باتوں کا وعدہ کیا ہے ان میں مردوں اور عورتوں میں کچھ فرق نہیں کیا، تو یہ کہنا صحیح ہے کہ عورتوں کو مردوں کے برابر بٹھا دیا گو بائیں طرف بٹھایا ہے۔ کیوں کہ آیت میں پہلے لفظ ﴿مِنْ ذَكَرٍ﴾ ہے، اس کے بعد ﴿أَوْ أُنْثٰى﴾ ہے۔ اور یہ بات معلوم ہے کہ قرآن عربی زبان ہے اور عربی زبان کا خط دائیں سے بائیں طرف کو ہوتا ہے، تو دائیں طرف والے کو اول اور بائیں طرف والے کو دوم کہہ سکتے ہیں۔ قرآن کی تحریر انگریزی نہیں ہے کہ بائیں طرف سے دائیں طرف کو ہو اور بائیں طرف والے کو اول اور دائیں طرف والے کو دوم کہہ سکیں۔ یہ اس واسطے کہہ دیا کہ آج کل انگریزیت کا غلبہ ہے، کوئی ذہین بی بی یہ استدلال نہ کر بیٹھیں کہ بائیں طرف والا اول اور دائیں طرف والا دوم ہوتا ہے۔ خیر یہ ایک لطیفہ سا ہے۔ مگر یہ بات شریعت میں ثابت ہے کہ عورت کسی قدر مرد سے درجہ میں گھٹی ہوئی ہے (بدلیل ﴿وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ﴾

و مثلها من الآيَاتِ. جامع)۔اور گو اس آیت میں کسی بات میں مرد و عورت میں فرق نہیں کیا گیا، لیکن چوں کہ ترتیبِ عبارت میں عورتیں موخر ہیں مردوں سے، اس واسطے میں نے یہ کہا کہ ان کو بائیں طرف بٹھایا۔ یا یوں سمجھ لو کہ عورتیں جسم میں بائیں آنکھ ہیں اور مرد دائیں آنکھ ہیں اور بائیں آنکھ کسی بات میں داہنی سے کم نہیں، نہ ضروری ہونے میں، نہ کام دینے میں۔ باقی یہ بات ضرور ہے کہ شریعت نے عورتوں کو مردوں کے ساتھ من کل الوجوہ مساوات نہیں دی، جیسا کہ اس زمانہ کے نئے تعلیم یافتہ طبقہ کا خیال ہے۔ وہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ ناانصافی ہے کہ ایک صنف کو دوسری صنف[1] سے گھٹا دیا جائے۔

بیبیو! تمہارا بائیں طرف رہنا ہی سلامتی کی بات ہے۔ ہر چیز اپنے موقع پر اچھی ہوتی ہے۔ سر کی چیز سر ہی پر اچھی ہوتی ہے اور پاؤں کی چیز پاؤں میں، اور اس میں سلامتی ہونے کی وجہ یہ ہے کہ عورت میں عقل کم ہوتی ہے اور جس میں عقل کم ہو اس سے ہر کام میں غلطی کرنے کا احتمال ہے۔ لہٰذا اس کے واسطے سلامتی اسی میں ہے کہ وہ زیادہ عقل والے کا تابع ہو۔ اسی واسطے حق تعالیٰ نے مردوں کو ان پر حاکم بنایا۔ چناں چہ فرماتے ہیں: ﴿الرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ﴾ (النساء: ۳۴) تاکہ ان کے سب کام ان کی نگرانی میں ہوں اور غلطی سے

---

[1] راقم کہتا ہے کہ یہ غلطی ہے کہ ہر جگہ ایک صنف کو دوسری صنف کے برابر رکھا جاوے۔ ملک کے لیے دو صنف کی ضرورت ہے بادشاہ کی اور رعایا کی، کیا بادشاہ اور رعایا کو برابر کیا جاسکتا ہے؟ گاڑی کے لیے ضرورت ہے مالک اور سائیس کی، کیا دونوں کو برابر کیا جاسکتا ہے؟ بلکہ قاعدۂ فطری یہ ہے کہ اگر دو چیزیں ایک چیز کا جزو ہوں اور دونوں میں کوئی وجہ ترجیح نہ ہو تو اُن کو باہم مرتبط رکھنے کے لیے ایک تیسری چیز کے ماتحت کر دیا جاتا ہے، جیسے جگر و دماغ بدن کے اجزا ہیں دونوں کو مرتبط رکھنے کے لیے دل کا ماتحت کر دیا گیا، اسی واسطے دل ایک ہی ہوتا ہے، ورنہ دو دل ہوں گے تو ان کو مرتبط رکھنے کے لیے تیسرے دل کی ضرورت ہوگی۔ اور اگر وہ دونوں چیزیں برابر کی نہ ہوں بلکہ ایک میں کوئی وجہ ترجیح کی ہو تو اُس کو ایک دوسرے پر حاکم اور دوسرے کو محکوم بنایا جاتا ہے، جیسے رعایا اور بادشاہ اور گاڑی کے مالک اور سائیس کی مثال گذری، بنا بریں جب کہ عورت و مرد دو صنف ہیں انسان کی اور ایک میں وجہ ترجیح کی موجود ہے اور وہ قوتِ عقلیہ و جسمانیہ کا زیادہ ہونا ہے تو عورت کو مرد کے برابر کرنا خلافِ فطرت ہوگا۔ (جامع وعظ)

حفاظت رہے، اس کا نام سختی نہیں ہے، بلکہ یہ تو عینِ عدل وحکمت وشفقت ہے۔
دیکھو! بچے ناقص العقل ہوتے ہیں، اب اگر ان کو خودسر بنادیا جائے اور وہ کسی کے تابع ہوکر نہ رہیں تو اس کا کیا انجام ہوگا؟ پس یہ حق تعالیٰ کی نہایت رحمت ہے کہ عورتوں کو خودسر نہیں بنایا، ورنہ ان کا کوئی کام بھی درست نہ ہوتا۔ دین اور دنیا سب کاموں میں ان سے غلطیاں ہوا کرتیں۔

بڑے کے اتباع میں چھوٹے کا نفع ہے:

خودسری میں بڑی مصیبت ہے، حق تعالیٰ خود فرماتے ہیں:

﴿وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ؕ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ﴾

(الحجرات: ۷)

یعنی خوب سمجھ لو اے مسلمانو! کہ تمہارے پاس اللہ کے رسول ﷺ موجود ہیں۔ اگر بہت سی باتوں میں یہ تمہارا کہنا مانتے تو تم بڑی مصیبت میں پڑ جاتے۔

مطلب یہ ہے کہ تم کو رسول اللہ ﷺ کا تابع ہوکر رہنا چاہیے، نہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ تمہارے تابع ہوں۔ اگر ایسا ہوتا کہ رسول اللہ ﷺ تمہارے تابع ہوتے تو تم مصیبت میں پڑ جاتے۔ معلوم ہوا کہ عافیت اور سلامتی اسی میں ہے کہ چھوٹا بڑے کا اور ناقص العقل کامل کا تابع ہوکر رہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ آیت میں یہ نہیں فرمایا: اگر حضور ﷺ تمہارے تابع ہوکر رہیں تو حضور ﷺ کو تکلیف پہنچے گی، بلکہ یہ فرمایا کہ خود تم مصیبت میں پڑ جاتے۔ معلوم ہوا کہ بڑے کا تابع ہوکر رہنے میں خود چھوٹے کا نفع ہے۔ اسی طرح اگر تم مردوں کے تابع رہو تو یہ تمہارے ہی واسطے سلامتی اور عافیت ہے۔

غرض اس کو بڑی رحمت سمجھو کہ حق تعالیٰ نے تم کو خودسر نہیں بنایا، ورنہ تمہارے لیے بڑی مصیبت ہوتی۔ کیوں کہ اول تو عورتوں میں سمجھ کم ہوتی ہے، دوسرے ان میں ضد کا مادہ بھی ہے کہ جس کام پر اڑ جائیں گی اس کو کر کے ہی چھوڑیں گی، تو اُن کو دو وجہ سے تکلیف پہنچتی ہے، ایک تو عقل کم ہونے سے کہ جو کام کرتیں بے سوچے سمجھے اور بلا غور وفکر کے کرتیں۔ پھر ضد کا مادہ ان میں اس قدر ہے کہ جو چڑھ گئی سو چڑھ گئی، گو معلوم بھی ہوجائے کہ یہ کام مضر ہے، مگر اس کو چھوڑ نہیں سکتیں۔ (چناں چہ دیکھا ہوگا کہ ذرا ذرا سی بات پر عورتیں کنوئیں میں کود پڑتی

ہیں۔اس حماقت کا منشا کم عقلی اور ضد ہی تو ہے)۔

عورتوں کی اصلاح خاوند سے بہ نسبت پیر کے زیادہ ہوسکتی ہے:

پس عورتوں کی سلامتی اسی میں ہے کہ ان کو تابع بنایا جائے،ان کے اوپر کوئی ایسا حاکم مسلّط رہے جوان کو ہر وقت سنبھالتا رہے۔جیسے پیر مرید کی اصلاح کیا کرتا ہے۔مگران کے لیے''بیعت'' کا پیر کافی نہیں، کیوں کہ وہ ہر وقت ان کے پاس کیسے رہ سکتا ہے؟ان کے لیے''بیت'' کا پیر چاہیے، یعنی گھر کا پیر جو گھر میں ہر وقت موجود رہے۔وہ کون ہے؟ وہی گھر والا یعنی خاوند۔یہ پیر اور قسم کے پیروں سے بہتر اور افضل اور ان کے لیے انفع ہے اور اسی کا رتبہ سب سے زیادہ ہے۔اور بعض عورتوں کے لیے بجائے بیت کے''بید'' کا پیر بہت نافع ہے،یعنی جو عورتیں مہذّب اور شائستہ،سمجھ دار ہیں ان کے لیے تو''بیت'' کا پیر کافی ہے،یعنی خاوند۔اور جو عورتیں غیر مہذب اور کم سمجھ اور بد تمیز ہیں ان کے واسطے''بید'' کا پیر ہونا چاہیے، جو آلۂ ضرب ہے۔رتبہ کے لفظ پر ایک کام کی بات یاد آ گئی۔

پیر کا رتبہ خاوند سے زیادہ نہیں:

عورتوں میں مشہور یہ ہے کہ پیر کا رتبہ خاوند اور باپ سے زیادہ ہے۔یہ محض غلط ہے، اس میں بہت سی غلطیاں ہیں۔

باپ کا رُتبہ پیر سے زیادہ ہے:

اسی طرح مردوں میں مشہور ہے کہ باپ کا رتبہ اتنا نہیں جتنا پیر کا رتبہ ہے۔اس پر ان کے پاس کوئی شرعی دلیل نہیں، محض قیاس ہے، جس کے مقدمات یہ ہیں: لغوی باپ سے تو جسمانی فیض ہوا ہے،اور پیر سے روحانی فیض ہوا ہے،اس کا رتبہ اس باپ سے زیادہ ہونا چاہیے جس سے جسمانی فیض ہوا ہو۔ان میں سے یہ مقدمہ تو مسلّم ہے کہ پیر روحانی باپ ہے، مگر یہ مقدمہ مسلّم نہیں کہ روحانی باپ کا رتبہ جسمانی باپ سے زیادہ ہے۔اس واسطے کہ شریعت میں باپ کے حقوق جو کچھ آئے ہیں ان کو سب جانتے ہیں اور یہ حقوق اسی کے ہیں جس کو عرفاً باپ کہا جاتا ہے۔پس بدوں حکم شرعی محض تخمینی مقدمات سے فضیلت کا حکم کرنا کیسے صحیح ہے؟

باپ اور پیر کے حقوق میں قولِ فیصل:

اصل بات صرف اتنی ہے جو باپ حقیقتاً باپ ہے وہ باعتبار دنیا کے باپ ہے اور پیر کو باعتبار دین کے باپ کہا جاتا ہے۔ پس حقیقی باپ کی طرف دنیا کے حقوق راجع ہوتے ہیں اور پیر کی طرف دین کے حقوق راجع ہوتے ہیں، ان میں خلط ملط کر دینے سے غلطی پیدا ہوتی ہے۔ اب فیصلہ یہ ہے کہ دنیاوی باتوں میں باپ کا حکم مقدم ہے اور دین کی باتوں میں پیر کا۔ اگر پیر دین کی کسی بات کا حکم کرے اور باپ اس سے منع کرے تو ترجیح پیر کے حکم کو ہوگی۔ مثلاً پیر کہتا ہے کہ اس وقت نماز فرض پڑھو اور باپ کہتا ہے کہ یہ وقت دنیا کے فلاں کام کا ہے، اس میں حرج ہوگا، اس وقت نماز مت پڑھو، تو پیر کا حکم مقدم ہوگا۔ اور درحقیقت اس کو پیر کا حکم کیوں کہا جاوے، یہ تو خدا کا حکم ہے، پیر تو صرف بتلانے والا ہے اور ہر شخص جانتا ہے کہ خدا کا حکم سب کے حکموں سے مقدم ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہ تقدیم ان ہی احکام میں ہوگی جو خدا تعالیٰ کا حکم ہے، یعنی مامور بہ ہے اور نوافل وغیرہ میں نہیں ہوگی، اس میں باپ کی اطاعت پیر سے مقدم ہے، کیوں کہ نوافل من جانب اللہ مامور بہ نہیں محض مرغوب فیہ ہیں۔ اور اگر پیر یہ کہتا ہے کہ فلاں جگہ شادی کرلو اور باپ کہتا ہے کہ وہاں شادی مت کرو، تو اس صورت میں باپ کا حکم مقدم ہوگا۔

خوب سمجھ لو، گڑبڑ مت کرو، ہر چیز کو اس کے درجہ میں رکھو اور افراط تفریط نہ کرو۔ پیر کا رتبہ ہر بات میں باپ[1] سے زیادہ نہیں۔ بہت سے مرد بھی اسی غلطی میں مبتلا ہیں کہ پیر کا رتبہ مطلقاً باپ سے زیادہ سمجھتے ہیں، حالاں کہ اس میں وہی تفصیل ہے جو میں نے عرض کی۔ اور عورتیں تو اس غلطی میں مبتلا ہیں ہی کہ پیر کا رتبہ خاوند اور باپ دونوں سے زیادہ سمجھتی ہیں اور اس میں عورتوں کا تو قصور ہے ہی کہ وہ جاہل ہیں، مگر زیادہ قصور آج کل کے پیروں کا ہے کہ ان کی تعلیم ہی یہ ہے کہ پیر کا حکم مطلقاً سب سے مقدم ہے۔

---

[1] راقم کہتا ہے کہ موٹی بات ہے کہ پیر کا رُتبہ باپ سے کتنا ہی زیادہ سمجھا جاوے مگر وہ لوگ بھی جو اس غلطی میں مُبتلا ہیں اس کے قائل نہیں کہ میراث میں بھی باپ سے پیر مقدم ہے، کہ اگر کوئی مرجاوے اور باپ و پیر کو چھوڑ جاوے تو ترکہ بجائے باپ کے پیر کو دے دیں یا کچھ بھی اس کا حصّہ قرار دیں۔ (جامع وعظ)

آج کل کے پیروں نے دین کا ناس کر دیا ہے:

آج کل کے پیروں نے دین کا ناس کر دیا ہے۔ پیر ہو تو ایسا ہو جیسے ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ حضرت نے میرے واسطے میری حاضریٔ مکۂ مکرمہ کے وقت یہ تجویز فرمایا تھا کہ ہمارے پاس چھ مہینے رہو۔ اس وقت والد صاحب بھی حج کو تشریف لے گئے تھے۔ میں نے ان سے اجازت چاہی تو والد صاحب نے فرمایا: میرا جی گوارا نہیں کرتا کہ مجھے مفارقت سے رنج ہوتا ہے۔ میں نے حضرت سے عرض کیا کہ والد صاحب یوں فرماتے ہیں۔ فرمایا کہ باپ کا حکم مقدم ہے، باپ کی اطاعت فرض ہے، تم اب تو جاؤ، ان شاء اللہ تعالیٰ پھر کبھی آ ؤ گے۔

اللہ کا شکر ہے کہ ایسا ہی ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے زندگی بھی اتنی دی کہ دوبارہ جانے کی توفیق ہوئی اور روپیہ بھی دیا کہ چھ مہینے کامل حضرت کی خدمت میں رہنا نصیب ہوگیا۔ واقعی شیخ ہو تو ایسا ہو، کوئی دوسرا شیخ ہوتا تو اسی وقت خفا ہوجاتا اور کہتا: بس میاں! جاؤ، گھر بیٹھو۔ جب باپ نہیں چھوڑتا اور تم باپ کو نہیں چھوڑتے تو پیری مریدی کا نام کیوں لیتے ہو۔ جاؤ! باپ ہی کے پاس رہو۔ مگر ہمارے حضرت شریعت کے پابند تھے، سنت کے پابند تھے، آپ نے شریعت کا لحاظ مقدم رکھا، اطاعتِ والدین کو ضروری سمجھا۔ اس اتباعِ سنت کی یہ برکت ہوئی کہ دونوں دولتیں نصیب ہوئیں، یعنی والد صاحب کی اطاعت بھی نصیب ہوئی اور حضرت کی خدمت میں رہنا بھی ہوگیا۔

خاوند کے برابر پیر کا حق نہیں:

اسی طرح خوب سمجھ لو کہ خاوند کے برابر پیر کا حق نہیں ہے۔

پیر کے یہاں بلا اجازتِ خاوند کے جانا:

اب عورتوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ خاوند سے اجازت لینے کی بھی ضرورت نہیں سمجھتیں، جب جی چاہا پیر صاحب کے یہاں چل دیں۔ اور بعض تو یہ غضب کرتی ہیں کہ پیر سے پردہ بھی نہیں کرتیں اور خاوند کو چھوڑ کر پیر صاحب کے یہاں پڑی رہتی ہیں، وہیں رہنا اختیار کر لیا ہے اور پیر صاحب اس پر فخر کرتے ہیں کہ اتنی عورتیں ہماری مسخر ہیں۔ بے شک وہ

تو مسخر ہوگئی ہیں، مگر تم منسوخ ہو گئے ہو۔

افسوس ایک طوفانِ بے تمیزی پھیلا ہوا ہے۔ آج کل کے پیروں کو خاوند کے حقوق کی پروا نہیں، نہ بال بچوں کی، نہ اعزّا کی، بس اس کا نام فقیری رکھ لیا ہے کہ تمام اہلِ حقوق کے حقوق ضائع کر کے پیر صاحب کے حقوق ادا کیے جائیں۔ یہ سب باتیں اللہ ورسول ﷺ کے خلاف ہیں۔ یادرکھو! جو شریعت کے خلاف کرے گا وہ پیر نہیں ہوسکتا۔ پیر تو رسول اللہ ﷺ کا نائب ہوتا ہے کہ جو تعلیم رسول اللہ ﷺ نے دی ہے اس کو بصیرت اور تجربہ کے ساتھ مریدوں تک پہنچاتا ہے۔ تو جو شخص منیب کے خلاف عمل و تعلیم کرتا ہے تو اس کو منیب کا نائب کہنا کہاں درست وجائز ہے؟ یہ عجیب بات ہے کہ ہیں تو رسول اللہ ﷺ کے نائب اور کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ کے خلاف۔

بعضے پیر پردہ نہیں کرنے دیتے:

بمبئی میں سنا ہے کہ ایک پیر ایسے تھے جو عورتوں کو زبردستی اپنے سامنے بلاتے تھے اور کہتے تھے: دیکھو جی! تم ہم سے اس لیے مرید ہوئی ہو تا کہ قیامت میں تم کو بخشوائیں، سو جب ہم تمھیں دیکھیں گے نہیں تو ہم قیامت میں کیسے پہچانیں گے اور کیسے بخشوائیں گے؟

ایک شخص نے اُس کے جواب میں خوب کہا کہ قیامت میں تو ننگے اٹھیں گے اور تم نے یہاں اپنی مریدنیوں کو کپڑا پہنے دیکھا ہے تو وہاں ننگیوں کو کیسے پہچانو گے؟ لہٰذا ان کو بالکل ننگا کر کے دیکھنا چاہیے۔ بس پیر صاحب کو اس کا جواب کچھ نہ آیا اور اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

ایک پیر کا قصّہ:

ایک پیر صاحب کی حکایت سنی ہے کہ انھوں اپنے ایک مرید سے رخصت کے وقت کہا کہ چندروز کے لیے اپنی بیوی کو یہاں چھوڑ جاؤ۔ وہ غیرت مند آدمی تھا۔ اس نے کہا کہ حضرت! یہ تو نہیں ہوسکتا۔ بس پیر صاحب اس پر ناراض ہوگئے۔

کانپور کے ایک پیر صاحب کا قصّہ:

کانپور میں ایک پیر اپنے مرید کے یہاں آئے، اس نے ان کو باہر مردانہ مکان

میں ٹھہرادیا تو وہ خفا ہوگئے کہ ہم کو زنانہ مکان میں کیوں نہ ٹھہرایا؟ آج کل کے پیروں کے یہاں یہ آفت ہے کہ خود عورتوں کو پردہ نہ کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ صاحبو! یہ پیری مریدی ہے یا رہزنی اور ڈاکہ ہے۔ پیر تو خدا کا مقرب بنانے کے لیے ہوتا ہے۔ مگر ان کی حرکتیں خدا سے دور کرنے والی ہیں۔ یہ پیر خود خدا سے دور ہیں، دوسرے کو کیا مقرب بنائیں گے؟

بیبیو! خوب سمجھ لو کہ دین کے کاموں اور احکامِ شرعیہ کے سوا باقی سب کاموں میں خاوند کا حق پیر سے زیادہ ہے۔ یعنی خاوند اگر ایک کام کا حکم کرے اور پیر اس کو اس لیے منع کرے کہ وہ شریعت کے خلاف ہے تو اس صورت میں خاوند کا حکم نہ مانا جاوے گا، بلکہ پیر کے حکم کو مانا جاوے گا، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ شریعت کے حکم کو مانا جاوے گا۔ اور شریعت اللہ ورسول ﷺ کے حکم کو کہتے ہیں، تو یوں کہو کہ اللہ ورسول ﷺ کے سامنے خاوند کا حکم نہ مانا جاوے گا اور اس میں پیر والی عورت اور بے پیری سب برابر ہیں۔ اگر کوئی عورت بے پیری بھی ہو تب بھی اس کو وہی کرنا چاہیے جو اللہ ورسول ﷺ کا حکم ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ ورسول ﷺ کا حق تو بے شک خاوند کے حق سے زیادہ ہے، باقی اور کسی کا حق خاوند سے زیادہ نہیں، مگر چوں کہ اللہ ورسول ﷺ کا حکم عوام کو خود نہیں معلوم ہوسکتا بلکہ عُلَما ومشائخ کے واسطہ سے معلوم ہوتا ہے، تو مجازاً کہہ سکتے ہیں کہ احکامِ شرعیہ اور دین کی باتوں میں پیر کا حق خاوند سے زیادہ ہے۔ اور اگر خاوند کا حکم دِین کے خلاف نہ ہو تو اب اس کے مقابلہ میں کسی کے حکم کو بھی ترجیح نہ ہوگی، تو خاوند کا حکم سب سے زیادہ ہوا، اس لیے میں نے کہہ دیا تھا کہ ان کے لیے بجائے ''بیعت'' کے پیر کی ''بیت'' کا پیر سب سے افضل ہے۔ اور یہ ''بیت'' کا پیر کیسا اچھا پیر ہے کہ دین کی درستی بھی کرتا ہے اور کھانے پہننے کو بھی دیتا ہے۔ دین کا بھی متکفل ہے، دنیا کا بھی۔ ''بیعت'' کے پیر میں یہ بات کہاں؟ دنیا کا نفع تو ان سے کچھ ہے ہی نہیں، بلکہ ان کو اور گھر سے نذرانے دینے پڑتے ہیں اور دین کا نفع بھی اتنا نہیں ہوسکتا جتنا خاوند سے ہوسکتا ہے۔ کیوں کہ پیر صاحب سے اتنا ہی ہوسکتا ہے کہ جب کبھی اُن سے پوچھا جاوے تو بتادیں گے یا کبھی اُن کے پاس جانا ہو تو کچھ اصلاح ہوجاوے۔ سواس کی نوبت کہیں برسوں میں آتی ہے خصوص عورتوں کے لیے، اور خاوند تو ہر وقت پاس موجود ہے، وہ

بات بات کی نگرانی کرسکتا ہے۔

پس عورتوں کا یہ خیال غلط ہے کہ پیر کا حق خاوند سے زیادہ ہے، بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ پیر سے ماں باپ کا حق بھی زیادہ ہے، کیوں کہ انھوں نے تم کو بڑی محنت مشقت سے پالا ہے اور محض محبّت سے پالا ہے، کسی عوض کی امید پر نہیں پالا۔ اپنی جان کی پروا نہیں کی، اپنے آرام پر بچہ کے آرام کو ترجیح دی۔ یہ بات پیر صاحب میں کہاں ہے؟ وہ تو ذرا ذرا سی بات پر خفا ہوجاتے ہیں، پھر نذرانہ کے بغیر مانتے ہی نہیں۔ ہاں وہ قید ''دین'' کی ضرور یاد رکھیے کہ ماں باپ کا حق دین کی باتوں میں پیر سے زیادہ نہیں۔ یعنی اگر ماں باپ کسی دین کی بات کے خلاف حکم کریں اور پیر کا حکم شریعت کے موافق ہو، اس صورت میں ترجیح پیر کے حکم کو ہوگی۔ اور اس کی حقیقت وہی ہے کہ پیر کا یہ حکم دراصل خدا ورسول ﷺ کا حکم ہے اور خدا ورسول ﷺ کے حکم کو خاوند اور ماں باپ سب کے حکم پر ترجیح ہے۔ ہاں دین کی باتوں کے علاوہ دیگر امور میں پیر کے حکم پر ماں باپ کے حکم اور خاوند کے حکم کو ترجیح ہے۔

دیکھو! میری اس تقریر کو خوب سمجھ لینا، اس میں غلطی نہ کرنا۔ بہت لوگ یہ احکام عورتوں کے کانوں تک اس لیے نہیں پہنچنے دیتے کہ اس سے پیروں کی وقعت ان کے ذہن سے کم ہوجاوے گی۔ مگر مجھے اس کی پروا نہیں، مسلمان کا دین درست ہونا چاہیے، ان کے دل میں اللہ ورسول ﷺ کی وقعت وعظمت ہونا چاہیے، خواہ کسی اور کی ہو یا نہ ہو۔ اس تقریر کو سن کر پیر صاحبان ضرور خفا ہوں گے اور دل میں کہیں گے کہ لو! ہمارا زور گھٹا دیا، ہم تو پیر تھے ہی، اس نے خاوند کو پیر بنادیا بلکہ ہم سے بھی بڑا پیر بنادیا اور ماں باپ کو بھی ہم سے بڑھا دیا۔ میں کہتا ہوں کہ جب خدا نے ہی ان کو بڑھایا ہے تو کسی کا کیا اختیار ہے کہ ان کو گھٹا دے۔ بہر حال میں یہ کہہ رہا تھا کہ حق تعالیٰ نے جو عورتوں کو محکوم اور خاوند کو حاکم بنایا ہے اس کو سختی اور ظلم نہ سمجھنا چاہیے بلکہ عورتوں کے حق میں یہ عین رحمت وحکمت ہے، کیوں کہ تابع ہونے میں بڑی راحت ہے اور مساوات میں کبھی نظام اور تمدن قائم نہیں ہوسکتا، ہمیشہ جھگڑا اور فساد ہی ہوتا ہے۔

خوب یاد رکھو کہ دنیا اور دِین دونوں کا نظام اسی طرح قائم رہ سکتا ہے کہ ایک تابع ہو ایک متبوع ہو۔ لوگ آج کل اتفاق واتحاد کے لیے بڑی لمبی لمبی تقریریں کرتے ہیں اور

تجویزیں پاس کرتے ہیں، مگر جڑ کو نہیں دیکھتے۔ یادرکھو! اتفاق واتحاد کی جڑ یہ ہے کہ ایک کو بڑا مان لیا جاوے اور سب اُس کے تابع ہوں۔ جس جماعت میں متبوع اور تابع کوئی نہ ہو، سب مساوات ہی کے مدعی ہوں، اُن میں کبھی اتحاد نہیں ہوسکتا۔ جب یہ بات سمجھ میں آ گئی تو مساوات کا خیال تو عورتوں کو اپنے دل سے نکال دینا چاہیے، کیوں کہ یہی فساد کی جڑ ہے۔ اب دو ہی صورتیں ہیں: یا تو عورتیں متبوع ہوں اور مرد تابع، یا مرد متبوع اور عورتیں تابع۔ اس کا فیصلہ انصاف کے ساتھ خود عورتوں کو ہی اپنے دل سے کر لینا چاہیے کہ متبوع بننے کے قابل وہ ہیں یا مرد ہیں۔ سلیم الفطرت عورتیں کبھی اس کا انکار نہیں کر سکتیں کہ عقل میں اور طاقت میں مرد ہی بڑھے ہوئے ہیں۔ وہی عورتوں کی حفاظت وحمایت کر سکتے ہیں۔ عورتیں مردوں کی ہرگز حفاظت نہیں کر سکتیں۔ پس مردوں کو ہی متبوع اور عورتوں کو تابع ہونا چاہیے، یہی شریعت کا فیصلہ ہے اور اسی لیے اس جگہ بھی مردوں کا ذکر عورتوں سے مقدم کیا گیا۔ چناں چہ فرماتے ہیں: ﴿مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثٰى﴾ اور یہ کیا تھوڑی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مردوں کے ساتھ ہی عورتوں کا ذکر فرمایا؟ آگے پیچھے کا فرق تو بہت تھوڑا فرق ہے۔

غرض حق تعالیٰ نے اس آیت میں عورتوں کی اس قدر ہمت بڑھائی ہے کہ سرسری نظر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی مردوں کے برابر ہیں۔ گو میں نے دوسری آیتوں کی وجہ سے اصل مسئلہ کی تحقیق بیان کر دی کہ فی الجملہ دونوں کے رتبہ میں فرق ہے، ورنہ اس آیت سے تو مساوات کا بھی شبہ ہوسکتا ہے، گو تقدیم وتاخیر پر نظر کر کے مساوات کے استدلال کو رد کیا جا سکتا ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہمارے یہاں مرد وعورت دونوں اس قانون میں برابر ہیں کہ ہم کسی کا عمل ضائع نہ کریں گے۔ پھر آگے ﴿بَعْضُكُمْ مِنْ بَعْضٍ﴾ میں اس کی اور بھی تائید فرمادی یعنی تم سب ایک دوسرے کے جزو ہو۔ یہ جملہ بمنزلہ تعلیل کے ہے ماقبل کے لیے کہ مرد وعورت اس قانون میں برابر کیوں نہ ہوں، یہ تو آپس میں سب ایک ہی ہیں، ایک ہی نوع کے دونوں افراد ہیں، خلقت میں بھی برابر ہیں، کیوں کہ مردوں کی خلقت عورتوں پر موقوف ہے اور عورتوں کی خلقت مردوں پر، وہ ان کے لیے سبب ہیں اور یہ ان کے لیے۔

اس مقام پر میں ایک علمی اشکال کو رفع کر دینا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ قرآن مجید میں بعض

آیتیں اس قسم کی بھی ہیں جن سے سرسری نظر میں مردوں اور عورتوں کی مساوات ثابت ہوتی ہے: ﴿وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ؕ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ﴾(النساء: ۲۵)، جس کا حاصل یہ ہے کہ اوپر محرمات کا بیان تھا، اس کے بعد بیان فرمایا کہ اِن کے سوا جن عورتوں سے چاہو نکاح کر سکتے ہو، ہاں مہر دینا ہوگا۔ اور جن کو آزاد عورتیں میسّر نہ ہوں بوجہ ان کے اخراجات زیادہ ہونے کے، تو ان کو چاہیے کہ مسلمان لونڈیوں سے نکاح کرلیں۔ اور ﴿وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ؕ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ﴾ تمہارے ایمان کا پورا علم تو اللہ تعالیٰ کو ہی ہے (لیکن ظاہری ایمان کے اعتبار سے) تم سب ایک دوسرے سے بنے ہو۔

غرض یہاں بھی وہی لفظ ہے: ﴿بَعْضُكُمْ مِنْ بَعْضٍ﴾ یعنی تم سب ایک ہی ہو، مگر یہ آیت اپنے سیاق سے مساوات میں بظاہر اس سے زیادہ صاف ہے۔ پہلی آیت میں تو (جس کا بیان ہو رہا ہے یعنی ﴿فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ﴾) ﴿بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ﴾ کے ساتھ اس کا بھی بیان ہے کہ مساوات اس بات میں ہے کہ کسی کا عمل ضائع نہ کیا جاوے گا چاہے مرد ہو یا عورت، عدمِ اضاعتِ عمل میں سب مساوی ہیں۔ مگر اس آیت میں بظاہر کوئی بھی قید نہیں کہ کس بات میں مساوات ہے بس مطلقاً فرمادیا: ﴿بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ﴾ پھر مساوات بھی ایسی عام کہ لونڈی باندی کو آزاد مسلمانوں کے ساتھ۔

غرض اس آیت سے بھی بظاہر عدمِ تفاوت ثابت ہوتا ہے، گو جوازِ نکاح میں بعض ائمہ کے قول پر من کل الوجوہ مساوات نہ ہو۔ کیوں کہ آیت میں یہ قید لگی ہوئی ہے کہ جس کو آزاد عورتوں کی مقدرت نہ ہو وہ باندیوں سے نکاح کرے۔ معلوم ہوا کہ آزاد عورت اور باندی برابر نہیں۔ سو یہ تفاوت ایک امرِ خاص میں ہے۔ یہ اس مساوات میں حارج نہیں جس کو میں ثابت کرنا چاہتا ہوں، کیوں کہ خاص خاص صفات میں تو مردوں میں بھی تفاوت ہوسکتا ہے۔ مثلاً بڑے چھوٹے میں یا امیر غریب میں، باپ بیٹے میں، عالم جاہل میں وغیرہ وغیرہ۔ سو اس قسم کا تفاوت قابلِ اعتبار نہیں۔ آخر ﴿بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ﴾ کے کچھ تو معنی ہیں۔

ایک اور آیت مُثبِتِ مساوات:

ایک آیت اور یاد آئی: ﴿وَ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ (البقرة: ۲۲۸) یعنی عورتوں کے حقوق بھی ویسے ہی ہیں جیسے اُن کے ذمہ مردوں کے حقوق ہیں۔ یہ وہ آیات ہیں جن سے عورتوں کی مساوات مردوں سے مفہوم ہوسکتی ہے، مگر اس کے ساتھ دوسری آیتوں کو بھی ملانا چاہیے جن میں مردوں کی فوقیت عورتوں پر ثابت ہوتی ہے۔ چناں چہ ارشاد ہے:

﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ (النساء: ٣٤)

نیز ارشاد ہے:

﴿وَ لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ﴾ (البقرة: ۲۲۸)

اور یہ آیات مردوں کی فوقیت اور فضیلت ثابت کرنے میں بالکل صریح ہیں۔ اور جن آیات سے مساوات ثابت ہوتی ہے وہ اس مدلول میں صریح نہیں، بلکہ قرائن مقامیہ سے خاص امور میں مساوات بتلاتی ہیں۔ چناں چہ ﴿اَنِّیْ لَاۤ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ﴾ (آل عمران: ۹۵) میں عدمِ اضاعتِ عمل میں مساوات بتلائی گئی اور ﴿وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ﴾ (النساء: ۲۵) میں انسانیت اور آدمیت یا ایمان میں مساوات بتلائی گئی ہے کہ باندی کو حقیر نہ سمجھو، تم سب آدم وحوا کی اولاد ہو یا سب اہلِ ایمان ہو اور ﴿وَ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ (البقرة: ۲۲۸) کا مطلب یہ ہے کہ عورتوں کے حقوق بھی لزوم ووجوب میں مردوں کے حقوق کے برابر ہیں، گو باعتبار نوعیت کے دونوں کے حقوق میں تفاوت ہو، ورنہ مساواتِ کلی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ عورتوں پر بھی مردوں کے لیے مہر اور نان نفقہ لازم ہو حالاں کہ کوئی اس کا قائل نہیں۔ باقی اس سے انکار نہیں کہ بعض حقوق اور بعض امور میں یعنی حقوقِ مشترکہ میں عورتیں مردوں کے برابر ہیں، ایسی گھٹیا نہیں ہیں جیسا مردوں نے انہیں سمجھ رکھا ہے۔ مگر افسوس! آج کل ہم عام طور سے یہ شکایت سنتے ہیں کہ غریب عورتیں کہتی ہیں کہ مردوں کے تو کیا کچھ حقوق ہمارے اوپر

ہیں اور ہم بالکل جانوروں کی طرح ان کے ہاتھ میں ہیں کہ وہ ماریں پیٹیں یا ذبح کریں، ہم کچھ نہیں بول سکتیں۔

پس سن لو کہ اللہ سبحانہ کیا فرمارہے ہیں اور مرد بھی سن لیں، ذرا کان کھول لیں کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جیسے ان کے اوپر مردوں کے حقوق ہیں ویسے ہی ان کے حقوق بھی مردوں پر ہیں، یہ کہنے کی گنجایش کہاں رہی کہ ہم جانوروں کی طرح ہیں۔ اس شکایت کی اصل وجہ یہ ہے کہ مردوں نے ان کے کان میں اتنا ہی ڈالا ہے کہ ہمارے حقوق تمہارے اوپر اس قدر ہیں اور یہ بات بالکل ان کے کان تک نہیں پہنچائی کہ تمہارے بھی کچھ حقوق ہمارے اوپر ہیں۔ اور عام مرد تو ایسی بات ان کے کان تک کیوں ہی پہنچنے دیتے، کیوں کہ اپنے خلاف ہے۔ مگر غضب تو یہ ہے کہ واعظ صاحبان نے بھی کبھی اس مضمون کو بیان نہیں کیا، جب بیان کیا تو یہی کہ عورتیں ایسی بُری ہیں، ان میں یہ عیب ہے اور وہ عیب ہے۔ عورتیں تو سرتاپا عیب ہی عیب ہیں، گویا دوزخ ہی کے لیے پیدا ہوئی ہیں۔ اس سے بے چاری عورتیں یہ سمجھ گئیں کہ ہم ایسی بری ہیں اور سرتاپا عیب ہیں، تو ہمارے حقوق مردوں کے ذمے کیا ہوتے؟ بس یہی بہت ہے کہ ہم کو نان ونفقہ دے دیا جائے۔

صاحبو! جب اللہ تعالیٰ نے ان کے حقوق مقرر فرمائے ہیں تو ان کو کون بدل سکتا ہے؟ مرد اگر ان کا حق نہ دیں گے تو حق العبد کے گناہ گار ہوں گے۔ جو آیتیں میں نے پڑھیں دیکھ لیجیے کس قدر صاف ہیں اس باب میں۔

اور ان سے کس قدر حقوق عورتوں کے ثابت ہوتے ہیں، صرف نان نفقہ ہی عورت کا حق نہیں ہے، بلکہ یہ بھی حق ہے کہ اس کی دل جوئی کی جائے۔

حدیث میں ہے:

اِسْتَوْصُوْا[1] بِالنِّسَاءِ خَيْرًا فَإِنَّمَا هُنَّ عَوَانٌ عِنْدَكُمْ.

---

[1] پوری حدیث یہ ہے: ألا واستوصوا بالنساء خيرا، فإنما هن عوان عندكم، ليس تملكون منهن شيئا غير ذلك إلا أن يأتين بفاحشة مبينة، فإن فعلن فاهجروهن في المضاجع واضربوهن ضربا غير مبرح، فإن أطعنكم فلا تبغوا عليهن سبيلا، ألا إن لكم على نسائكم=

یعنی عورتوں سے اچھا برتاؤ کرو، کیوں کہ وہ تمہارے پاس مثل قیدی کے ہیں۔

اور جو شخص کسی کے ہاتھ میں قید ہو، ہر طرح اس کے بس میں ہو اس پر سختی کرنا جواں مردی کے خلاف ہے۔

دل جوئی کے معنی یہ ہیں کہ کوئی بات ایسی نہ کرو جس سے اس کا دل دکھے، دل کو تکلیف ہو۔ بیبیو! اس سے زیادہ اور وسعت کیا چاہتی ہو؟ نان نفقہ وغیرہ ضابطہ کے حقوق تو سب جانتے ہیں اور وہ محدود حقوق ہیں، لیکن دل جوئی ایسا مفہوم ہے کہ اس کی تحدید نہیں ہوسکتی کہ جس بات سے عورتوں کو اذیت ہو وہ مت کرو، بھلا اس کی تحدید کیسے ہوسکتی ہے؟ اب کہا جاسکتا ہے کہ عورت کے حقوق غیر محدود ہیں۔

اس حدیث میں ایک اور نکتہ پر متنبہ کرتا ہوں کہ لفظِ عَـــــوَانٌ سے پردہ بھی ثابت ہوتا ہے، کیوں کہ مقید ہوکر رہنے ہی کا نام تو پردہ ہے۔ نیز پردہ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ پردہ کا منشا حیا ہے اور حیا عورت کے لیے امرِ طبعی ہے۔ اور امرِ طبعی کے خلاف پر کسی کو مجبور کرنا باعثِ اذیت ہے اور اذیت پہنچانا دل جوئی کے خلاف ہے۔

پس عورتوں کو پردہ میں رکھنا ان پر ظلم نہیں ہے، بلکہ حقیقت میں دل جوئی ہے۔ اگر کوئی عورت اس کو بجائے دل جوئی کے ظلم سمجھے تو وہ عورت نہیں۔ اس سے اس وقت کلام نہیں۔ یہاں ان عورتوں سے بحث ہے جن میں عورتوں کی فطری حیا موجود ہو، بے حیاؤں کا ذکر نہیں۔ افسوس!

=حقا ولنسائكم عليكم حقا، لحقكم عليهن أن لا يوطئنّ فرشكم من تكرهون، ألا وحقهن عليكم أن تحسنوا إليهن في كسوتهن وطعامهن.

سن لو! میری نصیحت عورتوں کے ساتھ بھلائی کرنے کے متعلق قبول کرو، کیوں کہ سوا اس کے کچھ نہیں کہ وہ تمھارے پاس قید ہیں، اس سے زیادہ کچھ اختیار تم کو ان پر نہیں ہے۔ لیکن وہ اگر کوئی نامناسب کام کریں تو ان کو الگ سلاؤ اور (اگر یہ کافی نہ ہو تو) ان کو مارو مگر سخت مار نہ ہو۔ پھر اگر وہ مطیع ہو جاویں تو ان کو کچھ نہ کہو۔ سُن لو کہ کچھ تمھارے حق عورتوں پر ہیں اور کچھ حقوق عورتوں کے تم پر ہیں۔ تمھارے حقوق عورتوں پر یہ ہیں کہ تمھارے فرش پر کسی ایسے شخص کو نہ بٹھلادیں جس کو تم ناگوار سمجھتے ہو، یعنی گھر میں بلا اجازت کسی کو آنے نہ دیں۔ سن لو! ان کا حق تمھارے اوپر یہ (بھی) ہے کہ ان کو اچھی طرح کھانے پہننے کو دو۔ (کاتب)

ہم ایسے زمانہ میں ہیں جس میں فطری امور کو بھی دلائل سے ثابت کرنا پڑتا ہے۔ صاحبو! پردہ اول تو عورت کے لیے فطری امر ہے۔ دوسرے مصالح عقلیہ بھی اسی کے مقتضی ہیں کہ عورتوں کو پردہ میں رکھا جائے، مگر آج کل بعض ناعاقبت اندیش پردہ کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔

پردہ کا عقلی اور نقلی ثبوت:

میں بقسم کہتا ہوں کہ پردہ کے توڑنے میں قطعِ نظر خلافِ شرع اور گناہ ہونے کے اتنی خرابیاں ہیں کہ آج جو عُقلا پردہ کی مخالفت کرتے اور پردہ اٹھا دینے کی کوشش کرتے ہیں، ان خرابیوں کو دیکھ کر بعد میں خود ہی یہ تجویز کریں گے کہ پردہ ضرور ہونا چاہیے، مگر اُس وقت بات قابو سے نکل چکی ہوگی۔ اب تو بنی بنائی بات ہے، اس کو نہیں بگاڑنا چاہیے، پھر پچھتائیں گے اور کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔

آج کل ایسا مذاق بگڑ گیا ہے کہ کوئی پردہ کو خلافِ فطرت کہتا ہے، کوئی قید اور حبسِ بے جا کہتا ہے۔ ایک مسلمان انجینئر تھے، ان سے ایک پادری انجینئر نے کہا کہ مسلمانوں کا مذہب بہت اچھا ہے، اس میں سب خوبیاں ہیں، سوا اس کے کہ عورتوں کو قید میں رکھا جاتا ہے۔ مسلمان انجینئر نے کہا: کہاں؟ ہم نے تو کسی مسلمان عورت کو قید میں نہیں دیکھا۔ کہا: وہی قید جس کا نام تم نے پردہ رکھا ہے۔ قید کے لفظ پر یاد آیا کہ ایک انگریز نے بہاول پور میں شاہی محلات کی سیر کی، تو یہ داد دی کہ ہاں مکانات تو بہت اچھے ہیں، مگر مہذّب جیل خانے ہیں (خیر معذّب جیل خانے تو نہیں ہیں)۔

تو ان مسلمان انجینئر صاحب نے پادری سے کہا کہ پہلے آپ یہ بتلائیے کہ قید کس کو کہتے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ قید حبس خلافِ طبع کو کہتے ہیں اور جو حبس خلافِ طبع نہ ہو اس کو قید ہرگز نہ کہیں گے، ورنہ پاخانہ میں جو آدمی پردہ کر کے بیٹھتا ہے اس کو بھی قید کہنا چاہیے، کیوں کہ پاخانہ میں آدمی تمام آدمیوں کی نگاہوں سے چھپ جاتا ہے، سب سے الگ ہو جاتا ہے۔ مگر اس کو کوئی قید نہیں کہتا کہ آج ہم اتنی دیر قید میں رہے۔ اور فرض کرو! اگر اسی پاخانہ میں کسی شخص کو بلا ضرورت بند کر دیا جاوے کہ باہر سے زنجیر لگا دیں اور ایک پہرہ دار کھڑا کر دیا جائے اور اس میں کہہ دیا جاوے کہ خبر دار! یہ آدمی یہاں سے نکلنے نہ پائے، تو اس صورت

میں بے شک یہ حبس خلافِ طبع ہوگا اور اس کو ضرور قید کہیں گے۔ اور اس صورت میں بند کرنے والے پر حبسِ بے جا کا مقدمہ قائم ہوسکتا ہے۔

بتائیے! ان دونوں صورتوں میں فرق کیا ہے؟ فرق صرف یہ ہے کہ پہلی صورت میں حبس خلافِ طبع نہیں اور دوسری میں خلافِ طبع ہے۔ پس ثابت ہوا کہ مطلق حبس کو قید نہیں کہہ سکتے، بلکہ حبسِ خلافِ طبع کو کہتے ہیں۔ پس آپ کو پہلے یہ تحقیق کرنے کی ضرورت ہے کہ مسلمان عورتیں جو پردہ میں رہتی ہیں وہ ان کی طبیعت کے موافق ہے یا خلاف؟ اس کے بعد یہ کہنے کا حق تھا کہ پردہ قید ہے یا نہیں۔

مسلمان عورت کے لیے پردہ قید نہیں ہے:

میں آپ کو مطلع کرتا ہوں کہ پردہ مسلمان عورتوں کے خلافِ طبع نہیں ہے، کیوں کہ مسلمان عورت کے لیے حیا امرِ طبعی ہے، لہٰذا پردہ حبس موافقِ طبع ہوا اور اس کو قید کہنا غلط ہے۔ ان کی حیا کا مقتضیٰ یہی ہے کہ پردہ میں مستور رہیں، بلکہ اگر ان کو باہر پھرنے پر مجبور کیا جاوے، یہ خلاف طبع ہوگا اور اس کو قید کہنا چاہیے۔ غرض عَـــــــوَانٌ کے لفظ سے پردہ ثابت ہوتا ہے۔

عورتوں کو پردہ میں آرام پہنچانا:

مگر نہ ایسا پردہ جو قید کا مصداق ہو، یعنی پردہ تو ضرور ہو مگر پردہ میں اس کی دل جوئی کے سامان بھی مہیّا ہوں۔ یہ نہیں کہ میاں صاحب نماز کو جاویں تو باہر تالا لگا کر جائیں، کسی سے اس کو ملنے نہ دیں، نہ اس کی دُسراہٹ کا سامان کریں۔ بلکہ مردوں کو لازم ہے کہ پردہ میں عورتوں کی دلچسپی کا ایسا سامان مہیّا کریں کہ ان کو باہر نکلنے کی ہوس ہی نہ ہو۔ سمجھنے کی بات ہے کہ اگر مردوں کو کسی وقت وحشت ہوتی ہے تو باہر جا کر ہم جنسوں میں دل بہلا سکتے ہیں، بے چاری عورتیں پردہ میں اکیلی کس طرح دل بہلائیں؟ تم کو چاہیے کہ یا خود اس کے پاس بیٹھو یا تم کو فرصت نہیں ہے تو اس کی کسی ہم جنس عورت کو اس کے پاس رکھو۔

اگر کسی وقت کسی بات پر شکوہ شکایت بھی کرے تو معمولی بات پر برامت مانو، تمہارے

سو اس کا کون ہے جس سے وہ شکایت کرنے جائے؟ اس کی شکایت کو ناز محبّت پر محمول کرو۔

عورت کو خاوند کا عشق ہوتا ہے:

کیوں کہ ہماری عورتوں میں محبّت کا مادہ اس قدر ہے کہ سچ مچ عشق کا مرتبہ ہے۔ کانپور میں دیکھا گیا ہے کہ بعض عورتوں نے خاوند کے ظلم اور مار پٹائی سے تنگ آکر قاضی جی کے یہاں جاکر طلاق لینے کی درخواست کی۔ قاضی جی نے کوشش کرکے طلاق دلوادی۔ ساری عمر کی مصیبتوں اور مار پٹائی کی وجہ سے طلاق لے تو لی، مگر طلاق کے وقت زار زار روتی تھیں اور یہ حالت تھی کہ ابھی مر جائیں گی یا زمین پھٹ جائے تو اس میں سما جائیں گی۔ عورتوں کی یہ بات بہت قابلِ قدر ہے کہ ان کو خاوند سے عشق ہوتا ہے۔ پھر کیا اس کی یہی قدر ہے کہ ان کو تکلیف دی جائے یا ذرا ذرا سی ناگواری پر ان کو الگ کردیا جائے؟ کسی نے خوب کہا ہے ؎

آنرا کہ بجا تست ہردم کرمے
عذرش بنہ از کند بعمرے ستمے

کہ جس سے ہر وقت راحت پہنچے اس سے کسی وقت اذیت بھی پہنچے تو چشم پوشی کرنا چاہیے۔

حضرت لقمان علیہ السلام کی حکایت:

حضرت لقمان علیہ السلام نے جو حکیم تو سب کے نزدیک ہیں اور بعض کے نزدیک پیغمبر بھی ہیں ایک باغ میں نوکری کرلی۔ (اس سے سبق لینا چاہیے کہ حلال پیشہ کو حقیر نہ سمجھنا چاہیے) مالکِ باغ ایک روز باغ میں آیا اور اُن سے ککڑیاں منگوائیں اور ان سے تراش کر ایک ٹکڑا ان کو دیا، یہ بہ تکلّف بکر بکر کھاتے رہے۔ اس نے یہ دیکھ کر کہ یہ بڑے مزے سے کھا رہے ہیں یہ سمجھا کہ یہ ککڑی نہایت لذیذ ہے۔ ایک قاش اپنے منہ میں بھی رکھ لی تو وہ کڑوی زہر تھی، فوراً تھوک دی اور بہت منہ بنایا۔ پھر کہا: اے لقمان! تم تو اس ککڑی کو بڑے مزے سے کھا رہے ہو، یہ تو کڑوی زہر ہے۔ کہا: جی ہاں، کڑوی تو ہے۔ کہا: پھر تم نے کیوں نہیں کہا کہ کڑوی ہے؟ کہا: میں کیا کہتا؟ مجھے یہ خیال ہوا کہ جس ہاتھ سے ہزاروں دفعہ مٹھائی کھائی ہے اگر اس ہاتھ

سے ساری عمر میں ایک دفعہ کڑوی چیز ملی تو اس کو کیا منہ پر لاؤں؟ یہ ایسا اصول ہے کہ اگر اس کو میاں بیوی دونوں یاد رکھیں تو کبھی لڑائی جھگڑا نہ ہو اور کوئی بدمزگی پیش نہ آوے۔ بیوی یاد کرے کہ میاں نے ہزاروں طرح کے ناز میرے اٹھائے ہیں، ایک دفعہ سختی کی تو کچھ بات نہیں۔اور خاوند خیال کرے کہ بیوی ہزاروں قسم کی خدمتیں میری کرتی ہے، ایک بات خلافِ طبع بھی سہی۔حق تعالیٰ نے بھی یہ ہی مضمون قرآن شریف میں ارشاد فرمایا ہے۔

عورتوں کی سفارش قرآن میں:

مردوں کو غور کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے کس عمدہ پیرایہ میں عورتوں کی سفارش کی ہے، فرماتے ہیں:

﴿وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّ يَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا﴾ (النساء: ۱۹)

اور ان عورتوں کے ساتھ خوبی کے ساتھ گذران کیا کرو اور اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو ممکن ہے کہ تم ایک شے کو ناپسند کرو اور اللہ تعالیٰ اُس کے اندر کوئی بڑی منفعت رکھ دے۔

یہ ہے کتاب اللہ کہ اس کی ایک اسی تعلیم کو دیکھ کر عقلِ سلیم والا کہہ اٹھے گا کہ بے شک قرآن کتاب اللہ ہے۔فرماتے ہیں: عورتوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو، اور اگر کسی وجہ سے وہ تم کو ناپسند ہوں تو ممکن ہے کہ تم کو کوئی چیز ناپسند ہو اور اللہ تعالیٰ نے اس میں بہت بھلائیاں رکھ دی ہوں۔ ظاہر ہے کہ ناپسند ہونا کسی وجہ سے ہی ہوگا اور زیادہ تر عورتوں کے ناپسند ہونے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان کے اخلاق اچھے نہیں ہوتے، اور یہ بات مرد کے لیے باعثِ اذیت ہے اور اللہ تعالیٰ کا گویا وعدہ ہے کہ عورتوں کی بداخلاقی وغیرہ کو بھی خیرِ کثیر کا سبب بنا دیں گے۔

عورت کا موجبِ خیرِ کثیر ہونا:

اللہ تعالیٰ حکیم ہیں، وہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ مثلاً اس سے اولاد ہی ہو جائے گی جو قیامت میں اس شخص کی دست گیری کرے گی۔ کیوں کہ قیامت میں ایسا بھی ہوگا کہ کسی شخص کے گناہ اس قدر ہوں گے جس کی وجہ سے اس کو دوزخ میں ڈال دینے کا حکم ہوگا، مگر اس کا کوئی بچہ صغیر سن مر گیا ہوگا، وہ کہے گا کہ میں اس وقت تک جنّت میں نہیں جاؤں گا جب تک میرا باپ نہ جائے گا۔

قیامت میں اولاد والدین کو بخشوائے گی:

چناں چہ اس کی خاطر سے باپ کو جنّت مل جائے گی۔ (حدیث میں اس قسم کی خبریں بکثرت آئی ہیں۔) نیز عورتوں کی زبان درازی کی صورت میں خیرِ کثیر اس طرح بھی ہوسکتی ہے کہ مرد اس کی ایذا رسانی پر صبر کرے اور صبر کی جزا جنّت ہی ہے اور جنّت کا خیرِ کثیر ہونا ظاہر ہے۔ کیوں کہ دنیا میں جو عورت سے تکلیف پہنچی وہ تھوڑی تھی چند روزہ تھی، اور اس کے عوض جو راحت آخرت میں حاصل ہوگی وہ یقیناً زیادہ ہوگی۔ کیوں کہ وہ باقی اور دائمی ہوگی، تو عورتوں کا سببِ خیرِ کثیر ہونا صحیح ہوگیا۔ ان صورتوں میں مرد کو چاہیے کہ حق تعالیٰ کے اس وعدہ پر نظر رکھے اور بیوی کی بداخلاقی پر نظر نہ کرے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ بیوی کو روک ٹوک بھی نہ کرے، اصلاح تو ضرور کرے، مگر نرمی کے ساتھ اور کبھی دھمکانا بھی برا نہیں مگر ستاوے نہیں اور زیادہ دھمکانا بھی اچھا نہیں۔

جنابِ رسول اللہ ﷺ کے اخلاق بیبیوں کے ساتھ ایسے عجیب تھے کہ آج کل کے مدعیانِ تہذیب سنیں تو شاید حیرت کریں، مگر ہمیں ان کی حیرت واستعجاب کی پروا نہیں، ہم ان کی بے وقوفی پر ہنسیں گے اور حضور ﷺ کے حالات وواقعات کو کسی کی نکتہ چینی کے خوف سے مخفی نہ رکھیں گے۔ ہمارا مذہب ایسا نہیں جس کی باتوں کو چھپا کر رکھا جاوے، ہم علی رؤس الاشہاد ان کو پیش کرنا چاہتے ہیں، کیوں کہ دنیا میں سب لوگ بے وقوف ہی نہیں بستے، بہت سے اہلِ عقل بھی دنیا میں موجود ہیں جو اُن باتوں کی قدر کریں گے۔ کیوں کہ ان واقعات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ہمارے حضور ﷺ میں بناوٹ اور تصنّع نام کو بھی نہ تھا اور یہ خاص دلیل ہے آپ ﷺ کے سچّا ہونے کی۔ بناوٹ اور تصنّع سے جھوٹا آدمی خالی نہیں ہوسکتا۔

حضور ﷺ کے اخلاق بیبیوں کے ساتھ:

حضور ﷺ کے یہ اخلاق تھے اپنی بیبیوں کے ساتھ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا چوں کہ سب بیبیوں سے کم عمر تھیں تو آپ ان کی عمر کے موافق ان کی دل جوئی فرمایا کرتے تھے۔ چناں چہ حضور ﷺ ایک مرتبہ ان کے ساتھ دوڑے بھی ہیں۔ چوں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بچی اور

چھریرے بدن کی تھیں اور حضور ﷺ بڑی عمر کے تھے، آپ ﷺ کا جسمِ مبارک بھاری ہو چکا تھا اس لیے اس دوڑ میں حضرت عائشہ، حضور ﷺ سے آگے نکل گئیں۔ کچھ عرصہ کے بعد حضور ﷺ پھر ایک مرتبہ دوڑے۔ اس مرتبہ حضور ﷺ آگے نکل گئے، کیوں کہ اب حضرت عائشہ کا بدن ذرا بھاری ہو گیا تھا۔ عورتیں بہت جلد بھاری ہو جاتی ہیں، ان کا نشو و نما جلدی ہوتا ہے۔ اس وقت یہ حضور ﷺ سے آگے نہ نکل سکیں، تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ یہ اس کا بدلہ ہے کہ تم پہلے آگے نکل گئی تھیں۔ سبحان اللہ! کیا ٹھکانا آپ کے اخلاق کا۔

میرے متعلقین میں ایک شخص ہیں جو مجھ سے بیعت بھی ہیں، ان میں متانت اور سنجیدگی زیادہ ہے، جہاں بیٹھتے ہیں بڑے وقار کے ساتھ بیٹھتے ہیں۔ کیا مجال ہنسی آ جاوے یا کسی سے کھل کر بات بھی کر لیں۔

زیادہ وقار بھی اچھا نہیں:

ایک دفعہ اس کے متعلق میں نے تقریر کی کہ یہ سنجیدگی ہمیں پسند نہیں۔ آدمی کو چاہیے کہ ہنستا بولتا رہے، یہ کیا کہ ہر وقت منہ چڑھا ہوا ہے، ایسے آدمی سے کسی کو اُنس نہیں ہوتا۔ آپ نے اس کا نام وقار رکھا ہے، مگر دراصل یہ کبر ہے۔ بھلا حضور ﷺ سے زیادہ کون با وقار ہوگا؟ مگر حضور ﷺ خندہ پیشانی تھے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ بولتے تھے۔ لوگ جس قسم کی بات چیت کرتے حضور ﷺ بھی اس میں شریک رہتے۔ ہمارا وقار حضور ﷺ کے وقار سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ میری عادت ہے کہ میں مدرسہ میں بیٹھ کر دوستوں کے سامنے اپنے گھر کے واقعات و حالات بھی کہہ ڈالتا ہوں (یعنی مخالفوں کے سامنے نہیں)، اس سے بھی ان صاحب کو اختلاف تھا۔ وہ کہتے تھے کہ گھر کی باتیں مجمع میں بیان کرنا خلافِ متانت ہے۔ انھوں نے تو یہ بات خیر خواہی سے کہی ہوگی، لیکن میں اس کو غلط سمجھتا ہوں۔

متانت خلافِ سنت مذموم ہے:

میں نے کہا: مولانا! متانت اس کو نہیں کہتے ۔ متانت بھی وہی ہے جو سنت سے ثابت ہے۔ آپ اس متانت کی بدولت بعض سنتوں سے محروم ہیں۔ اچھا! سچ سچ بتاؤ، کبھی تم نے اس سنت پر بھی عمل کیا ہے جو حضور ﷺ سے ثابت ہے یعنی بی بی کے ساتھ دوڑنا، اور بحمد اللہ! مجھے

یہ دولت نصیب ہوئی ہے۔ ہم نے اس سنت پر عمل کیا ہے۔ تم اس متانت ہی میں رہو گے جس کی بدولت سنت معاشرت مع الازواج پر کبھی عمل نصیب نہ ہوگا، یہ متانت نہیں بلکہ تکبّر ہے، یہ اپنے آپ کو بڑا سمجھنا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت یہ تھی کہ بکری کا دودھ اپنے ہاتھ سے دوہ لیتے، ترکاری کاٹ لیتے اور گھر کے کاموں میں گھر والوں کی مدد فرماتے۔ الحمدللہ! اس پر بھی ہمیں عمل کی توفیق ہوئی ہے۔ حضرت! یاد رکھیے طریقِ سنت یہ ہے کہ مسلمان سیدھا سادہ رہے، بڑا بن کر نہ رہے۔ یہ کیا کہ جہاں بیٹھیں ایسے بیٹھیں جیسے مجمع کے سردار ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب میں مِل جل کر رہتے تھے:

ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو اس طرح مِل جل کر رہتے تھے کہ مجمع میں کوئی یہ بھی تمیز نہیں کرسکتا تھا کہ سردار کون ہے۔ گھر کے اندر یہ حالت تھی کہ بعض دفعہ بیبیاں روٹھ جاتیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ٹال دیتے۔ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بیبیوں سے روٹھ گئے۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر آئے تو دروازہ میں سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلاّ چلاّ کر بات کرتے ہوئے سنا۔ غصّہ آیا، جب اندر پہنچے تو صاحب زادی (عائشہ رضی اللہ عنہا) سے کہتے ہیں: میں بھی سن رہا ہوں کہ تُو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے زور سے بول رہی ہے۔ یہ کہہ کر طمانچہ مارنے کو ہاتھ بڑھایا۔ فوراً ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے روک لیا۔ جب حضرت صدیق رضی اللہ عنہ چلے گئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ سے فرماتے ہیں: دیکھا! میں نے تم کو کیسے بچالیا، ورنہ پٹ گئی ہوتیں۔

ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا کہ بعض ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے زور سے بولتیں اور ضد کے ساتھ فرمائشیں کرتی ہیں۔ وہ آئے تو اس وقت حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا (حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیٹی) موجود تھیں، ان کو ڈانٹا کہ تم ڈرتی نہیں ہو۔ دوسری عورتوں کی ریس میں تم نے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے زور زور سے بولنا شروع کیا ہے۔ یاد رکھو! ہلاک ہوجاؤ گی۔ (ازواج کا یہ زور زور سے بولنا اس وجہ سے تھا کہ وہ جانتی تھیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس سے ناراض نہ ہوں گے، ورنہ رفع صوت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے

سخت معصیت[1] تھا) قصہ اِفک میں جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی برأت میں وحی نازل ہوئی تو ان کے والدین نے اُن سے کہا: قُوْمِي إِلَيْهِ، یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ اور آپ کا شکریہ ادا کرو۔ تو آپ فرماتی ہیں:

لَا وَاللهِ ،لَا أَقُوْمُ إِلَيْهِ، وَلَا أَحْمَدُ إِلَّا اللّٰهَ، هُوَالَّذِيْ أَنْزَلَ بَرَاءَ تِيْ، أَوْ كَمَا قَالَ.

یعنی نہیں واللہ، میں تو نہیں اٹھتی، نہ میں کسی کا شکریہ ادا کروں سوا اللہ کے، اسی نے میری براءت نازل فرمائی۔

ظاہر میں یہ کتنا سخت لفظ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ ہی پر کہتی ہیں کہ میں تو نہیں اٹھتی، نہ میں کسی کا شکریہ ادا کروں، مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اصلاً ملال نہ ہوا، کیوں کہ نازِ محبوبانہ تھا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قصّہ:

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ میں پہچان جاتا ہوں جب تم مجھ سے ناراض ہوتی ہو۔ عرض کیا کہ حضور! کس طرح پہچان لیتے ہیں؟ فرمایا: جب تم راضی ہوتی ہو تو اپنی بول میں یوں کہتی ہو: لَا وَرَبِّ مُحَمَّدٍ، اور جب ناراض ہوتی ہو تو یوں کہتی ہو: لَا وَرَبِّ إِبْرَاهِيْمَ (اس وقت ربِ محمد نہیں کہتی)۔ کہا: حضور! واقعی آپ کا خیال ٹھیک ہے، مگر میں غصّہ کی حالت میں بھی صرف آپ کا نام ہی چھوڑ دیتی ہوں، یعنی دل سے آپ کو نہیں بھولتی۔ جیسا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ بہت تعلّق تھا، حضرت عائشہ بھی سب سے زیادہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عاشق تھیں۔ ان ہی کا یہ شعر ہے:

لواحي زليخا لو رأين جبينه
لآثرن بالقطع القلوب على اليد

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عاشق زار تھیں مگر پھر بھی کبھی اینٹھ جاتیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کچھ نہ کہتے، کیوں کہ درحقیقت یہ ناراضی نہیں تھی بلکہ ناز تھا۔ یہ ایسا ہے جیسے کبھی رعایا بادشاہ سے خفا ہو جاتی ہے اور وہ اُن کو سزا نہیں دیتا بلکہ اُن کے کہنے کے موافق

---

[1] سورۂ حجرات میں بہ تصریح یہ مسئلہ موجود ہے اور رفع صوت پر حبطِ اعمال کی وعید ہے۔

کر دیتا ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ انتقام سے عاجز ہے بلکہ نہایت درجہ شفیق ہے اور رعایا کی ناز برداری کرتا ہے۔ یہ ہے طرزِ معاشرت سنت کے موافق، اب جو لوگ متانت ووقار کو لیے پھرتے ہیں وہ اسی میں رہیں۔

ہم نے ایک والیِ ملک کی زیارت کی ہے (ان کا نام نہیں لیتا ہوں) وہ اس قدر خلیق اور نرم تھے کہ ان کی بیوی کبھی کبھی ان کو پیٹ بھی لیتی تھیں۔ خیر یہ تو واہیات ہے کہ میاں بیوی کے ہاتھ سے پٹا کرے، مگر اس سے یہ تو معلوم ہوا کہ وہ کس قدر خلیق تھے، ورنہ ایک کے دو لگاتے۔ یہ بی بی صاحب کی بدتمیزی تھی کہ وہ میاں پر ہاتھ اٹھاتی تھی اور میاں کا ڈھیلا پن تھا کہ بی بی کو اتنا گستاخ کر دیا گیا تھا۔ صرف نواب صاحب کی وسعتِ اخلاق دکھلانے کے لیے یہ حکایت زبان پر آ گئی۔ باقی بیوی کے ہاتھوں پٹنا پٹانا تو بڑا واہیات ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ بیوی پر اپنا رعب اتنا نہ بڑھانا چاہیے کہ میاں بالکل ہوّا ہی ہو جاوے کہ ادھر میاں نے گھر میں قدم رکھا اور بی بی کا دم فنا ہوا۔ ہوش وحواس بھی جاتے رہے۔ بے چاری کے مُنہ سے کوئی بات نکلی یا کوئی چیز مانگی اور ڈانٹ ڈپٹ شروع ہوگئی کہ تم بہت فضول خرچ ہو۔ اس چیز کی کیا ضرورت تھی، اس چیز کی کیا ضرورت ہے؟

بیوی کے خرچ میں تنگی:

بعض لوگ ضروری کھانے پینے میں بھی عورت پر تنگی کرتے ہیں اور اس کے لیے اصول مقرر کرتے ہیں۔ مثلاً چار آنے روز سے زیادہ نہ دیں گے چاہے کوئی مہمان آوے یا کوئی بیمار ہو جاوے۔ بات بات پر کہتے ہیں کہ بس اس سے زیادہ نہ ملے گا۔ بھلے مانس! عورت تو اہلِ وصول ہے اہلِ اصول نہیں ہے۔ تم بڑے اہلِ اصول ہو تو ذرا اپنی ذات کے لیے پابندی کر کے دکھلاؤ۔ اپنے واسطے تو کوئی رقم دو آنہ، چار آنہ یا روپیہ مقرر کرو کہ اس سے زیادہ کسی حال میں خرچ نہ کرو گے خواہ بیماری ہو یا شادی ہو یا کوئی آفت ناگہانی۔ مثلاً کوئی مقدمہ آپ کے سر پڑ جاوے پھر دیکھیں کہ آپ اصول کی پابندی کہاں تک کرتے ہیں۔ سب اصول رکھے رہ جاویں گے۔ ذرا سی دیر میں سینکڑوں روپیہ پر پانی پھر جاوے گا۔ پھر غریب بیوی کے ساتھ ہی کیوں اصول بگھارتے ہو۔

میں یہ نہیں کہتا کہ عورتوں کو فضول خرچی کی اجازت دے دی جائے بلکہ مطلب یہ ہے کہ خدا نے جتنی وسعت تم کو دی ہے جیسا تم اپنی ذات کے لیے خرچ کرتے ہو ویسا ہی اس کو بھی خرچ کرنے دو۔

عورت کو حتی المقدور تنگ نہ کیا جائے:

شریعت کی تعلیم یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو عورت کو راحت دو، اس کو پریشان اور تنگ مت کرو۔ نان ونفقہ فراغت کے ساتھ دو۔ اس کی دل جوئی کرو۔ اس کی بہت سی ایذاؤں پر صبر کرو اور حق تعالیٰ کے اس وعدہ پر نظر رکھو: ﴿فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّ يَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ۝﴾ (النساء: ۱۹) مسلمانوں کو بیبیوں کے ساتھ حضور ﷺ کے طرزِ عمل اور معاشرت کے موافق عمل کرنا چاہیے، مَتانت وغیرہ کو بالائے طاق رکھنا چاہیے۔ متانت وہی ہے جو حضور ﷺ کے اَعمال واَفعال میں ہے خوب سمجھ لو۔ بیان یہ ہو رہا تھا کہ قرآن میں عورتوں اور مَردوں کے متعلق آیتیں مختلف مضامین کی آئی ہیں، ایک وہ آیت ہے جس کا بیان ہو رہا ہے، جس سے مردوں عورتوں کی تساوی معلوم ہوتی ہے۔

مسئلۂ تساوی میں بظاہر نصوص میں تعارض ہے:

بعض آیتوں سے اس کے خلاف ثابت ہوتا ہے، مثلاً: ﴿وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ﴾ (البقرۃ: ۲۲۸) کہ مردوں کا درجہ عورتوں سے زیادہ ہے، اس کے آگے ہے: ﴿وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾ (البقرۃ: ۲۲۸) یہ جملہ تعلیلیہ ہے، جس کا حاصل یہ ہوا کہ اس فضیلت میں تعجب کی کوئی بات نہیں، کیوں کہ یہ اللہ کی دی ہوئی ہے جو غالب ہیں اِن کے حکم کو کوئی روکنے والا نہیں اور یہ حکم نِرا حاکمانہ بھی نہیں۔ کیوں کہ وہ حکیم بھی ہیں، انھوں نے جو کچھ بھی حکم دیا ہے حکمت سے خالی نہیں ہو سکتا، لہٰذا کچھ چوں وچراں کی گنجایش نہیں۔ ایک آیت اور یاد آئی، وہ یہ ہے:

﴿وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ﴾ (النساء: ۳۲)

جس کا شانِ نزول یہ ہے کہ ایک دفعہ حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا نے حسرت کے ساتھ تمنّا کی

کہ کاش! ہم بھی مرد ہوتے تو مردوں کی طرح جہاد کرتے، اس پر یہ آیت اُتری۔

حق تعالیٰ نے ایسی تمنّا کرنے سے منع فرمایا ہے اور ممانعت کا عنوان یہ ہے کہ ہم نے جو تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے، اس کی تمنّا ایک دوسرے کو نہ کرنی چاہیے۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مَردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے اور اسی لیے حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا نے مرد ہونے کی تمنّا کی تھی۔ آگے اس آیت میں ہے:

﴿لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ﴾ (النساء: ۳۲)

یعنی مَردوں کو اُن کے عمل کی جزا ملے گی اور عورتوں کو اُن کے عمل کی۔ اس جُملہ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مدار عمل پر ہے اور جب مدار عمل پر ہے تو اگر عورت زیادہ عمل کرے تو مرد سے بھی بڑھ سکتی ہے۔

حاصل یہ کہ یہ تین آیتیں ہیں: ایک سے تساوی ثابت ہوتی ہے مرد و عورت میں، اور ایک سے فضیلت مردوں کو عورتوں پر، اور ایک سے یہ کہ عورت مرد سے بھی بڑھ سکتی ہے۔ ان آیتوں میں کسی ظاہر بین کو تعارض کا شبہ ہوسکتا ہے مگر حقیقت میں تعارض نہیں ہے، اور اس کا فیصلہ خود قرآن کی آیتوں میں موجود ہے۔ اور یہ خاص شان ہے قرآن کی کہ يُفَسِّرُ بَعْضُهٗ بَعْضًا یعنی قرآن اپنی شرح خود کرتا ہے۔ اس کو دیکھ کر بے اختیار زبان پر آتا ہے:

آفتاب آمد دلیل آفتاب
گر دلیلت بایدت از وے رو متاب

سورج کے وجود کی دلیل یہی ہے کہ دیکھ لو سورج نکلا ہوا ہے۔ اور دلیل کیا ہوتی ہے؟ یہی قرآن کی شان ہے کہ جہاں کوئی اشکال پیدا ہو غور کرو، وہیں اس کا حل بھی ہوگا۔ اب آیتوں میں غور کیجیے۔ پہلے میں ایک قاعدہ بیان کرتا ہوں اس کو سمجھ لیجیے، پھر دیکھیے کہ آیتوں میں تعارض کہاں ہے؟ وہ قاعدہ یہ ہے۔

صفات فاضلہ دو قسم کی ہیں خلقی و مکتسب:

فضائل دو قسم کے ہیں: ایک خلقی اور ایک مکتسب۔ خلقی کہتے ہیں پیدائشی کو، اور مکتسب

کہتے ہیں ان صفات کو جو اختیار اور کسب سے حاصل ہوتی ہیں۔ تو صفاتِ خلقیہ میں تو مرد عورتوں سے بڑھے ہوئے ہیں، جیسے کمالِ عقل، شجاعت، قوتِ عمل، تدبیر۔ ان ملکات میں حق تعالیٰ نے مردوں کو عورتوں پر فضیلت دی ہے۔ عورت چاہے کیسی ہی ہو، امیر زادی ہو، کتنی ہی حسین و جمیل ہو چوں کہ ان صفات میں وہ مردوں سے گھٹی ہوئی ہے۔ اس لیے فرمایا گیا: ﴿وَ لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ﴾ (البقرة:۲۲۸). اور جو صفات مکتسب ہیں یعنی جو حاصل ہوتی ہیں ارادہ اور عمل اور اختیار سے جیسے اصلاح اخلاق و اعمال وغیرہ۔ ان میں نہ مرد کو بڑھا ہوا کہہ سکتے ہیں، نہ عورت کو، بلکہ جو زیادہ کام کرے اور اخلاقِ فاضلہ اختیار کرے گا، وہی بڑھا ہوا ہوگا۔ اگر مرد کوشش کرے گا تو مرد بڑھ جاوے گا، عورت کوشش کرے گی تو عورت بڑھ جاوے گی۔ یہ حاصل ہے ﴿لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ﴾ کا۔ ان دونوں کے علاوہ ایک قسم فضیلت کی اور ہے جس کو اصطلاح میں فضیلتِ اضافی کہنا چاہیے۔ کیوں کہ اس فضیلت کا منشا خالق وعید کا تعلّق ہے، یعنی عمل کرنے والے کا عمل ضائع نہ ہونا۔ سو یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے، اس میں مرد اور عورت دونوں مساوی ہیں، عمل کسی کا ضائع نہ ہوگا۔ یہ اور بات ہے کہ ہر عامل کے عمل میں تفاوت ہو، لیکن اس قانون میں مساوات رہے گی کہ کسی کا بھی عمل ضائع نہ ہوگا۔

حاصل یہ کہ تین قسم کے فضائل ہوئے: فضائلِ خلقیہ،[1] اور فضائل مکتسبہ، اور فضائل اضافیہ۔ اول میں مرد بڑھے ہوئے ہیں۔ دوسرے میں کبھی مرد بڑھے ہوئے ہوں گے، کبھی عورتیں۔ تیسرے میں دونوں برابر ہیں۔

فضائلِ خلقیہ:

اب جو فضائلِ خلقیہ ہیں ان کی تمنّا کرنا اور نہ حاصل ہونے پر دل شکستہ ہونا فضول بات ہے۔ جیسے عورتیں یوں کہیں کہ کاش! ہم بھی مرد ہوتے اور اس حسرت میں رات دن رویا کریں تو اللہ تعالیٰ اس سے منع فرماتے ہیں: ﴿وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ (النساء:۳۲).

---

[1] یعنی فطری اور پیدائشی فضیلت جس میں انسان کو کوئی دخل نہیں۔

کیوں کہ جو چیز محض وہبی ہے اور ہمارے اختیار کو اس میں کچھ دخل نہیں، نہ ہم اس کو اپنی سعی و کوشش سے حاصل کر سکتے ہیں، تو اس کے لیے رونا، رنج کرنا بے ہودہ حرکت نہیں تو اور کیا ہے؟ سوائے تضییع وقت کے اس میں کچھ بھی نہیں۔ پھر اس کی دُھن میں آدمی دوسرے ضروری کاموں سے بھی رہ جاتا ہے جن کا حصول اختیاری ہے، تو کون عقل منداس صورت کو پسند کرے گا کہ وہبی غیر اختیاری کے فکر میں رات دن مریں اور اس کے لیے رویا کریں اور تعطّل سے مضرّت میں پڑیں۔

پس شریعت کی یہ تعلیم عین مطابقِ عقل اور بالکل صحیح تعلیم ہے کہ ایسی باتوں کی فکر میں مت پڑو جو تمہارے اختیار سے باہر ہیں۔ مثلاً کوئی رات دن اس رنج میں رویا کرے کہ ہائے! ہم نبی نہ ہوئے، تو یقیناً احمق ہے، کیوں کہ نبوت تو ایک وہبی چیز ہے، کسب سے کسی طرح حاصل نہیں ہوسکتی تو رونے سے کیا فائدہ؟

فضائلِ مکتسبہ کی تمنّا جائز ہے:

اور فضائلِ مکتسبہ میں تمنّا کرنا جائز ہے مگر صرف تمنّا کرنا کافی نہیں، بلکہ عمل کسب اور ہمت کی ضرورت ہے، اس کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں: ﴿لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا﴾ کہ فضائل مکتسبہ اکتساب سے حاصل کرو کہ ان کا مدار صرف کسب پر ہے، ہمت کرو، نری تمنّا سے کچھ نہیں ہوتا۔ غرض خلاصہ تعلیم کا یہ ہوا کہ امورِ غیر اختیاریہ کی تو تمنّا بھی نہ کرو اور امورِ اختیاریہ میں ہمت کرو اور یہ وعدہ یاد رکھو کہ کسی کا عمل ضائع نہ ہوگا۔ یہ کیسی پاکیزہ تعلیم ہے۔

سالکین کے کام کی بات:

یہ تعلیم سالکین کے لیے نہایت کارآمد ہے۔ سالک کو چاہیے کہ اس کو ہر وقت پیشِ نظر رکھے۔ یہ ایک بڑا بھاری دستور العمل ہے کہ جو بات اس کے اختیار میں نہ ہو اس کے درپے نہ ہو اور جو بات اختیار میں ہو اس میں ہمت کرے۔ مثلاً ذکر و شغل ہے، ذوق و وجد ہے، ان میں ذکر و شغل اختیاری چیزیں ہیں۔

ذوق ووجد اختیاری نہیں:

اور ذوق اور وجد اختیاری نہیں۔ تو سالک کو چاہیے کہ ذکر و شغل جس قدر ہوسکے کرے، یعنی جس قدر اس کا مربّی تعلیم کرے اس کی پابندی رکھے اور ذوق ووجد کے پیچھے نہ پڑے۔ بعض لوگ جب ذکر و شغل کرتے ہیں اور ذوق ووجد پیدا نہیں ہوتا تو دلگیر ہوتے ہیں اور شکایت کرتے ہیں کہ صاحب! ہم کو ذکر و شغل کرتے ہوئے اتنے دن ہوئے، اب تک کوئی بات ہی نہیں پیدا ہوئی۔ یعنی ذوق، وجد، کشف وغیرہ وغیرہ حاصل نہیں ہوا۔

میں کہتا ہوں: خدا کے بندے! اگر یہ امور اختیاری ہیں (حالاں کہ یہ غلط ہے) تو شکایت کیوں کرتے ہو، کوشش کیے جاؤ پیدا ہوجاویں گے۔ اور اگر غیر اختیاری ہیں تو اُن کے پیچھے کیوں پڑے اور کیوں رنج کیا۔ غرض رنج کرنا اور شکایت کرنا تو ہر حال میں بے سُود ہے، کام کرنا چاہیے۔ جس کسی کو یہ امور حاصل ہوتے ہیں ان کے اختیار اور کسب کو اس میں دخل نہیں ہوتا۔ ایسے ہی امور کے بارے میں ارشاد ہے کہ ﴿وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ اُن باتوں کی تمنّا مت کرو، بلکہ اپنا کام کیے جاؤ۔ غیر اختیاری امور تمنّا سے حاصل نہیں ہوتے۔

امور غیر اختیاریہ کے درپے ہونے کی خرابی:

بلکہ اُن کے درپے ہونے سے بے حد پریشانی اٹھانی پڑتی ہے، کبھی اس پریشانی میں قبض ہوجاتا ہے۔ پھر آدمی ذکر و شغل سب کچھ کرتا ہے، مگر دل نہیں کھلتا، کیوں کہ یکسوئی نہیں ہوتی، ہر وقت دل میں ایک بند لگا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کبھی آدمی ان پریشانیوں سے گھبرا کر کام ہی کو چھوڑ بیٹھتا ہے، حتی کہ ضروری اعمال سے بھی محروم ہوجاتا ہے۔ ایسے ہی وقت کے لیے عارف شیرازی صاحب[1] فرماتے ہیں:

باغباں گر پنج روزے صحبت گل بایدش
برجفائے خار ہجراں صبر بلبل بایدش
اے دل اندر بتدر نقش از پریشانی منال

---

[1] یہ بزرگ گو صاحبِ حال ہیں، مگر حال کے اندر بھی مسائل کی تعلیم فرماتے ہیں۔

مرغ زیرک چوں بدام افتد تحمّل بایدش

اے باغ کے والی! اگر تو چند روز کے لیے پھول کی صحبت میں رہنا چاہتا ہے تو جدائی کے کانٹوں کے ظلم پر تجھ کو صبر بلبل اختیار کرنا چاہیے۔ اے دل! محبوب کی زلف کی قید میں پھنس کر پریشان ہو کر مت چیخ، عقل مند پرندہ جب جال میں پھنس جاتا ہے تو صبر و برداشت سے کام لیتا ہے۔

قبض کے وقت کیا کرنا چاہیے:

حاصل یہ ہے کہ قبض کی حالت میں گھبرانا نہیں چاہیے، صبر و تحمّل سے کام لینا چاہیے، اعمال کو چھوڑنا نہیں چاہیے۔ سالک کو عجیب عجیب حالات پیش آتے ہیں، کبھی قبض ہوتا ہے اور یہ تعلیم اسی کے متعلق ہے۔

بسط میں کبھی سالک کو بھی عمل پر ناز ہو جاتا ہے:

اور کبھی بسط ہوتا ہے اور اپنے عمل پر ناز ہو جاتا ہے، اس کے واسطے بھی تعلیم فرماتے ہیں:

تکیہ بر تقویٰ و دانش در طریقت کافری است

راہ رو گر صد ہنر و توکل بایدش

درویشی کے راستہ میں اپنی پرہیزگاری اور سمجھ پر بھروسہ کرنا کفر ہے۔ اے رستہ کے چلنے والے! اگرچہ تو سو کمال بھی رکھتا ہو، پھر بھی اپنے کمال پر بھروسہ نہ کرنا، صرف اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنا۔

یعنی اپنے عمل اور ذکر و شغل کو کچھ مت سمجھو، ان سے کچھ نہیں ہوتا، جو کچھ ہوتا ہے حق تعالیٰ کے فضل سے ہوتا ہے۔ یہ حضرت حافظ رحمۃ اللہ علیہ کی پوری غزل ہے اور اس میں سب مسائل ہی مسائل بیان فرمائے ہیں۔ میں نے ان اشعار کو "تعلیم الدین" میں تفصیل سے لکھ دیا ہے۔ اس وقت سب اشعار کو نہیں پڑھتا ہوں، کیوں کہ یہ جلسہ مشاعرہ کا نہیں ہے، نہ سب اشعار کی اس وقت ضرورت ہے۔ میں بیان یہ کر رہا تھا کہ امورِ غیر اختیاریہ کے پیچھے نہ پڑنا چاہیے، اس سے سوائے پریشانی کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا اور وہ حاصل نہ ہوں تو شکایت مت کرو۔

امورِ اختیاریہ میں اپنے اختیار کے موافق ہمت سے کام لے:

اور جو امورِ اختیاریہ ہیں ان کو اپنے ارادہ اور اختیار سے کرو جہاں تک اختیار کو دخل ہے۔ اور جس درجہ میں وہ بھی اختیار سے خارج ہوں اس کے بھی پیچھے مت پڑو۔ یہ اصول سالکین کے لیے بہت ہی کارآمد ہیں اور بالکل صحیح ہیں۔ ان کی قدر اس وقت ہوتی ہے جب کوئی پریشان ہو چکا ہو اس کے بعد اُس کے کان میں یہ علوم پڑیں، تو اُس کو ایسا معلوم ہوگا کہ پہلے مُردہ تھا اب زندہ ہو گیا۔ ایک اور مثال سنیے۔ مثلاً کوئی تہجّد کا شوقین ہے، تو ظاہر ہے کہ تہجّد کا قصد کرنا تو فعل اختیاری ہے، لہٰذا اس کو چاہیے کہ ہمت کرے اور آنکھ کھلنے کا اہتمام کرے۔

تہجّد کے وقت آنکھ کھلنے کی تدابیر:

اس کی تدبیر بھی پوری طرح کرے، مثلاً کھانا ذرا سویرے کھاوے اور عشا کی نماز پڑھ کر فوراً سو رہے، اور کھانے میں دو، چار لقمے کم کھاوے، پانی کم پیے۔ یہاں تک تو اُس کے اختیار میں ہے۔

باوجود تدابیر کے تہجّد کے وقت آنکھ نہ کُھلنا:

اب فرض کرو کہ کوئی شخص یہ سب تدبیریں کر کے سویا اور ارادہ تھا کہ تہجّد پڑھیں گے، مگر اس پر بھی آنکھ نہ کھلی، آنکھ اس وقت کھلی جبکہ تہجّد کا وقت ختم ہو چکا تھا، تو اب یہ روتا اور پریشان ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ میں بڑا بدنصیب ہوں، شاید مجھ سے کوئی گناہ سرزد ہوا ہے جو تہجّد سے محروم رہا۔ لیکن اگر یہ بات اس کے کان میں پڑی ہوئی ہے تو بہت کام دے گی کہ امرِ غیر اختیاری کے پیچھے نہ پڑنا چاہیے۔ اس کے فوت ہونے سے کچھ ضرر نہیں ہوتا۔ اس بات کے بتلانے کے لیے ایک بار حضور ﷺ کی نمازِ فجر قضا کرادی، تاکہ سالکین کو اس واقعہ سے تسلّی ہو جائے۔

آں حضرت ﷺ کی ایک بار فرض نماز قضا ہوئی:

حدیث میں لیلۃ التعریس کا قصّہ مشہور ہے۔ وہ یہ کہ حضور ﷺ ایک دفعہ مع لشکر کے سفر میں تھے۔ رات کے آخری حصّہ میں ایک میدان میں قیام کیا۔ فجر کی نماز کے لیے جاگنے کا پورا اہتمام کیا گیا کہ حضور ﷺ نے فرمایا: کوئی ہے جو اس وقت بیدار رہ کر پہرہ دے، تاکہ

صبح کے وقت ہم کو اُٹھائیے؟

حضرت بلال رضی اللہ عنہ اس کے لیے تیار ہوئے اور کجاوہ سے پشت لگا کر مشرق کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئے کہ فجر ہو تو میں اذان دوں اور سب کو اُٹھاؤں۔ خدا کی قدرت کہ سب تو سو ہی رہے تھے، ان کی بھی آنکھ لگ گئی اور ایسے بے خبر سوئے کہ سورج نکلنے کے بعد سب سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ کھلی پھر سب کی آنکھ کھلی، تو لوگ گھبرا گئے اور پریشان ہوئے اور ڈر گئے کہ آج نماز قضا ہوگئی، خدا جانے کیا وبال آئے گا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تسلّی دی اور فرمایا: گھبراؤ نہیں (سبحان اللہ! کیسی عجیب تعلیم اور کیسا استقلال اور کیسا عرفان ہے)۔ پھر فرمایا: لَاتَفْرِيْطَ فِيْ النَّوْمِ سونے میں کچھ تقصیر نہیں، کیوں کہ غیر اختیاری بات ہے۔ إِنَّمَا التَّفْرِيْطُ فِيْ الْيَقْظَةِ. تقصیر تو بیداری کی حالت میں ہوتی ہے۔ اس کے بعد وہاں سے تھوڑی دُور چل کر قضا نماز پڑھی۔ کیا ٹھکانا ہے اس شفقت کا؟ خدا کی حکمت ورحمت ہے کہ عمر بھر میں ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز بھی قضا ہوگئی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اہلِ سلوک تو ایسا واقعہ پیش آنے سے مر ہی جاتے۔ حق تعالیٰ نے ایک نظیر قائم کر دی جس سے اہلِ سلوک کو تسلّی ہو سکتی ہے کہ امام العارفین اور سلطان العابدین (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ بات پیش آگئی تو ہم تو کیا چیز ہیں؟ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تو فرض نماز قضا ہوگئی تھی، تابنفل چہ رسد۔

اس بات کے کہنے کو تو جی نہیں چاہتا تھا، کیوں کہ شاید کم ہمتوں کو اس سے سہارا مل جائے۔ مگر جب حدیث میں یہ واقعہ منقول ہے تو یہ دِین کی ایک بات ہے اور دین کی بات چھپانا دین کے خلاف ہے، اس لیے ظاہر کر دیا۔ نیز جیسا تھوڑے سے ضرر کا احتمال ہے اس سے زیادہ نفع کی امید ہے، کیوں کہ اہلِ ہمت کو بعض وقت معمولات کے فوت ہونے سے بہت پریشانی ہوجاتی ہے، اس کے لیے اس واقعہ میں بہت کار آمد اور ضروری بات موجود ہے جس سے اُن کی زندگی ہو سکتی ہے۔ اس واقعہ سے اس مسئلہ کی پوری تائید ہوگئی کہ امرِ غیر اختیاری کے پیچھے نہ پڑنا چاہیے۔ آدمی کو چاہیے کہ جتنا ہو سکے کوشش کرے اختیاری اعمال میں کوتاہی نہ کرے۔ اگر اس پر بھی کامیابی نہ ہو تو اب معاملہ اختیار سے باہر ہے، اس کے پیچھے نہ پڑے اور کامیابی نہ ہونے سے رنجیدہ نہ ہو۔

دیکھو! لیلۃ التعریس کے واقعہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی نماز کے لیے تدبیر پوری کی کہ

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو پہرے پر بٹھلا دیا۔ یہاں تک تو اختیاری فعل تھا، اس کے آگے غیر اختیاری معاملہ تھا۔ جب اختیاری فعل میں کوتاہی نہیں کی گئی اور پھر بھی کامیابی نہیں ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو رنج و غم کرنے سے منع کیا، ان کو تسلّی دی اور اطمینان دلایا کہ تم کو کچھ گناہ نہیں ہوا، رنج نہ کرو۔ مگر اب تو یہ حال ہے کہ بعض لوگ تہجّد کا شوق ظاہر کرتے ہیں تو پہلے تو میں ان کو آنکھ کھلنے کی تدبیریں بتلاتا ہوں۔ بعض اس پر بھی شکایت کرتے ہیں کہ ساری تدبیریں کیں، مگر کامیابی نہیں ہوتی تہجّد اب بھی قضا ہو جاتا ہے۔

عشاء کے بعد تہجّد پڑھنا:

تو میں کہتا ہوں کہ عشا کے بعد وتر سے پہلے تہجّد پڑھ لیا کرو۔ اس پر ان کے دل کو قناعت نہیں ہوتی اور یوں کہتے ہیں کہ عشا کے بعد تہجّد پڑھنے سے تو جی بھلا نہیں ہوتا۔ اس خود رائی پر مجھے غصّہ آتا ہے، آخر مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ بھائی! مجھے چھوڑو اور اس کے پاس جاؤ جو تمہارا جی بھلا کرے۔ خبردار! جو پھر مجھ سے کوئی شکایت کی، جب تم کو ایک بات بتائی جاتی ہے تو اس پر عمل کیوں نہیں کرتے؟ اور اگر عمل کرنا نہیں ہے تو پوچھتے ہی کیوں ہو؟

صاحبو! یہ بھی نفس کا ایک حیلہ ہے کہ جی بھلا نہیں ہوتا۔ اس حیلہ سے نفس تم کو اول شب کے صلوٰۃ اللّیل سے بھی محروم کر دینا چاہتا ہے، اور آخر میں آنکھ نہیں کھلتی تو انجام یہ ہوتا ہے کہ تہجّد بالکل نصیب نہیں ہوتا۔ بتلاؤ! یہ اچھا ہے یا یہ اچھا ہے کہ کچھ تو نصیب ہو جاوے؟ ہاں ایک صورت تمہارا جی بہلانے کی یہ ہے کہ مجھے ایسی کرامت دلوادو کہ میں تمہارے پاس آ کر ڈنڈے مار کر اٹھا دیا کروں، گویا میں انسپکٹر بن جاؤں۔

کام اپنے کرنے سے ہوتا ہے:

خوب یاد رکھو کہ کام اپنے ہی کرنے سے ہوتا ہے۔ اول شب میں تہجّد پڑھنے سے جی بھلا نہیں ہوتا تو ہمت کر کے اخیر شب میں اٹھا کرو۔

سہل تعلیم کی قدر نہیں کی جاتی:

مشکل یہ ہے کہ بعض لوگ سہل تعلیم کی قدر نہیں کرتے اور دشوار تعلیم پر اُن سے عمل نہیں

ہوسکتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کام ہی رہ جاتا ہے۔ جب آنکھ نہ کھلنا غیر اختیاری بات ہے تو جتنا اختیاری ہے، یعنی اول شب میں پڑھ لینا اس پر عمل کیوں نہیں کرتے؟ اخیر شب کا تہجّد نہ سہی، اول شب کا تو ہو جاوے گا، نہ ہونے سے تو اچھا ہوگا۔ پھر جب تمہارا ارادہ اخیر شب میں پڑھنے کا ہے تو یہ ارادہ فعل اختیاری ہے، آپ نے یہ کر لیا تو باوجود تہجّد کا ناغہ ہو جانے کے بھی اس کا ثواب ملے گا۔ اگر آنکھ کھل گئی تو خوش قسمتی ہے، نہ کھلی تو پریشان نہ ہوجیے۔

حاصل یہ کہ آیت ﴿وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ میں یہ تعلیم ہے کہ امورِ غیر اختیاریہ کے پیچھے نہ پڑنا چاہیے۔ یہ بات سالکین کے لیے بڑے ہی کام کی ہے، اس کی قدر کرنی چاہیے۔ یہ بات درمیان میں جملہ معترضہ کے طور پر آ گئی اصل بیان عورتوں کے متعلق ہو رہا تھا۔ کیوں کہ آیت ﴿لَا تَتَمَنَّوْا﴾ کی اصل مخاطب عورتیں ہی ہیں، جیسا کہ شانِ نزول سے معلوم ہوا۔ حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا نے تمنّا کی تھی کہ ہم مرد ہوتے تو اچھا تھا، اس پر یہ آیت اتری جس میں بتا دیا گیا کہ ایسی تمنّا فضول ہے۔ یہ تو قانونی جواب ہے کہ منع کر دیا گیا کہ ایسی تمنّا مت کرو۔ اور اس میں ایک راز بھی ہے، وہ یہ کہ خدا تعالیٰ نے جس کو مرد بنایا اس کے لیے یہی مناسب تھا اور جس کو عورت بنایا اس کے لیے بھی یہی مناسب تھا۔

حق تعالیٰ نے جو کچھ کسی کو دیا وہ اُسی کے قابل تھا:

ہر شخص کو خدا تعالیٰ نے وہی دیا ہے جو اُس کے لیے مناسب تھا، اس کی تفصیل کہاں تک کی جاوے، اہلِ بصیرت خود سمجھ سکتے ہیں اور ذرا غور سے ہر موقع پر سمجھ میں آ سکتا ہے کہ جس کو جیسا حق تعالیٰ نے بنا دیا ہے اس کے لیے وہی مناسب تھا، گو ہر شخص دوسرے کو دیکھ کر یہ تمنّا کرتا ہے کہ میں ایسا ہوتا اور اپنی حالت پر قناعت نہیں ہوتی۔ لیکن غور کر کے دیکھیے اور سوچیے تو اس کو معلوم ہوگا کہ میرے مناسب وہی حالت ہے جس میں خدا نے مجھ کو رکھا ہے۔ آج کل بھی ایسے لوگ موجود ہیں کہ دوسروں کی حالت سن کر تمنّا کرتے ہیں کہ ہم فلاں ہوتے۔

چناں چہ ایک مولوی صاحب تھے جو پڑھے لکھے ذی استعداد تھے۔ حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے فضائل پڑھاتے ہوئے یہ تمنّا کی تھی کہ ہائے میں عائشہ ہی ہو جاتا۔ میں نے

کہا: جابندۂ خدا! تمنّا ہی کرنی تھی تو یہ تمنّا کی ہوتی کہ میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہوتا۔ آپ مرد سے عورت بننا چاہتے ہیں۔ وہی صاحب ایک دفعہ جنّت کے فضائل دیکھتے ہوئے کہنے لگے۔

دوسرے کی حالت کی تمنّا ٹھیک نہیں:

کاش! میں جنّت کا اُلّو ہی ہوجاتا۔ میں نے کہا: پھر آپ جنّت کو بھی ویران کرتے۔ (یہ ظریفانہ کلمہ بنا بر قولِ مشہور ہے کہ اُلّو کے بیٹھنے سے ویرانہ ہوجاتا ہے، ورنہ اس کی کچھ اصل نہیں) خیر وہ تو جنّت ہی کا اُلّو بننا چاہتے تھے، مگر آج کل کا زمانہ بھی عجیب طرح کا ہے کہ لوگ ہندوستان اور پنجاب کے جانور بننا چاہتے ہیں۔ کوئی شیرِ پنجاب بنتا ہے، کوئی طوطیِ ہند، کوئی بلبلِ ہند۔ لوگ انسان سے جانور بننا چاہتے ہیں۔ خدا خیر کرے! آج تو شیر اور بُلبل بنے ہیں، کل کوئی گاؤ ہند اور خرِ ہند بھی بننے لگے گا۔ کیا واہیات ہے؟ خدا نے تم کو انسان بنایا، تم چرند پرند کیوں بنتے ہو؟ حق تعالیٰ نے تم کو مرد بنایا، تم عورت کیوں بنتے ہو؟ خدا تعالیٰ کے فعل میں اصلاح کیوں دیتے ہو؟ دوسروں کو دیکھ کر اُن کے برابر ہونے کی تمنّا کرنا ٹھیک نہیں۔ اسی کی ایک فرع یہ بھی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہونے کی تمنّا کرنا:

بعض لوگ جوشِ محبّت میں کہا کرتے ہیں: ہائے! ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کیوں نہ ہوئے؟ ظاہر میں تو لفظ اچھا معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبّت کی دلیل ہے۔ مگر ذرا سوچو تو کہ اگر ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہوتے اور ہم، ہم ہوتے یعنی ایسے ہوتے جیسے اب ہیں، اور اگر ایسے نہ ہوتے بلکہ کچھ اور ہوتے (تو اس سے بحث نہیں، کیوں کہ اس وقت ہم، ہم نہ ہوتے) تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہمارے ہونے کا نتیجہ کیا ہوتا کہ جب جہاد کی آیت نازل ہوتی تو ہم کیا کرتے، ذرا دل کو ٹٹول کر دیکھیے کہ اس وقت ہماری کیا گت ہوتی؟ حالت تو یہ ہے کہ رات کو پیشاب کرنے کو بھی اُٹھتے ہیں تو بی بی سے کہتے ہیں ذرا کھڑی ہوجانا، میں پیشاب کرلوں۔ اور آیت میں حکم ہوتا اہلِ فارس کے مقابلہ میں جانے کا جو بڑے ساز و سامان والے اور بڑے لڑنے والے تھے، سوا اس کے کہ اِدھر اُدھر دیکھتے پھرتے ہم اور کیا کرتے۔

پھر ہماری اس حرکت سے حضور ﷺ کو رنج پہنچتا اور نبی ﷺ کو رنج دینے کا وبال جتنا سخت ہے معلوم ہے) تو بجائے اس کے کہ ہم کو اس زمانے میں ہونے سے کچھ فائدہ پہنچتا، سخت سے سخت نقصان پہنچتا۔ خدا جانے ہمارا کیا حشر ہوتا۔ پس بڑی خیر ہوئی کہ ہم اس زمانہ میں نہ ہوئے۔ اور اگر جہاد کی آیت بھی نہ اُترتی تب بھی کبھی تو ایسی صورت ہی پیش آتی کہ حضور ﷺ ہماری کسی بے عنوانی پر خفا ہوتے۔

حضور ﷺ حلیم ہی نہ تھے بلکہ حکیم بھی تھے، سختی کے موقع پر سختی فرماتے تھے:

کیوں کہ حضور ﷺ صرف حلیم ہی نہ تھے بلکہ حکیم بھی تھے، کبھی خفا بھی ہوتے تھے۔ نرمی کے موقع پر نرمی اور سختی کے موقع پر سختی فرماتے تھے، کیوں کہ ہر جگہ نرمی کارآمد نہیں بلکہ ہر چیز اپنے موقع پر ہی کارآمد ہوتی ہے تو حضور ﷺ فضول باتوں پر ناخوش بھی ہوتے تھے۔ اس قسم کے بہت سے قصّے حدیثوں میں موجود ہیں۔ اب سوچیے کہ اس وقت ہم کیا کرتے؟ ہم، ہم لوگوں کی جو کچھ حالت ہے وہ تو معلوم ہے، تو حضرت! جو کچھ محبّت اور جوش ہم اس وقت ظاہر کررہے ہیں جس کی بنا پر حضور ﷺ کے زمانہ میں ہونے کی تمنّا کی جاتی ہے اس کی پوری حقیقت کھل جاتی۔ نیز اگر ہم سے کوئی بے عنوانی ہوجاتی اور فرض کیجیے بطور معالجہ کے کوئی ایسی صورت تجویز فرماتے جس سے مجمع میں ہماری ذلّت ہوتی، اس وقت ہم جیسوں کو کیسی مشکل پیش آتی، کیوں کہ دیکھتے ہیں اس وقت طالبین کی حالت یہ ہے کہ علُما اور بزرگوں اور اُستادوں کے سامنے مُنہ بنانے لگتے ہیں، ذرا سی سختی کے متحمل نہیں ہوتے، مگر یہ حضرات تو نبی نہیں ہیں، ان کے سامنے منہ بنانے کا نتیجہ اتنا ہی ہے کہ ان کے فیوض و برکات اور تعلیم سے محروم رہے۔

نبی کی طرف سے قلب میں کدورت ہونا بھی کفر ہے:

مگر نبی کے ساتھ قلب میں کدورت ہونا، ان کے حکم سے ناگواری لینا تو کفر ہے۔ سو ہمیں اس زمانے میں ہونے سے یہ حاصل ہوتا، اچھے صحابی بنتے کہ اخیر میں کافر اور مرتد ہی بننا پڑتا۔ میں تو یہی کہتا ہوں کہ خدا نے بڑی خیر کی کہ ہم اس زمانہ میں نہ ہوئے ورنہ ہلاک ہی ہوجاتے۔ بس ہماری تو دور ہی کی محبّت ٹھیک ہے، اس وقت دل میں کیا کیا ولولے اٹھتے ہیں۔

حضور ﷺ کے دیدار کا شوق غالب ہے۔ مسلمانوں کا بس نہیں کہ ایک نظر حضور ﷺ کو دیکھ لیں، ورنہ ہر مسلمان کی واللہ! یہ حالت ہے کہ سارا مال اور ساری اولاد حضور ﷺ کے دیدار پر نثار کرنے کو تیار ہے، گو اس میں زیادہ حصّہ زبانی ہی جمع خرچ ہو مگر خیر کچھ تو محبت بھی ہے، مگر اس صورت میں تو قلعی کھل جاتی اور زبانی محبّت بھی نہ رہتی۔

غرض ہمارے مناسب حال یہی ہے کہ ہم حضور ﷺ کے زمانہ میں نہ ہوئے۔ حضور ﷺ کے زمانہ کے مناسب حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم ہی تھے جن کے صدق و محبّت و عشق کے کارنامے دنیا کو معلوم ہیں۔ غرض جس کو جس حال میں خدا تعالیٰ نے رکھا اس کے لیے وہی مناسب تھا۔ اگر مرد عورتیں بن جائیں اور عورتیں مرد، تو خدا جانے کیا کیا آفتیں کھڑی ہو جائیں۔ خدا تعالیٰ نے مختلف قسم کی مخلوقات پیدا کی ہیں اور ہر نوع کو جدا جدا حالات دیے ہیں، سو ہر نوع اسی حالت کے قابل ہے جو اس کے لیے تجویز ہوئی۔ اس مضمون کو کسی نے کیا خوب کہا ہے:

بگوش گل چہ سخن گفتہ کہ خنداں ست
بعندلیب چہ فرمودہٗ کہ نالاں ست

پھول نے کان میں کیا بات کہی کہ وہ تیرا تابع دار ہے اور عندلیب سے کیا کچھ کہا کہ وہ شکوہ کناں ہے۔

آیت ﴿وآتَاكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوْهُ﴾ کی تفسیر:

اہلِ لطافت نے آیت ﴿وآتَاكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوْهُ﴾ کی تفسیر میں فرمایا ہے: أَيْ بِلِسَانِ الْاِسْتِعْدَادِ کہ جس میں جیسی استعداد تھی ویسا ہی اُس کو دیا۔ جب ثابت ہو گیا کہ جس کو حق تعالیٰ نے جو کچھ دیا ہے اس کے مناسب وہی تھا، تو اس کے خلاف کی تمنّا کرنا فضول اور بے کار ہے، بلکہ حق تعالیٰ کے فعل میں اصلاحِ دنیا ہے۔ لہٰذا عورتوں کو یہ تمنّا کرنا کہ ہم مرد ہوتے بے جا ہے۔ اب میں بیان کو ختم کرتا ہوں۔

عورتیں سب باتوں میں گھٹی ہوئی نہیں:

خلاصہ یہ ہے کہ عورتیں ہر طرح مردوں سے گھٹی ہوئی نہیں جیسا عام طور سے مشہور ہے،

بلکہ بعض باتوں میں مردوں کے برابر ہیں یعنی فضائلِ اضافیہ میں، جس کے بارے میں یہ آیت ہے: ﴿ اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ﴾ ۔اور بعض باتوں میں مردوں سے بڑھ سکتی ہیں یعنی فضائلِ مکتسبہ میں، جس کے متعلق یہ آیت ہے: ﴿ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ ﴾ ۔ہاں بعض باتوں میں عورتیں مردوں سے گھٹی ہوئی ہیں اور وہ امورِ خلقیہ ہیں جیسے قوت، شجاعت، تدبیر وغیرہ۔ تو جس بات میں وہ مردوں کے برابر ہیں یعنی عدمِ ضیاعِ عمل اور جس بات میں ان سے کم ہیں یعنی امورِ خلقیہ، یہ دونوں اُن کے اختیار سے خارج ہیں۔ کیوں کہ امرِ اوّل یعنی عدمِ ضیاعِ عمل تو وعدہ ہے حق تعالیٰ کی طرف سے جس میں محض اپنے فضل سے حق تعالیٰ نے عورتوں کو مردوں کے برابر رکھا ہے، تو وہ حق تعالیٰ کا فضل ہے، نہ اُن کا، اور چوں کہ اس کا وعدہ ہے اس لیے اس کی تمنّا کے کچھ معنی نہیں، ہاں دعا اس کے لیے بھی مندوب ہے۔ اور دعا کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم کو اس قابل بنا دیجیے کہ ہم محلِ وعدہ بن سکیں۔ اور امورِ خلقیہ کا خارج عن الاختیار ہونا ظاہر ہے اور چوں کہ ان میں حق تعالیٰ نے مردوں کو فضیلت دی ہے عورتوں پر، لہٰذا اس کے خلاف کی تمنّا کرنا یا وعدہ کرنا بھی جائز نہیں ہے، جیسے عورت تمنّا کرے کہ مرد بن جائے۔

اب رہ گئے وہ امور جن میں عورتیں مردوں سے بڑھ سکتی ہیں۔ ان کا خلاصہ ہے اعمالِ شرعیہ اور اس سے بھی مختصر لفظ ہے دین، سو وہ اختیاری ہے، اس میں جتنی جس کی ہمت ہو ترقی کر سکتا ہے۔ مرد ہمت کریں تو عورتوں سے بڑھ سکتے ہیں، عورتیں ہمت کریں تو مردوں سے بڑھ سکتی ہیں، جس کو شوق ہو ہمت کرے میدان وسیع پڑا ہوا ہے۔

پس عورتوں کو یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ہم لاشی محض ہیں یا دوزخ ہی کے لیے پیدا ہوئی ہیں یا کسی طرح مردوں کے برابر نہیں ہو سکتیں۔ خدا کا فضل بہت وسیع ہے، قدم بڑھاؤ اور ہاتھ پیر مارو۔ اب یہاں سے ایک مسئلہ فقہیہ اور نکلتا ہے، وہ یہ کہ جن باتوں میں حق تعالیٰ نے مرد اور عورت میں فرق رکھا ہے ان میں عورت کو مردوں کے ساتھ برابری ظاہر کرنا اور ان کے مشابہ بننا جائز نہیں۔

تشبہ بالرجال ممنوع ہونے کا ثبوت آیت سے:

اسی کو تشبہ بالرجال کہتے ہیں، یعنی مردوں کی سی صورت، شکل، چال ڈھال اختیار کرنا حرام ہے، مگر آج کل عورتوں میں یہ خبط بھی پایا جاتا ہے۔ وضع قطع میں مرد بننا چاہتی ہیں۔ ان کا بس چلے تو سچ مچ مرد ہی بن جائیں، مگر کیا کریں یہ تو ان کے اختیار سے خارج ہے۔ لہٰذا اتنا ہی کرتی ہیں کہ مردانہ کھڑا جوتا ہی پہن لیں۔ بیبیو! خدا سے ڈرو، کہیں تمہارے ڈاڑھی نہ نکل آوے، خدا تعالیٰ کو کچھ مشکل نہیں۔ یاد رکھو کہ جب حق تعالیٰ نے ان باتوں کی تمنّا کرنے سے بھی منع کر دیا ہے جو مردوں کے ساتھ خاص ہیں تو بتکلف ان کے اختیار کرنے کو کب جائز رکھیں گے؟

ڈاڑھی منڈانے پر عذاب:

ایک شخص کا قصّہ ہے کہ اُس نے ایک دفعہ ڈاڑھی منڈائی۔ حق تعالیٰ کی طرف سے اس کو یہ سزا ملی کہ ڈاڑھی میں بال خورہ لگ گیا، پھر تمام عمر ڈاڑھی نہ نکلی۔ خدا تعالیٰ کو سب کچھ قدرت ہے۔ ان کو اس پر بھی قدرت ہے کہ عورت کے ڈاڑھی نکال دیں یا مرد کی ڈاڑھی ندارد کر دیں، بلکہ عورت سے مرد یا مرد سے عورت بنا دیں۔

ایک عورت مرد بن گئی، اس کے مہر کا مسئلہ:

چناں چہ بہت عرصہ ہوا کہ ضلع اعظم گڑھ سے میرے پاس ایک سوال آیا تھا کہ ایک عورت مرد بن گئی ہے، اب اس کا مہر خاوند کے ذمہ واجب رہے گا یا نہیں؟ اور دیگر حقوقِ واجبہ کا کیا حکم ہے؟ مجھے یہ سوال نہایت ہی منکر معلوم ہوا، کیوں کہ یہ خیال ہوا کہ محض فرضی سوال ہے، بھلا ایسا بھی کہیں ہو سکتا ہے کہ عورت مرد بن جاوے؟ اس زمانہ میں جوانی کا جوش تھا، میں نے ٹھان لی کہ جس طرح ہوگا اس سوال کو حل کر کے رہوں گا۔ چناں چہ ساری فقہ کی کتابیں الٹ ڈالیں اور تمام شِقوں کے جواب دلائلِ فقہیہ سے لکھے۔ اب جب عمر ڈھلی تو مجھے اپنے اس نکیر پر ہنسی آئی کہ اس میں تعجب کی کیا بات تھی؟ خدا تعالیٰ کی قدرت کے سامنے کیا بڑی بات ہے کہ عورت مرد بن جائے۔ چناں چہ بعد میں ایک شخص اسی موضع کے رہنے والے ملے، اُنہوں نے کہا: یہ تو ہمارے گاؤں کا قصّہ ہے اور واقعی وہ عورت مرد بن گئی تھی۔ (بن گئی

کہوں یا یا بن گیا) پھر وہ شخص (شخص کہوں یا شخصہ) حج کو گیا (یا گئی)۔ غرض اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہیں کہ عورت کو مرد، مرد کو عورت کر دیں۔ پس اے بیبیو! اللہ تعالیٰ سے ڈرتی رہو، کہیں تشبہ بالرجال کرنے سے تمہارے منہ پر ڈاڑھی نہ نکل آوے۔

ایک عورت کے ڈاڑھی:

ہم نے لکھنؤ میں ایک تمباکو فروش عورت کو دیکھا ہے، اُس کے ڈاڑھی نکل آئی تھی۔ تو اس میں امکانِ عقلی اور امکانِ وقوعی دونوں موجود ہیں، ممکن ہے کوئی بی بی ایسی بہادر ہوں کہ وہ اس کو بھی گوارا کر لیں اور کہہ دیں کہ اس میں حرج کیا ہے؟ میں کہتا ہوں: بہت اچھا، تم نے اس کو تو گوارا کر لیا، مگر اس کا کیا علاج ہے کہ حضور ﷺ نے ایسی عورت پر لعنت فرمائی ہے جو مردوں کی سی وضع بنائے۔ اس لعنت کو مسلمان کیسے گوارا کر سکتا ہے؟

حدیث میں ہے کہ لعنت کی جنابِ رسول اللہ ﷺ نے اس مَرد پر جو عورتوں جیسی وضع بنائے اور اس عورت پر جو مردوں جیسی وضع بنائے۔ علُما نے اس حدیث سے عورتوں کے لیے کھڑے جوتے کو حرام کہا ہے اور فرمایا ہے کہ عورتوں کو پھڈا جوتا پہننا چاہیے۔ ہمارے قصبات میں تو اُس عورت کو بازاری عورت سمجھا جاتا ہے جس کے پیر میں کھڑا جوتا ہو، مگر شہروں میں ایسی آزادی پھیل گئی ہے۔

عورتوں کو اچکن یا گرگابی پہننا:

بعض شہروں میں عورتیں اُچکن بھی پہنتی ہیں۔ اور یہ رواج تو عام ہو چلا ہے کہ عورتیں گرگابی جوتا پہنتی ہیں۔ اور اس میں قصور عورتوں کا تو ہے ہی، کچھ ڈھیلا پن مردوں کا بھی ہے کہ وہ ان باتوں کو معمولی سمجھ کر عورتوں پر روک ٹوک نہیں کرتے حالاں کہ یہ باتیں خفیف نہیں ہیں۔ لعنت سے زیادہ اور کیا سختی ہو گی؟ جب ان باتوں پر لعنت آئی ہے تو خفیف کیسی؟ مگر یوں کہیے کہ لوگوں کو دین کا اہتمام ہی نہیں۔ سالن میں ذرا نمک تیز ہو جائے تو مرد ایسے خفا ہو جاتے ہیں کہ کھانا نہ کھاوے اور رکابی بی بی کے مُنہ پر دے مارے، اسے مارنے پیٹنے کو کھڑے ہو جاویں، مگر لعنت کے کام پر ذرا حرکت نہیں ہوتی۔ بلکہ بعض مرد تو ایسے آوارہ مزاج ہیں کہ باہر والی

عورتوں کو دیکھ کر ان کے دل میں خود ہی شوق اٹھتا ہے کہ گھر والیوں کو ان ہی جیسا بنائیں۔

افسوس! کہاں گئی ان کی غیرت اور کہاں گئی اُن کی شرافت؟ کیا شریف بیبیوں کو بازاری بنانا چاہتے ہیں؟ گھر میں رہنے والی عورتیں تو بس اول جلول ڈھیلی ڈھالی وضع ہی میں اچھی لگتی ہیں۔ یہ کیا کہ کسی کسائی پھرتی ہیں۔ یہ کوئی سپاہی ہیں جو ہر وقت کمر کسی ہوئی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میلی کچیلی نہ رہیں، کیوں کہ صفائی اور زینت، یہ زوج کا حق ہے۔ مگر یہ مناسب نہیں کہ آستینیں بھی کسی ہوئی ہیں، پاجامے بھی ایسے چست ہیں کہ چٹکی لو تو کھال چٹکی میں آجاوے۔ جوتا بھی چڑھا ہوا ہے۔ یہ کیا لغو حرکتیں ہیں؟ خدا تعالیٰ نے تو تم کو عورت بنایا ہے، تم مرد کیسے بن سکتی ہو؟ یہ تو قلب موضوع ہے۔ بیان بطور تفریح کے ہو گیا ورنہ اصلی بیان ختم کر چکا ہوں۔

خلاصۃ الخلاصہ یہ ہے کہ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مردوں کو عورتوں پر علی الاطلاق فضیلت ہے اور عورت مرد کے مقابلہ میں مطلقاً کوئی چیز نہیں، یہ غلط ہے بلکہ بعضی باتوں میں عورت مرد کے برابر ہے اور بعضی باتوں میں مرد سے بڑھ بھی سکتی ہے۔ یعنی اعمال میں کہ نماز، روزہ زیادہ کرے تو مرد سے زیادہ درجہ حاصل کر سکتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو عورت خاوند سے زیادہ دین دار ہو اس کو خاوند کی اطاعت اور تعلیم لازم نہ رہے گی، بلکہ خاوند کو اس کی اطاعت و تعظیم کرنا پڑے گی۔ یہ مطلب ہرگز نہیں۔ کیوں کہ فضیلت کی دو حیثیتیں ہیں: ایک باعتبار زوجیت کے، اس اعتبار سے عورت کو خاوند پر کسی طرح بھی فضیلت حاصل نہ ہوگی، بلکہ اس حیثیت سے ہمیشہ خاوند ہی کو بی بی پر فضیلت ہے۔ گو حقوق بی بی کے بھی ہیں خاوند پر لیکن خاوند کو بہرحال فضیلت ہے۔ اور ایک فضیلت باعتبار دین اور اعمال کے ہے۔ سو اس میں بی بی خاوند سے بڑھ بھی سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ حق تعالیٰ کے یہاں اس کے احسانات اور درجات زیادہ ہوں کیوں کہ اس کا مدار اعمال پر ہے، مگر اس فضیلت سے بیوی خاوند کی مخدومہ نہیں بن سکتی بلکہ خادمہ ہی رہے گی۔

مگر ہر صورت میں مَردوں کو اپنی بیبیوں کی قدر کرنا چاہیے دو وجہ سے: ایک تو بی بی ہونے کی وجہ سے کہ وہ اُن کے ہاتھ میں قید ہیں اور یہ بات جواں مردی کے خلاف ہے کہ جو ہر طرح اپنے بس میں ہو اُس کو تکلیف پہنچائی جائے۔ دوسرے دین کی وجہ سے، کیوں کہ تم مسلمان ہو

وہ بھی مسلمان ہیں، جیسے تم دین کے کام کرتے ہو وہ بھی کرتی ہیں۔ اور یہ کسی کو معلوم نہیں کہ دین کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک کون زیادہ مقبول ہے؟ یہ کوئی ضروری بات نہیں کہ عورت مرد سے ہمیشہ گھٹی ہوئی ہو، ممکن ہے اللہ تعالیٰ کے نزدیک مرد کے برابر بلکہ اس سے زیادہ ہو۔

پس عورتوں کو حقیر و ذلیل نہ سمجھنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ بے کس اور مجبور اور شکستہ دل کا تھوڑا سا عمل بھی مقبول فرما لیتے اور اس کے درجے بڑھا دیتے ہیں۔ پس کیا عجب ہے کہ جن عورتوں کو تم نے بوجہ اُن کی بے کسی اور بے بسی کے حقیر سمجھ رکھا ہے، اللہ تعالیٰ کے یہاں تم سے زیادہ مقبول ہوں۔ لہٰذا مردوں کو عورتوں کے معاملہ میں خدا سے ڈرنا چاہیے اور عورتوں کو اپنے مردوں کی اطاعت کرنی چاہیے، زبان درازی سے پیش نہ آنا چاہیے۔ بس یہ تھا وہ ضروری مضمون جو میں اس وقت بیان کرنا چاہتا تھا۔ اور اس سے دو قسم کے لوگوں کی اصلاح مقصود ہے: ایک تو عورتوں کی کہ وہ مایوس اور دل شکستہ نہ ہوں، یہ نہ سمجھیں کہ ہم تو دوزخ ہی کے واسطے ہیں۔ دوسرے مَردوں کی کہ وہ بھی عورتوں کو حقیر اور ذلیل نہ سمجھیں۔ اب ختم کرتا ہوں اور نام اس بیان کا ''کساء النساء'' رکھتا ہوں۔ کساء چادر کو کہتے ہیں۔ چوں کہ لباس جسم کے لیے ساتر و محافظ ہوتا ہے اور اس میں ایسے علوم صحیحہ اور اعمال صحیحہ کی تعلیم ہے جو عورتوں کے لیے ہر قسم کی آفتوں سے محافظ اور ساتر ہیں، اس لیے یہ بیان عورتوں کے لیے بمنزلۂ چادر کے ہوا۔ دوسرے اس نام میں قافیہ کی بھی رعایت ہے، اس لیے یہ نام اچھا معلوم ہوا۔ اب دعا کیجیے کہ حق تعالیٰ ہم کو بالخصوص سب عورتوں کو درستئ اخلاق کی توفیق دیں اور سب مسلمانوں کو دین کی پابندی اور صراطِ مستقیم پر پختگی عطا فرمائیں۔ آمین۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا
مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَأَصْحَابِهٖ أَجْمَعِيْنَ.

التماسِ کاتب

احقر نے یہ وعظ اپنی والدہ مرحومہ کے ایصالِ ثواب کے لیے لکھا ہے۔ بتوفیقِ خداوندی اُن کی دِین داری کی یہ حالت تھی کہ والد ماجد تین سال تک علیل رہے، اُن کا اُٹھنا بیٹھنا، کھلانا پلانا سب والدہ کو کرنا پڑتا تھا۔ اور گھر میں اور مریض بھی تھے۔ غرض ایک منٹ کی فرصت ان کو نہ تھی، مگر اسی عدیم الفرصتی کی حالت میں کئی پارے قرآن کے حفظ کیے اور ٹوٹکے ٹونے، شرک و بدعت سے حد درجہ متنفر تھیں۔ گھر میں متعدد موتیں واقع ہوئیں، مگر کسی نے آواز رونے کی نہ سُنی۔ حتی کہ اہلِ محلّہ کہتے تھے کہ یہ عجیب بے حِس بی بی ہیں، نہ اُن پر خوشی کا کوئی اثر ہوتا ہے، نہ غمی کا۔ ناظرینِ وعظ ان کے واسطے اور میرے والد ماجد مرحوم و مغفور کے واسطے دُعا کریں۔

رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِي صَغِيْرًا. رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ
يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابِ. رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ
وَلَاتَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ.

اور اس وعظ کے لکھنے میں میرے ایک مکرّم عبدالحمید صاحب بنارسی نے بہت زیادہ اِعانت کی، بلکہ سچ یہ ہے کہ وہ ہمّت نہ دلاتے تو احقر سے اس کا پورا ہونا ہی ناممکن تھا۔ ناظرین ان کے واسطے بھی دعا فرمادیں۔ اور زیادہ مدد خواجہ عزیز الحسن صاحب کے مسوّدہ سے ملی۔ لہٰذا ان کے واسطے بھی دعائے فلاح دارین کریں۔ اور سب سے زیادہ اس کی ضرورت ہے کہ حضرت حکیم الامت مولانا و مرشدنا مدظلہم العالی کی صحت و تندرستی اور عمومِ فیض اور زیادتِ برکات کے لیے خاص طور سے دُعا کرتے رہیں کہ۔

شکر فیض تو چمن چوں کند اے ابر بہار
کہ اگر خار دگر گل ہمہ پروردہ تست

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ وَ سَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ
وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ٥

قال اللہ تعالیٰ: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ﴾ (النور:۲۳)

الوعظ

المسمّٰی بہ

العاقلات الغافلات

منجملہ ارشاداتِ

حکیم الامت مجدّد الملت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الوعظ

المسمّٰی بہ

العاقلات الغافلات

وقت بیان: ساڑھے تین گھنٹے

تاریخ: ۲۱ ربیع الاول ۱۳۲۷ھ

جامع وعظ: محمد یوسف بجنوری

واقع: گورکھپور ڈپٹی صاحب کی کوٹھی پر مستورات میں ہوا، مرد بھی کچھ شریک تھے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

العاقلات الغافلات

خطبۂ مسنونہ:

الحمد للّٰه نحمدهٗ ونستعينهٗ ونستغفرهٗ ونؤمن به ونتوكل عليه. ونعوذ باللّٰه من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا. من يهده اللّٰه فلا مضل له، ومن يضلله فلا هادی له. ونشهد أن لا إله إلا اللّٰه وحدهٗ لا شريك له. ونشهد أنّ سيدنا ومولانا محمدا عبدهٗ ورسولهٗ، صلى اللّٰه عليه وعلىٰ آله وأصحابه وبارك وسلم.

أما بعد، فأعوذ باللّٰه من الشيطٰن الرجيم. بسم اللّٰه الرحمٰن الرحيم. ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوْا فِی الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾(النور:۲۳).

’’جو لوگ تہمت لگاتے ہیں ان عورتوں کو جو پاک دامن ہیں، ایسی باتوں کی جن سے وہ بے خبر ہیں ایمان والیاں ہیں، ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی جاتی ہے اور ان کو بڑا عذاب ہوگا۔‘‘

مستورات کی خدمت میں درخواست:

قبل اس کے کہ میں اس آیت کے متعلق کچھ عرض کروں، مستورات کی خدمت میں یہ التماس ہے کہ زیادہ تر یہ وعظ آپ ہی لوگوں کی ضرورت سے کیا گیا ہے خصوصیّت کے ساتھ، اس لیے اہتمام کے ساتھ متوجہ ہو کر سنیں، کیوں کہ آپ کو بہت کم موقع ملتا ہے ایسے مضامین سننے کا، بوجہ اس کے کہ مستورات میں لکھی پڑھی بہت کم ہوتی ہیں۔ کیوں کہ ان کو وقت نہیں ملتا اپنی ضرورتوں کی وجہ سے، خواہ واقعی ضرورتوں میں مشغول ہوں یا خیالی ضرورتوں میں۔ بہر حال طرز ایسا ہی واقع ہو رہا ہے جس میں کسی قدر کسل کو بھی دخل ہے اور دوسرے اسباب

بھی ایسے مجتمع ہیں کہ ان کو بہت ہی کم وقت ملتا ہے مضامین سننے کا، ایسے میں اگر کبھی موقع مل جائے تو اس کو غنیمت سمجھنا چاہیے۔

وعظ کی کیا نیت ہے؟

اور وعظ سے جو اصل مقصود ہے اس کو وعظ سننے کے وقت پیشِ نظر رکھنا چاہیے جس کی حقیقت میں بیان کرتا ہوں۔ آپ کو اس کی نیت کر لینا چاہیے۔ اور نیت فعل اختیاری ہے، آپ اس کو درست کر سکتی ہیں۔ اگر پہلے سے کوتاہی واقع ہوئی ہے تو اس وقت اس کی اصلاح کر سکتی ہیں۔ وہ حقیقت یہ ہے کہ وعظ ایک روحانی مطب ہے۔ یعنی باطنی اصلاح کی تدبیروں کا نام ہے جس سے باطنی امراض کا علاج ہوتا ہے، بس یہ حاصل ہے وعظ کا۔ سو جو صاحب وعظ سننے والے ہیں وہ وعظ سننے سے پہلے اپنی نسبت سمجھ رکھیں کہ وہ بیماریوں میں مبتلا ہیں، وعظ سے ان کا علاج بتایا جا رہا ہے۔ بس اس کی تدبیریں سن کر حالت درست کر لینے کا عزم کر لیا جائے۔

لوگوں کی غرضیں وعظ سننے سے مختلف ہیں:

آج کل وعظ سننے سے لوگوں کی غرضیں مختلف ہوتی ہیں۔ چناں چہ بعض کی غرض تو محض ادائے رسم ہی ہوتی ہے، جیسے بہت سے کام دن رات ہوتے ہیں ایسے ہی یہ بھی ایک کام کر لیا۔ بعض کی یہ نیت ہوتی ہے کہ وعظ ایک برکت کی چیز ہے اس کے ہونے سے گھر میں برکت ہو جائے گی۔ اللہ (تعالیٰ) رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لیا جائے گا۔ بعض کی نیت یہ ہوتی ہے کہ شریک ہو کر اتنی دیر گناہوں سے بچے رہیں گے، ثواب لکھا جاوے گا۔ بجز اول نیت کے پچھلی دو نیتیں دین کی ضروری ہیں اور لوگ ان کو بھی کر لیتے ہیں۔

وعظ کی اصلی غرض:

مگر اصلی غایت جو ہے وعظ کی وہاں تک لوگوں کی نظر ہی نہیں۔ اور اس اصلی غرض کا حاصل امراضِ روحانی کا معالجہ ہے۔ یعنی اپنے امراض کو غور کر کے دیکھنا اور اس کی تدبیر کرنا۔ اگر یہ نیت پہلے سے نہ کی ہو تو اب کر لینی چاہیے۔ اور اس نیت سے ثواب بھی ملتا ہے۔ باقی محض تھوڑی دیر کے لیے ثواب ہونے کی غرض سے سنا، تو یہ تھوڑی دیر تک تو نافع ہوگا پھر کچھ

بھی نہیں۔ حق تعالیٰ اپنے کلام میں تصریح فرماتے ہیں:

﴿كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ۝﴾(ص:۲۹)

ہم نے اپنے کلام کو اس واسطے نازل کیا ہے کہ اس میں غور کیا کریں اور اس پر عمل کیا کریں۔

گو اس کی تلاوت میں بھی ثواب ہے اور وہ خالی تلاوت بھی ثواب سے خالی نہیں، مگر اس آیت نے یہ بات بتلادی کہ اصلی غرض صرف یہ ہے کہ مضامین کو سمجھیں اور اس پر عمل کریں۔ مگر ہماری یہ حالت ہے کہ تدبر نہیں کرتے، سوچتے نہیں، ذہن میں مضامین کا تکرار نہیں کرتے۔ حالاں کہ دیکھا جاتا ہے کہ اگر کسی کو خارش کا مرض ہو جاوے اور اس کو کوئی اس کا نسخہ مل جائے تو وہ بار بار اس کو ذہن میں رٹتا ہے تاکہ یاد رہے، پھر اس کا استعمال کرتا ہے محض اس خیال سے کہ خارش بُرا مرض ہے۔ سو اگر اسی طرح سے وعظ کو تھوڑا ہی سنا جائے، مگر اس کو یاد کیا جائے اور اس کا ذہن میں تکرار و اعادہ کیا جائے تو جو سنا جائے گا ضرور یاد رہے گا۔ پھر عمل کا اہتمام کیا جائے تو اس طریقہ سے دو، چار وعظ میں پوری اصلاح ہوسکتی ہے۔ اسی واسطے حق تعالیٰ ایک موقع پر ارشاد فرماتے ہیں:

﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ۝﴾(ق:۳۷)

یعنی جس کے قلب ہو یا کانوں کو متوجہ کرے۔ مراد یہ کہ قلب کو حاضر کرے اور کان لگائے، اس کے واسطے اس میں نصیحت ہے اور ایسے ہی شخص کو نفع ہوتا ہے۔ چناں چہ ایک موقع پر فرماتے ہیں:

﴿وَذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ۝﴾(الذاریات:۵۵)

اور آپ نصیحت کیجیے، کیوں کہ نصیحت ایمان والوں کو نفع دیتی ہے۔

وجہ اس نفع کی وہی ہے کہ وہ قلب حاضر کر کے اور کان لگا کر سنتے ہیں۔

قرآن نافع ہے اور پھر نفع نہیں ہوتا کیا بات ہے؟

خلاصہ یہ کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ وعظ مسلمانوں کو نفع دیتا ہے اور جب وعظ کا نافع

ہونا حق تعالیٰ بیان فرما رہے ہیں تو نعوذ باللہ (ہم اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگتے ہیں)! یہ تو احتمال ہی نہیں ہوسکتا کہ اللہ تعالیٰ کا بیان فرمایا ہوا کوئی امر خلافِ واقع ہو۔ مگر ظاہر میں شبہ ہوتا ہے کہ قرآن شریف سے تو اس کا نافع ہونا معلوم ہوا، مگر باوجود اس کے بعض جگہ نفع نہیں ہوتا، یہ کیا بات ہے؟ تو جواب اس کا یہی ہے کہ نفع کی وہی شرط ہے:

﴿مَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَ هُوَ شَهِيْدٌ۝﴾(ق:۳۷)

جو شخص قلب کو حاضر کرے اور کان لگا کر سنے۔

سو واقع میں یہ شبہ قرآن پر نہیں ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ طبیب کہتا ہے کہ دوا نافع ہے۔ سو معنی اس قول کے یہ ہیں کہ اس کا نفع بعض شرائط کے ساتھ مشروط ہے۔ سو اگر کہیں نفع ظاہر نہ ہو تو یہ نہیں کہ دوا نافع نہیں، نافع یقیناً ہے مگر بوجہ فقدانِ شرائط کے اس کا نفع ظاہر نہیں ہوتا۔

پس جس طرح اطِبّا دوا کی خاصیّت بیان کرتے ہیں اسی طرح حق سبحانہ وتعالیٰ اور جنابِ رسول اللہ ﷺ اعمال کی خاصیّت بیان فرماتے ہیں۔ پس جیسے اس دوا کی غایت کا ظاہر ہونا مشروط ہے بشرائط، اسی طرح اعمال کے لیے بھی شرائط ہیں اور وہ شرط حق تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے۔ چناں چہ ارشاد ہے:

﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ
اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَ هُوَ شَهِيْدٌ۝﴾(ق:۳۷)

یعنی اس میں ایسے شخص کے لیے نصیحت ہے جس کے قلب ہو یا کان لگا کر سنے۔

اور بھی جا بجا قرآن میں ان شرائط کو بیان کیا ہے کہیں ہے یَتَدَبَّرُوْنَ، کہیں ہے یَتَذَكَّرُوْنَ، کہیں ہے یَتَفَكَّرُوْنَ، کہیں ہے لِيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ، کسی جگہ ہے وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ.

وعظ کا نفع کس کو ہوگا؟

یہ آیتیں بتلا رہی ہیں کہ جو شخص سوچے، یاد رکھے، خیال کرے، قصد بھی کرے، ہمت بھی کرے تو اس کو نفع ہوگا۔ اگر کوتاہی ہو جاوے۔ تو توبہ کرے متوجہ ہو جاوے مگر ہماری حالت

یہ ہے کہ نہ سوچتے ہیں، نہ یاد رکھتے ہیں، نہ خیال کرتے ہیں ، نہ قصد ، نہ ہمت ، نہ عمل ، تو نفع بھی نہیں ہوتا۔ سو نفع نہ ہونے پر تعجب کرنا ہی بے بنیاد ہے۔ اور میں تو یہ کہتا ہوں کہ وعظ سے اگر توفیق ہو کر گناہ کم ہونے لگیں تو اتنا نفع کیا کم ہے۔ بلکہ اور ترقی کر کے کہتا ہوں کہ اگر گناہ ترک نہ ہوں محض توبہ کی توفیق ہو کر گذشتہ ہی گناہ معاف ہو جاویں تو خود یہ کتنا بڑا نفع ہے، خواہ پھر گناہ ہی کیوں نہ ہونے لگیں۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ کوئی بخار میں مبتلا ہوتا ہے یا اور کوئی شکایت ہو جاتی ہے موسم میں، ہم نے نہیں دیکھا کہ اس نے علاج نہ کیا ہو محض اس خیال سے کہ اگر اچھا بھی ہو گیا تو اگلے سال پھر بیمار ہو جاؤں گا۔ وہاں تو علاج کو نافع سمجھ کر کر لیا جاتا ہے، مگر یہاں یہ خیال ہوتا ہے کہ ایسی توبہ سے کیا فائدہ کہ پھر گناہ ہو جاوے، اس لیے جب ساری عمر گزر چکے گی اس وقت توبہ کر لیں گے۔

سچ یہ ہے کہ ہم یہی نہیں سمجھتے کہ ہمارے اندر امراض بھی ہیں، ورنہ امراض جسمانی کا سا معاملہ یہاں بھی ہوتا، اور اس وقت وعظ کو وعظ سمجھ کر سنتے۔ اب یہ نہیں، تو یہی وجہ ہے کہ وعظ کا نفع باقی نہیں رہتا۔ دوسری بات یہ قابلِ عرض ہے کہ زیادہ مقصود چوں کہ اس وقت سنانے سے مستورات ہیں، اس لیے مستورات کو چاہیے کہ اس کا خیال رکھیں اور بہت متوجہ ہو کر سنیں۔ یہ مستورات کی خدمت میں عرض تھی مختصر۔

مردوں کی خدمت میں عرض:

اب دوسرے حضرات کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ چوں کہ خطاب سے زیادہ قصد مستورات کے لیے ہے اور بوجہ اس کے کہ مستورات کی تعلیم بھی کم ہوتی ہے، ان کا فہم بھی سادہ ہوتا ہے، ان کے خطاب میں سلاست کی رعایت ضروری ہوتی ہے، اس لیے اور صاحب یہ خیال نہ کریں کہ مضامین علمی ہوں۔

مستورات کی بے احتیاطی:

ایک بات مستورات کے متعلق یہ ہے کہ وعظ میں مستورات پردہ کا خاص اہتمام رکھیں۔ کپڑا پردہ کا ہٹنے نہ پاوے۔ اس واسطے کہ بہت جگہ ایسا دیکھا گیا ہے کہ مستورات

مردوں کے سامنے ہوجاتی ہیں۔ چناں چہ بعض جگہ ایسا ہوا تو میں متحیر رہ گیا۔ اس وقت یہ خلافِ تہذیب گفتگو اس لیے گوارا کی ہے کہ اگر مستورات مردوں کے سامنے ہوتی ہیں تو نظر اور ذہن اس طرف چلنے لگتا ہے، اس لیے ان کو احتیاط رکھنا چاہیے کہ مردوں کے سامنے نہ ہوں۔ ایک بات یہ ہے کہ مرد خیال نہ کریں کہ جب مستورات مخاطب ہیں اور ان کے متعلق بیان ہوگا تو پھر مردوں کو وعظ سے کیا فائدہ ہوا؟ بات یہ ہے کہ اول تو مضامین اکثر مشترک ہوتے ہیں۔ اور اگر فرض بھی کرلیا جائے کہ بعض مضامین عورتوں کے ہی متعلق ہوں گے، تو بھی آپ کو یہ فائدہ ہوگا کہ مستورات کی تعلیم کا طریقہ ہی معلوم ہوجائے گا۔

مردوں کے ذمہ عورتوں کی تعلیم بھی ہے:

اس واسطے کہ آپ حضرات کے ذمہ ان کی تعلیم بھی ہے۔ حدیث میں ہے:

كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْؤُوْلٌ عَنْ رِعِيَّتِهٖ. مرد اپنے خاندان میں اپنے متعلقین میں حاکم ہے۔ قیامت میں پوچھا جائے گا کہ محکومین کا کیا حق ادا کیا؟ اور محض نان ونفقہ ہی سے حق ادا نہیں ہوتا، کیوں کہ یہ کھانا پینا تو حیاتِ دنیا تک ہے آگے کچھ بھی نہیں۔ اس لیے صرف اس پر اکتفا کرنے سے حق ادا نہیں ہوتا۔ چناں چہ حق تعالیٰ نے صاف لفظوں میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا﴾ (التحریم: ٦)

اے ایمان والو! اپنی جانوں کو اور اپنے اہل کو دوزخ سے بچاؤ۔

یعنی ان کو تعلیم کرو، حقوق الٰہی سکھاؤ، ان سے تعمیل بھی کراؤ جب قدرت ہو۔ اس میں آپ معذور نہ ہوں گے کہ ایک دفعہ کہہ دیا رسم کے طور پر پھر چھوڑ دیا۔ آپ ایک دفعہ کہنے میں سبکدوش نہ ہوں گے۔ اگر یہی مذاق ہے تو کھانے میں اگر نمک تیز کر دیں تو اس وقت بھی اسی مذاق پر عمل کیا جائے کہ ایک بار کہہ دیا کہ بی بی! اتنا تیز نمک ہے کہ کھایا ہی نہیں جاتا، یہ کہہ کر فارغ ہوجائے۔ پھر اگر ایسا اتفاق ہو تو کچھ نہ کہیے حالاں کہ وہاں ایسا نہیں کرتے، بلکہ اس پر ناراض ہوتے ہیں۔ اگر پھر کرے تو مارنے کو تیار ہوجاتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ وہاں سکوت سے ضرر سمجھا جاتا ہے اور دین کے معاملے میں یوں کہہ دیتے ہیں کہ جیسا کرے گی ویسا بھرے

گی۔ اور غور سے دیکھیے تو وہاں ضرر ہی کیا پہنچا؟ صرف یہ کہ کھانا بگڑ گیا، اور کچھ زیادہ بات ہوئی؟ یہاں تو دین کا ضرر ہے۔ اب سمجھ لیجیے جیسے سکوت سے وہاں آپ کا ضرر ہے سکوت سے یہاں بھی آپ کا ضرر ہے کہ ان کے متعلق آپ سے باز پرس ہوگی۔ یہ کیا تھوڑا ضرر ہے؟

اب دوسرے مذاق کے اعتبار سے اور گفتگو کرتا ہوں۔ کوئی آپ کا چاہتا بچہ ہو، وہ دوا نہ پیے تو آپ زبردستی دوا پلاتے ہیں، بے مروتی گوارا کرتے ہیں۔ اگر ویسے نہ پیے تو چمچہ سے اس کے منہ میں ڈالتے ہیں اس خیال سے کہ یہ تو بے وقوف ہے، نادان ہے، انجام پر اس کی نظر نہیں، مگر ہم کو اللہ تعالیٰ نے سمجھ دی ہے، وہاں اس کو آزاد نہیں چھوڑتے ہر طرح سے اس کی حفاظت رکھتے ہیں۔ سو کیا وجہ ہے کہ وہاں تو اس مذاق سے کام لیا جاتا ہے اور یہاں نہیں لیا جاتا۔ سچ یوں ہے کہ مردوں نے بھی دین کی ضرورت کو ضرورت نہیں سمجھا۔ کھانا ضروری، فیشن ضروری، ناموری ضروری، مگر غیر ضروری ہے تو دین۔ دنیا کی ذرا ذرا سی مَضرّت کا خیال ہوتا ہے اور یہ نہیں سمجھتے کہ اگر دین کی مَضرّت پہنچ گئی تو کیسا بڑا نقصان ہوگا۔ پھر وہ مَضرت اگر ایمان کی حد میں ہے تب تو چھٹکارا بھی ہو جائے گا مگر نقصان جب بھی ہوگا، گو دائمی نہ ہو۔ اور اگر ایمان کی حد سے بھی نکل گئی تو ہمیشہ کا مرنا ہو گیا۔ اور تعجب ہے کہ دنیا کی باتوں سے تو بے فکری نہیں ہوتی مگر دین کی باتوں سے کس طرح بے فکری ہو جاتی ہے۔ ایک بزرگ نے فرمایا ہے:

چوں چنیں کارے ست اندر رہ ترا
خواب چوں می آید اے ابلہ ترا

جب راہ میں تجھ کو ایسا کام ہے تو بے وقوف تجھ کو نیند کیوں کر آتی ہے۔

بعض کی رائے ہے کہ تعلیم مستورات کو مُضِرّ ہے اور اس کے متعلق طویل بیان:

اور اسی بے فکری کا ایک شعبہ ہے کہ مرد عورتوں کی تعلیم کو اپنے ذمہ ہی نہیں سمجھتے، بلکہ بعض کی رائے تو یہ ہے کہ تعلیم مضر ہے۔ مگر اس کی ایسی مثال ہے کہ کسی نے اپنے گھر والوں کو کھانا کھلایا، اتفاق سے بی بی بچہ سب کو ہیضہ ہو گیا۔ اب آپ نے رائے قائم کی کہ کھانے پینے سے تو ہیضہ ہو جاتا ہے اس لیے سب کا کھانا پینا بند۔ اور دل میں جما لیا کہ کھانے کے برابر کوئی

بُری چیز نہیں۔ سو تعلیم سے اگر کسی کو ضرر پہنچ گیا تو یہ تعلیم کی بدتدبیری سے ہے نہ کہ تعلیم سے۔

مستورات کو کیا تعلیم ہونی چاہیے؟

ہاں یہ امر زیر بحث ہے کہ کون سی تعلیم ہونی چاہیے۔ مختصر یہ ہے کہ تعلیم دین کی ہو۔ ہاں حساب کتاب کی، گھر کا یا دھوبی کے کپڑے لکھنے اس کی ضرورت بھی ان کو واقع ہوتی ہے۔ سو اتنا حساب کتاب بھی سہی۔ اور فی نفسہٖ مردوں کو بھی دنیوی تعلیم کی ضرورت نہ تھی، مگر معاش کی ضرورت نے مجبور کر دیا۔ اور اگر محض اس ضرورت سے آگے کمال حاصل کرنے کے لیے ان کو تعلیم دی جاتی ہے، تو بھلا یہ بھی کوئی کمال ہے کہ فلاں راجہ مر گیا، فلاں بادشاہ فلاں سن میں ہوا تھا، فلاں جگہ اتنے دریا ہیں، فلاں موقع پر اتنے گاؤں ہیں۔ کلکتہ ایسا شہر ہے، بمبئی میں اتنی تجارت ہوتی ہے۔ اور اگر اس کو بھی کمال سمجھ لیا جائے۔

کمال جب ہے کہ مضر نہ ہو:

سو کمال بھی جب ہی معتبر ہوتا ہے جب کہ مضرت نہ ہو۔ ہم تو مشاہدہ کرتے ہیں کہ اس نئی تعلیم سے مضرت پہنچتی ہے اور عورتوں کو بہت ہی زیادہ، اس وجہ سے ان کی تعلیم میں تو یہ امور ہرگز بھی نہ ہونے چاہییں۔ اسی طرح ہر وہ تعلیم جس سے دینی ضرر پیش آئے۔ رہا ضروری تعلیم کے بعد اگر آپ کی سوئے تدبیر سے ضرر ہو گیا تو آپ کا یہ حکم لگانا کہ تعلیم مضر ہے غلط ہے۔

تعلیمِ دین مضر ہو ہی نہیں سکتی:

تعلیمِ دین تو مضر ہو ہی نہیں سکتی، جب اس کے لیے ایسے فضائل ہیں اور اس کے منافع دیکھے بھی جاتے ہیں تو پھر وہ کیسے مضر ہو سکتی ہے۔ غرض یہ کہ تعلیم عورتوں کی مردوں کے ذمہ ہے۔ ان کی ذمہ داری صرف کھانا کپڑا دینے سے پوری نہیں ہوتی۔ پس اس سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ تعلیم ضروری ہے۔

عورتوں کی تعلیم کا کیا طریقہ ہے؟

اب اس کا بیان ہونا چاہیے کہ اس کا طریقہ کیا ہے؟ اس سے مردوں کو یہ نفع ہو جائے گا کہ نصابِ تعلیم معلوم ہو جائے گا۔ اس کا انتظام کر سکیں گے۔ اور مرد اگر تدبر سے کام لیں تو یہ

مضامین بچوں عورتوں مردوں سب کے لیے نافع ہو سکتے ہیں، اگرچہ ظاہراً خاص ہیں مستورات کے ساتھ۔ پس میں نے جو آیت تلاوت کی تھی:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوْا فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌo﴾(النور: ۲۳)

جو لوگ تہمت لگاتے ہیں ان عورتوں کو جو پاک دامن ہیں اور ایسی باتوں سے بے خبر ہیں، ایمان والیاں ہیں، ان پر دنیا و آخرت میں لعنت کی جاتی ہے اور ان کو بڑا عذاب ہوگا۔

اس میں یہی ضروری تعلیم مذکور ہے۔ اور یہ آیت خاص واقعہ میں نازل ہوئی ہے۔ اس واقعہ کے تو بیان کرنے کی ضرورت نہیں، کیوں کہ میں حکایت بیان کرنے کے لیے نہیں بیٹھا ہوں، بلکہ ان واقعات میں جو فیصلہ کیا گیا ہے اور وہ فیصلہ ہے ضرورت عامہ کا، اس کے بیان کی ضرورت ہے۔

غرض آیت گو ایک واقعۂ خاص میں نازل ہوئی ہے مگر مخصوص نہیں ہے اس واقعہ کے ساتھ، کیوں کہ ہر واقعہ کے لیے ایک قانون ہوتا ہے۔ سو اگر قانون اس واقعہ کے قبل بنا ہوا ہے تب تو فبہا، اور اگر بنا ہوا نہیں تو اس کے لیے قانون بنایا جاتا ہے اور جب تک حکومت رہتی ہے وہ قانون جاری رہتا ہے۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ واقعات کا انحصار ہو ہی نہیں سکتا، اس لیے قوانین کلیہ بنائے جاتے ہیں تاکہ ضرورت کے واقعات کو ان قوانین میں داخل کر سکیں۔

فقہا کے اس قول کا راز لا عبرة لخصوص بل لعموم الألفاظ:

اس سے فقہا کے اس کہنے کا راز معلوم ہو گیا کہ لَا عِبْرَةَ لِخُصُوْصِ الْمَوْرِدِ بَلْ لِّعُمُوْمِ الْاَلْفَاظِ یعنی خصوصِ مورد کا اعتبار نہیں، بلکہ عمومِ الفاظ کا اعتبار ہے۔ مثلاً کوئی آیت کسی خاص موقع میں نازل ہوئی تو وہ اسی موقع کے ساتھ خاص نہ ہوگی بلکہ جو واقعہ بھی اس کے مثل پیش آئے گا تو وہ اس کو بھی شامل ہوگی۔ جیسے:

﴿وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ o الَّذِیْنَ اِذَا اکْتَالُوْا عَلَی النَّاسِ یَسْتَوْفُوْنَ o وَاِذَا کَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ یُخْسِرُوْنَo﴾(المطففین: ۱۔۳)

بڑی خرابی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کی کہ جب لوگوں سے ناپ کرلیں تو پورا لیں اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیں تو گھٹا دیں۔

بعض اہلِ کیل ووزن کے بارے میں نازل ہوئی ہے مگر ان ہی کے ساتھ خاص نہ ہوگی، جو بھی کم ناپے گا، تولے گا سب کو اس آیت کی وعید شامل ہوگی۔ اسی طرح بہت سی آیات ہیں کہ مورد ان کا خاص ہے مگر حکم عام ہے۔ اور یہ عقلی مسئلہ ہے، اس میں زیادہ تفصیل کرنے کی حاجت نہیں۔ اسی طرح یہ آیت باوجود یہ کہ واقعۂ خاص میں نازل ہوئی، مگر حکم عام ہے۔

آیت میں ایک مضمونِ خاص بیان ہوا ہے:

اب سمجھنا چاہیے کہ حق تعالیٰ کیا فرماتے ہیں؟ حق تعالیٰ اس آیت کے اندر ایک مضمون خاص بیان فرماتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ جو لوگ تہمت لگاتے ہیں ان عورتوں کو جو محفوظ ہیں اور جنہیں خبر نہیں اور ایمان والیاں ہیں، ان پر دنیا میں بھی لعنت ہوگی اور آخرت میں بھی اور ان کے لیے بڑا عذاب ہوگا (آخرت میں)۔ یہ تو ترجمہ کا حاصل ہے کہ پاک عورت کو تہمت لگانے والے پر لعنت ہے۔ اب سمجھیے کہ کسی کلام سے جو مقصود ہوتا ہے اس کو اصطلاح میں عبارۃ النص کہتے ہیں اور وہ مقصود ہی ہے جو ترجمہ کے حاصل میں بیان کیا گیا، مگر مجھ کو اس وقت اس مقصود کا بیان کرنا مقصود نہیں ہے، بلکہ اس کا ایک اور مدلول بھی ہے جو مقصود نہیں مگر آیت اس پر دلالت کرتی ہے جس کو اصطلاح میں اشارۃ النص کہتے ہیں۔ اس وقت اس کا بیان کرنا مقصود ہے۔ اور وہ مضمون یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اس آیت میں عورتوں کی اچھی صفات بیان کی ہیں اور وہ صفات اعلیٰ درجہ کی ہیں۔ مجھ کو ان صفات میں گفتگو کرنا مقصود ہے تاکہ عورتیں اپنے اندر ان صفات کے پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

عورتوں کی تین صفات کا بیان آیت میں:

سو آیت میں غور کرنے سے اور لفظوں کے دیکھنے سے وہ تین صفات ہیں، جن سے متصف ہونے والیوں کو تہمت لگانے والے پر لُعِنُوْا کو مرتب کیا ہے۔ تو وہ صفات پیدا کرنی چاہییں۔ پس ایک صفت اَلْمُحْصَنٰتُ ہے، ایک صفت اَلْغٰفِلٰتُ ہے۔ ایک صفت

اَلْمُؤْمِنٰتُ ہے۔ حاصل ترجمہ محصنات کا ہے پارسا عورتیں، اور لفظی ترجمہ ہے حفاظت کی گئیں، یعنی ان کو پارسائی کے خلاف باتوں سے محفوظ رکھا گیا۔ دوسری صفت یہ ہے غافلات، یعنی بے خبر بھولی بھالیاں۔ تیسری صفت مؤمنات یعنی ایمان والیاں۔

آیت میں المحصنات کو کیوں مقدم کیا المؤمنات پر:

سو آیت میں بظاہر یہ صفات منتشر یعنی غیر مربوط اور غیر مرتب معلوم ہوتی ہیں، کیوں کہ پہلے المحصنات ہے، پھر الغافلات اور پھر المؤمنات، حالاں کہ ظاہراً مقتضائے ترتیب یہ تھا کہ المؤمنات کو پہلے لاتے کیوں کہ ایمان کا درجہ مقدم ہے سب چیزوں سے، مگر ایسا نہیں کیا بلکہ محصنات کو مقدم کیا مؤمنات پر اس میں ضرور کوئی بڑا نکتہ ہے۔

بات یہ ہے کہ کلام حق تعالیٰ کا ضروری رعایتوں کا نہایت جامع ہے اور اس میں اس قدر تدقیق ہے کہ ضروریاتِ اصلاح کے متعلق جتنے امور ہیں ان کا ضبط اس میں اس قدر کافی ہے کہ کسی کلام میں نہیں ہوسکتا۔ پس نظر غائر کرنے سے یہ صفات آپس میں مربوط بھی ہیں، یعنی ان میں باہم علاقہ بھی ہے اور مرتب بھی ہیں۔

انسان میں دو کمال ہیں قوت علمیّہ وعملیہ:

اس کے (سمجھنے) لیے پہلے ایک مقدمہ بیان کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ انسان میں دو کمال پیدا کیے گئے ہیں اور ان ہی کمالات کو بڑھانا انسان کو ضروری ہے: ایک کا نام قوتِ علمیّہ اور دوسرے کا قوتِ عملیہ، اور کوئی شخص ایسا نہیں جو اس میں اختلاف رکھتا ہو، خواہ وہ دنیا کا طالب ہو یا دین کا طالب ہو، وہ دنیا دار ہو یا دین دار، وہ جاہل ہو یا عالم، وہ منطقی ہو یا فلسفی ہو، آخر کوئی نہ کوئی کام تو کرے ہی گا۔ اور کرنے کا تعلّق قوتِ عملیہ سے ہے۔ اگر قوت عملیہ نہ ہو تو اس کام کو کر ہی نہ سکے گا، اور قوتِ علمیّہ سے اس کی حقیقت جانے گا۔ اور اگر اتفاقی طور پر اس طرح کرے کہ قصد کو اختیار کو اس میں دخل ہی نہ ہو تو وہ بحث سے خارج ہے۔ مثلاً کوئی تجارت کرتا ہے تو اس کو ایک تو تجارت کے اصول جاننے چاہییں اور پھر وہ اصول برتنا چاہیے۔ کوئی شخص کھیتی کرتا ہے تو پہلے طریقہ کھیتی کا معلوم کرے، پھر کھیتی کرنا چاہیے۔ اسی طرح نوکری ہے

کہ پہلے اس کے اصول جاننا چاہیے۔ اس کے بعد قوت عملیہ سے کام شروع ہوتا ہے۔ میں کہاں تک مثالیں عرض کروں۔ یہ بات اس قدر ظاہر ہے کہ زیادہ مثالوں کی محتاج نہیں۔ غرض انسان میں ایک قوتِ علمیّہ ہے جس سے نفع وضرر کو پہچانتا ہے، دوسری قوتِ عملیہ ہے۔ اور انسان میں اصل بھی دو کمال ہیں، باقی جتنے کمال ہیں وہ سب اسی کی فرع ہیں۔ اور عورتیں بھی اسی حکم میں داخل ہیں، پس ان کے کمالات بھی یہی دو ہوں گے۔ ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔

قرآن شریف میں دینی کمالات مذکور ہوں گے، دنیوی نہیں:

دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ قرآن شریف میں اور اسی طرح جتنی کتابیں دین کی ہیں، ان میں ان ہی کمالات سے بحث ہوگی جو دین کے متعلق ہوں گے، گو دنیا کے کمالات کی تحصیل بھی ناجائز نہیں۔ سو قرآن شریف کے دو کام ہوں گے: ایک تو کمالات دینی کا بتلانا، دوسرا جس عمل میں مضرت آخرت کی ہو اس سے روکنا۔ جیسے طبیب کا کام ایک پرہیز کا اور دوسرے دوا کا بتلانا ہے۔ یہ اس کے ذمہ نہیں کہ لذیذ کھانوں کی ترکیب بتلایا کرے۔ حکیم محمود خان کے ذمہ یہ ہے کہ دوا اور پرہیز بتلادیں، گلگلہ پکانے کی ترکیب بتلانا، یہ کام حکیم محمود خان کا نہ ہوگا۔ اگر مریض نے اجازت چاہی کسی کھانے کی، تو ترکیب اس کھانے کی خوان نعمت میں ملے گی۔ طبیب ہونے کی حیثیت سے ترکیب کھانے کی ان کے مطب میں نہ ملے گی۔ اگر کوئی ان سے کھانے کی ترکیب پوچھنے لگے تو ان کے جواب کا حاصل یہ ہوگا کہ ہمارا کام یہ نہیں ہے۔ جاؤ، کسی باورچی سے سیکھو۔ اگر خوش ہوکر بتلا دیں تو یہ ان کی عنایت ہوگی مگر ان کے ذمہ نہیں۔ ہاں ان کا یہ منصب ہے کہ جو چیز مریض کو مضر نہ ہو اس کی اجازت دے دیں، اور اگر مضر دیکھیں تو روک دیں۔

قرآن شریف کے ذمہ دو چیزیں ہیں:

اسی طرح سے عُلما کے ذمہ جو کہ قرآن شریف کے نقل کرنے والے ہیں، یا یوں کہیے کہ قرآن شریف کے ذمہ دو چیزیں ہیں: ایک امراض روحانی کی دوا بتلانا، اور دوسرے پرہیز بتلانا۔ یہ اس کے ذمہ نہیں کہ وہ دنیا کے کمالات کے طریقے بتلایا کرے کہ ربیع میں فلاں چیز

بوتے ہیں، خریف میں یہ بوتے ہیں۔ مشین یوں چلتی ہے، گھڑی یوں بنتی ہے۔ گھر یوں تیار ہوتا ہے کپڑا یوں بنایا جاتا ہے۔ یہ قرآن شریف کے ذمہ نہیں ہے۔ ہاں اگر آپ ان چیزوں کو کمال سمجھیں تو قرآن شریف اجازت دیتا ہے کہ ان کے کرنے میں حرج نہیں؟ مگر یہ اجازت ہی تک ہے کہ آخرت کی مضرت نہ ہو۔ جیسے طبیب جب کسی غذا میں مریض کے لیے مضرت دیکھتا ہے تو اس کو فوراً روک دیتا ہے۔ اسی طرح شریعت جس وقت دیکھے گی کہ فلاں امر میں مضرت ہے آخرت کی اور یہ بات مریض روحانی کو مضر ہوگی تو فوراً روکے گی۔ سو قرآن شریف کی تعلیم کافی ضرور ہے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس میں زراعت بھی ہو، تجارت بھی ہو، مشین چلانے کی ترکیب بھی ہو، کپڑا بُننے کا طریقہ بھی ہو۔ بلکہ اس میں آخرت کے قوانین ہیں، بعض تو مُفَصَّل ہیں اور جہاں کلام اللہ مُجمل ہے وہاں حدیث سے اس کی تفسیر ہوگئی، اور یہ سب قرآن شریف ہے جو مختلف رنگ میں ظاہر ہو رہا ہے۔ باقی یہ کہ اس میں تجارت بھی ہو، زراعت بھی ہو، سو یہ عیب ہے کسی فن کی کتاب کے واسطے کہ اس میں مقصوداً دوسرے فن کے مسائل ہوں۔ مثلاً طبِّ اکبر میں امراض کا بیان ہے اس لیے کہ وہ طب کی کتاب ہے۔

ایک شخص نے خیال کیا کہ کبھی ضرورت جوتے سینے کی پڑ جاتی ہے، کبھی ضرورت تجارت وزراعت کی بھی واقع ہو جاتی ہے، اس لیے اس نے طبِّ اکبر میں یہ تصرف کیا کہ شروع میں دو ورق تو امراضِ رأس کے لکھے، پھر جوتیاں سینے کا بیان لکھ دیا۔ پھر دو ورق امراض حلق کے لکھ دیے، اس کے بعد تجارت یا زراعت کے متعلق کچھ لکھ دیا۔ پھر دو ورق امراض معدہ کے لکھے، پھر کچھ مضمون کپڑا سینے کا لکھ دیا۔ بتلایئے انصاف سے کہ ایسی کتاب کو دیکھ کر عُقلا کیا کہیں گے؟ ظاہر ہے کہ سب مذاق اڑائیں گے اور ظاہر ہے کہ یہ طب اکبر کا کمال نہ ہوگا۔ اس کا کمال تو یہی ہے کہ اس میں طب ہی کے مسائل ہوں۔ اسی طرح قرآن شریف میں اگر ایسا ہوتا تو قرآن شریف کا کمال نہ ہوتا۔ اس کا کمال تو یہی ہے کہ اس میں دین کے طریقے بتلائے جائیں۔ ہاں معاش سے ممانعت نہ ہونی چاہیے جب کہ طریقۂ مباحہ سے ہو۔ مقصود میرا یہ ہے کہ میں اپنی اس وقت کی تقریر میں جب لفظِ کمال کہوں گا تو اس سے کمال دینی مراد ہوگا۔

کمالِ دینی دو چیزیں:

سو کمالِ دینی دو چیزیں ہیں :۱۔قوتِ علمیّہ اور۲۔قوتِ عملیہ۔ اور یہی دو کمال عورتوں کے لیے بھی ہیں۔ پس حق تعالیٰ نے اس مقام پر تین کلمے ارشاد فرمائے ہیں :ایک **المحصنات** یعنی حفاظت سے رکھی ہوئی، بچائی ہوئی عورتیں۔ دوسرا **المؤمنات** یعنی ایمان والی، تصدیق کرنے والی عورتیں۔ میں پہلے ان ہی دو کلموں کو لیتا ہوں۔(**الغافلات** کا بیان آئندہ ہے)

سو سمجھیے کہ ایمان نام ہے خاص علوم کا، یعنی اللہ تعالیٰ نے جن باتوں کی اطلاع رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت دی ہے، ان باتوں کو سچّا جاننا۔ ان علوم کا نام درجۂ یقین میں ایمان ہے۔ پس اس ایک لفظ میں اشارہ ہے قوتِ علمیّہ کی طرف یعنی **المؤمنات** میں۔ اور دوسرے میں اشارہ ہے قوتِ عملیہ کی طرف یعنی **المحصنات** میں، اور یہ دونوں کمال جب عورتوں کی طرف منسوب ہیں تو معلوم ہوا کہ جیسے مرد کامل ہوسکتے ہیں اسی طرح سے عورتیں بھی کامل ہوسکتی ہیں، اور جیسے مردوں کی نوع میں تفاوت ہے ایسے ہی عورتوں کی نوع میں بھی تفاوت ہے۔

عورتیں اپنی نوع کی اعتبار سے کامل ہوسکتی ہیں نہ کہ مردوں کی نوع سے:

اور عورتوں کے کمال کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مرد جیسے کامل ہوتے ہیں یہ ویسی ہوجائیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اپنی استعداد کے موافق کامل ہوسکتی ہیں، خواہ مردوں کے برابر نہ ہوں۔ اور عورتوں کے کمال کے حکم پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ یہ تو بروئے نص ناقص ہیں، پھر ان کو کامل کیسے کہا جاسکتا ہے؟ بات یہ ہے کہ عورتوں میں دو قسم کے نقصان ہیں: ایک تو مردوں کی نوع کے مقابلے میں، سو اس کا تدارک تو غیر اختیاری ہے اور اکتساب کو اس میں دخل نہیں۔ اور ایک اپنی نوع کے لحاظ سے، اس کا تدارک ہوسکتا ہے اور وہ مکتسب اور اختیاری ہے اور یہ نقصان مبدل بہ کمال ہوسکتا ہے۔ بہرحال عورتوں کو بھی ایک کمالِ علمی حاصل ہوسکتا ہے جس کو ایمان کہا گیا ہے۔ دوسرا کمالِ عملی حاصل ہوسکتا ہے جس کو احصان فرمایا گیا ہے۔

مقصود علم سے عمل ہے:

اور چوں کہ ایمان نام ہے علوم خاصہ کا اور علم مقدم ہوتا ہے عمل پر، اس لیے اس کا مقتضی یہ تھا کہ **المؤمنات** کو مقدم لایا جاتا **المحصنات** پر، مگر **الحصنات** کو مقدم لانے میں اشارہ اس طرف ہے کہ علم مطلقاً فی نفسہٖ مقصود نہیں بلکہ اس کا زیادہ حصّہ ذریعہ ہے عمل کا اور مقصود علم سے عمل ہی ہے۔

پس چوں کہ اس اعتبار خاص سے عمل مقدم ہے علم پر، اس لیے **المحصنات** کو پہلے لائے اور **المؤمنات** کو بعد میں۔ یہاں یہ نکتہ ہے مقدم لانے میں۔ اور اعتبارِ خاص سے میں نے اس لیے کہا کہ دوسرے اعتبار سے علم مقدم ہے عمل پر، وہ یہ کہ بدوں علم کے عمل نہیں ہوسکتا۔ مگر ہیں دونوں ضروری، علم بھی عمل بھی۔ یہ نہیں کہ جو شخص عمل نہ کرتا ہو وہ علم بھی حاصل نہ کرے، جیسا بہت لوگ سمجھتے ہیں کہ جب عمل ہی نہیں ہوسکتا تو احکام جاننے سے، وعظ سننے سے کیا فائدہ؟

بات یہ ہے کہ جب دونوں فرض ہیں تو جس نے علم حاصل کیا گو عمل نہ کیا تو وہ ایک ہی جرم کا مجرم ہوا، کیوں کہ اس نے ایک ہی ضروری چیز کو چھوڑا۔ اور جس نے علم بھی حاصل نہ کیا وہ دو جرم کا مجرم ہوا، کیوں کہ اس نے دو ضروری چیزوں کو ترک کیا۔ اور اس کا یہ عذر مقبول نہ ہوگا کہ علم اس لیے حاصل نہیں کرتا کہ علم سے پھر عمل کرنا پڑے گا کیوں کہ عمل تو پھر بھی فرض رہے گا۔

ایک حکایت:

اس جاہلانہ عقیدہ پر ایک حکایت یاد آئی۔ ایک شخص نے مسئلہ سنا تھا کہ چاند دیکھ کر روزہ فرض ہوجاتا ہے۔ آپ گھر کے اندر گھس کر بیٹھ رہے۔ کواڑ بند کرلیے کہ نہ چاند دیکھوں گا، نہ روزہ فرض ہوگا۔ کئی روز وہیں گزر گئے۔ وہاں ہی کھانا، وہاں ہی ہگنا، بی بی پائخانہ اٹھاتے اٹھاتے تنگ ہوگئی۔ بس ہاتھ پکڑ کر نکال باہر کیا۔ جنگل میں آپ پہنچے، قضائے حاجت کی ضرورت ہوئی، تالاب کے کنارہ پر پہنچے، سر جھکائے ہوئے تھے کہ کہیں چاند پر نظر نہ پڑ جائے، بے چارہ اتنا جانتا نہ تھا کہ پانی کے اندر عکس ہوتا ہے۔ تالاب کے کنارے بیٹھے تو پانی میں چاند نظر پڑا اور روزہ فرض ہوگیا۔ آپ کہتے: بھلے ہیں، ہم تو تجھے دیکھتے نہیں، تو زبردستی آنکھوں

میں گھسا جاتا ہے۔

پس جیسے اس نے سمجھا تھا کہ جو چاند نہ دیکھے روزہ فرض نہیں ہوتا، ایسے ہی بعضے لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر علم حاصل نہ کریں گے تو عمل ہی فرض نہ ہوگا۔ سو یاد رکھیے کہ فرض دونوں چیزیں ہیں: علم بھی، عمل بھی۔ اور اس اعتبار سے علم کا حاصل کر لینے والا گو اس نے عمل نہ کیا ہو اس سے اچھا ہے جس نے علم وعمل دونوں حاصل نہ کیے ہوں، ہاں زیادہ مقصود بے شک عمل ہے۔ اور اسی وجہ سے اَلْمُحْصَنَاتُ کو مقدم لائے اَلْمُؤْمِنَاتُ پر، گویا اس میں عمل کی مقصودیت کی طرف اشارہ کر دیا کہ ہم یہاں اس کو اس لیے مقدم کرتے ہیں کہ عمل کو زیادہ مقصود سمجھو۔

ان کا رد جو محض تعلیم کو مقصود سمجھتے ہیں، عمل کو نہیں:

اور اس میں رد ہو گیا ان لوگوں کا جو محض تعلیم ہی کو مقصود سمجھتے ہیں اور عمل کا اہتمام نہیں کرتے۔ چناں چہ بعض لوگ علم دین حاصل کر کے سمجھتے ہیں کہ ہم نے بڑا کمال حاصل کر لیا۔ میں نے اس مذاق کے عُلما دیکھے ہیں کہ بس علم حاصل کر کے اپنے کو سب کچھ سمجھنے لگتے ہیں اور سارے مسلمانوں کو ہیچ در ہیچ سمجھتے ہیں اور ان کو ناز ہوتا ہے اپنے علم پر۔ حق تعالیٰ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں فرماتے ہیں:

﴿فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ﴾ (المؤمن: ۸۳)

کہ جو علم تھا ان کے پاس تھا اس پر اترانے لگے۔

اور خاص کر عورتیں جو ذرا بھی تعلیم یافتہ ہو جاتی ہیں ان کے ناز کا تو انتہا ہی نہیں رہتا۔ حالاں کہ ان کا نصابِ علمی بس یہ ہے کہ قرآن شریف پڑھ لیا۔ اس کے بعد اگر بہت معراج ہوئی تو قرآن شریف کے ترجمہ کا شوق ہوا، مگر نرے ترجمہ سے کیا ہوتا ہے، تاوقتیکہ کوئی عالم تفسیر نہ بتلائے۔ بس عورتیں اتنا پڑھ کر عالم فاضل ہو گئیں، سمجھنے لگیں کہ ہم بھی کچھ ہیں۔

بعض کتابیں محض بے اصل ہیں:

اس کے بعد وہ یہ کرتی ہیں کہ اردو کی کتابیں خرید لیں۔ ناول خرید لیے، معجزہ آلِ نبی

خرید لیا۔ خدا جانے یہ کس نے گھڑا ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نسبت، اس میں تو اہانت ہے ان کی۔ اس میں لکھا ہے کہ آپ کے یہاں ایک فقیر آیا تھا۔ آپ نے اپنے صاحب زادوں کو ہبہ کر دیا تھا، محض مہمل قصّہ ہے، مگر چھپا ہوا موجود ہے۔ عورتیں شوق سے منگاتی ہیں اور سمجھتی ہیں کہ اس میں بڑا ثواب ملتا ہے۔ بزرگوں کے قصّے ہیں۔ مصنّف بندۂ خدا نے یہ نہ سوچا کہ آزاد شخص پر یہ تصرّف کب صحیح ہے۔ اور خود حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کی بھی اہانت ہے کہ ان کو غلام بنایا گیا، اور بہت سے اسی قسم کے قصّے ہیں، مثلاً ساپن نامہ، درخت کا معجزہ۔ ایک چہل رسالہ چھپا ہے اس میں ایسے ایسے بے ہودہ قصّے ہیں کہ جن کا سر نہ پاؤں، اور پھر تعریف یہ کہ بعضے قصوں کی نسبت لکھا ہے کہ جو اُن کو پڑھے گا اس پر دوزخ کی آنچ حرام ہو جائے گی۔ یا یہ عورتیں نعت کی کتابیں منگاتی ہیں اور ان میں کہیں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی ہوتی ہے، کہیں حق تعالیٰ کی شان میں گستاخی ہوتی ہے۔ گویا ان مداحین کو ساری شریعت ہی معاف ہوگئی، جس کی شان میں چاہا گستاخی کر دی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں، اللہ تعالیٰ کی شان میں۔

غرض ان کتابوں میں بہت سے اشعار خلاف شریعت ہیں جن کا پڑھنا بھی جائز نہیں۔ غرض یہ نصاب ہے عورتوں کی تعلیم کا، اس نصاب پر ناز ہے۔ اور اگر نصاب کامل بھی ہوتا تو بھی ناز کرنا کہاں زیبا تھا؟ چہ جائیکہ نصاب بھی ایسا پاکیزہ؟ اور علم پر ناز ہی کیا، اتنا تو سمجھنا چاہیے کہ ہر جاننے کا کوئی نتیجہ بھی تو ہوتا ہے۔ ایک شخص کہتا ہے کہ میں تجارت کے طریقے جانتا ہوں، مگر اس پر عمل نہیں کرتا تو ایسے شخص پر تو زیادہ حسرت ہوتی ہے۔ خوب سمجھنا چاہیے کہ نرے علم پر ناز کرنا ہی نادانی ہے، اور اگر اس پر عمل ہوا تو وہ عمل ہی ناز کے ترک کو مستلزم ہے۔ خلاصہ یہ کہ حق تعالیٰ نے اَلْمُحْصَنَاتُ کے تقدم سے بتلا دیا ہے کہ نرا علم کچھ مفید نہیں۔

بعض نے صرف ایمان پر کفایت کر لی ہے، اس کے متعلق عجیب تحقیق:

اور علم کے ناکافی ہونے کی تقریر کی ایک فرع اور ہے۔ وہ یہ کہ جیسے آج کل اس مذاق کے لوگ نرے علم کو کافی سمجھتے ہیں اسی طرح بہت لوگ اس مذاق کے بھی ہیں کہ جو یوں کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے جو کہ ایک فرد ہے علم کا، بس اپنے اعمال سے سبکدوش ہو گئے اور اس مذاق پر استدلال کرتے ہیں کہ:

مَنْ قَالَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ.

جس نے لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ کہا وہ جنّت میں داخل ہوا۔

بس اللہ تعالیٰ کو اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو سچّا سمجھیے، پھر جو چاہے کریے، میں کہتا ہوں: یہ بتلایئے اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی رحیم ہے؟ جواب بھی یہی ہوگا کہ نہیں! رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کوئی شفیق ہے؟ جواب یہی ہوگا کہ نہیں! جب یہ ہے تو معاملۂ رحمت وشفقت کا اثر تو یہ ہونا چاہیے کہ ایسے شفیق ورحیم کا بتلایا ہوا کام کوئی دشوار سے دشوار بھی نہ ٹالا جائے، نہ یہ کہ سارے احکام کو بالائے طاق رکھ دیا جائے۔ اچھی قدر کی خدا تعالیٰ کی رحمت کی اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت کی۔

ایک مقدمہ اور سنیے! کامل شفیق وہ ہے جس کو نسخۂ سہل لکھنے میں مہارت ہو، بلکہ جنگل کی دوا سے علاج کرتا ہو۔ جس قدر سہولت کی رعایت ہوگی وہ دلیل ہوگی کمال اور شفقت اور رحمت کی۔ جب یہ سمجھ گئے تو سنیے کہ آسان طریقہ تو یہ تھا کہ نہ نماز کی ضرورت ہوتی، نہ زکوٰۃ کی، نہ حلال وحرام کے اہتمام کی، نہ رشوت چھوڑنے کی، نہ تکبّر چھوڑنے کی۔ بس لا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰه کہہ کر نہایت آزادی کے ساتھ زندگی بسر کیا کرتے، یہ نہایت سہل طریقہ تھا۔ اور اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کو تجویز فرماتے تو لوگ نہایت آسانی سے اسلام قبول کر لیتے، مگر باوجود اس کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں کیا بلکہ اعمال کی بھی تاکید اور تعلیم فرمائی۔

صرف لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰه پر اکتفا جائز نہیں، اعمال کی بھی ضرورت ہے:

اس سے معلوم ہوا کہ صرف لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ کافی نسخہ نہیں ہے دوسرے اجزا کی بھی ضرورت ہے، مگر آج کل اہل الرائے کی عجیب حالت ہے۔ چناں چہ ایک شخص نے یہاں تک رائے دی کہ اگر سب علما مل کر نماز کو اسلام سے خارج کر دیں تو اسلام کو بہت ترقی ہو اور اس کے باقی رکھنے سے اسلام کی ترقی رک رہی ہے، کیوں کہ جب کوئی شخص سنتا ہے کہ اسلام لا کر گلے مَڑھی جائیگی تو وہ اسلام لانے سے رک جاتا ہے۔ بہت سے لوگ اسلام لانے پر آمادہ ہیں، مگر نماز کی وجہ سے ہمت نہیں ہوتی، اس لیے اس کو حذف کر دینا چاہیے۔

میں کہتا ہوں کہ واقعی ظاہر میں تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اگر نماز نہ ہوتی تو مسلمان ہونا

کچھ بھی مشکل نہ تھا بہت سہل ہوتا، مگر باوجود اس کے پھر کیا وجہ ہے کہ نماز فرض فرمائی گئی اور اس کی تارک پر وعید ارشاد فرمائی اور وعید بھی ایسی ویسی نہیں بلکہ یوں فرمایا:

مَنْ تَرَكَ الصَّلَاةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ.

جس نے عمداً نماز کو چھوڑا تو وہ کافر ہوگیا۔

یہاں ایک بات سمجھیے کہ مولویوں کی عجیب کم بختی ہے کہ جب وہ اس قسم کا مضمون بیان کرتے ہیں تو لوگ ان کو یوں کہتے ہیں کہ بس جی! ان کو تو کافر بنانا آتا ہے۔ بھائی! یہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فتویٰ ہے، مولویوں کے گھر کی تو بات نہیں۔ اور اگر کہو کہ حدیث کوئی چیز نہیں، چناں چہ ایسے لوگوں میں سے بعض اس کے بھی قائل ہیں، تو صاحبو! قرآن شریف کا سیاق وسباق بھی تو تارک نماز کو مشرک بتلا رہا ہے۔ چناں چہ ارشاد ہے:

﴿أَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾ (الروم: ۳۱)

نماز کی پابندی کرو، مشرکین میں سے مت ہو۔

تو کیا قرآن شریف کو بھی حجّت نہ کہا جائے گا۔

حاصل یہ کہ اس درجہ جو نماز کی تاکید کی گئی یا حج وزکوٰۃ کی تاکید کی گئی ہے اور ان کے بارے میں وعید سنائی گئی ہے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ محض ایمان لانا کامیابی کامل کے لیے کافی نہیں، بلکہ مَنْ قَالَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ (جس نے لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ کہہ دیا، وہ جنّت میں داخل ہوگا) کے یہ معنی ہی نہیں کہ کوئی عمل نہ کرے۔ بلکہ معنی یہ ہیں کہ اس کا بھی اقرار کرے اور اس کے مقتضیٰ پر عمل بھی کرے۔ کیوں کہ قاعدہ مسلّمہ ہے کہ اَلشَّيْءُ إِذَا ثَبَتَ ثَبَتَ بِلَوَازِمِهٖ (شی جب ثابت ہوتی ہے تو اپنے لوازم کے ساتھ ثابت ہوتی ہے) اور اس قاعدہ میں کسی عاقل کو کلام نہیں، بالکل ظاہر بات ہے۔ میں اس کے متعلق چند مرتبہ مثالیں پیش کر چکا ہوں۔

ایمان کے ساتھ عمل کے ضروری ہونے کی ایک مثال سے وضاحت:

ایک بہت ظاہر مثال اس وقت بھی عرض کرتا ہوں۔ مثلاً کسی شخص کا نکاح کیا جاتا ہے

اور اس سے کہا جاتا ہے کہ تم نے فلاں لڑکی کو اتنے مہر پر قبول کیا؟ وہ کہتا ہے: قبول کیا۔ ظاہر ہے کہ اس کے معنی بلاشبہ یہی ہوتے ہیں کہ میں نے مکان دینا بھی قبول کیا، کھانا کپڑا بھی قبول کیا، اور بھی تمام اخراجات بی بی کے قبول کیے۔ اور یہ معنی اسی قاعدہ کی بنا پر ہیں کہ اَلشَّیْءُ إِذَا ثَبَتَ ثَبَتَ بِلَوَازِمِہٖ (شی جب ثابت ہوتی ہے تو اپنے لوازم کے ساتھ ثابت ہوتی ہے)

اب فرض کیجیے کہ یہ شخصِ ناکح اس مذاق کا تھا کہ مَنْ قَالَ لَا إِلٰہَ إِلَّا اللہ کے محض لفظی معنی کا قائل تھا، نکاح کے چند روز بعد ماں باپ نے علیحدہ کر دیا کہ کماؤ کھاؤ۔ جب علیحدہ ہوئے تو بی بی نے کہا کہ میاں! گھی چاہیے، آٹا چاہیے، دسوں قسم کے جھگڑے بتلا دیے۔ اس نے سن کر کہا کہ نکاح میں یہ کب ٹھہرایا تھا کہ یہ بھی لاؤں گا اور وہ بھی لاؤں گا۔ اس کا تو ذکر تک بھی نہ ہوا تھا، نہ اس کو میں نے قبول کیا تھا۔ غرض تکرار بڑھا، سارا محلّہ جمع ہو گیا۔ میں ان صاحب سے پوچھتا ہوں کہ اگر آپ کے سامنے ایسے شخص کا مقدمہ پیش ہو اور آپ جج ہوں تو آپ کیا فیصلہ کریں گے؟ ظاہر ہے کہ آپ یہی فیصلہ کریں گے کہ یہ جملہ ضروریات اس کے ذمہ ہیں۔ اور کسی عورت کو نکاح میں قبول کرنے کے معنی یہی ہیں کہ میں نے آٹا بھی قبول کیا، کھانا کپڑا دینا بھی قبول کیا، جملہ ضروریات قبول کیں۔ نکاح کے قبول کرنے میں یہ سب چیزیں بھی آ گئیں۔

بس اسی طرح لَا إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ کے معنی سمجھ لو کہ جس نے لَا إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ کا اقرار کیا، تو اسی میں یہ سب اقرار بھی آ گئے کہ نماز بھی پڑھوں گا، روزہ بھی رکھوں گا، زکوٰۃ بھی دوں گا، حج بھی کروں گا۔ تمام احکام کا اقرار اسی میں آ گیا۔ اب حدیث میں جو ہے دَخَلَ الْجَنَّۃَ کہ وہ شخص جنّت میں داخل ہوگا، تو یہ بالکل صحیح ہے۔ اس پر اگر کوئی یوں شبہ کرے کہ اس حدیث میں یہ بھی تو ہے: وَإِنْ زَنَا وَإِنْ سَرَقَ کہ جس نے لَا إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ کہہ لیا تو وہ جنّت میں داخل ہوگا اگرچہ زنا اور چوری کرے۔ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ لَا إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ کہہ کر چاہے جو کرے؟ سمجھ لیجیے کہ مطلب اس کا یہ ہے کہ ان افعال پر اصرار نہ کرے، یعنی اگر گناہ بھی ہو جاوے تو توبہ کر لے، کیوں کہ توبہ بھی تو لَا إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ ہی کے اقرار میں داخل ہے۔ بس توبہ کے بعد پھر پہلی حالت ہو جاوے گی۔ اور یہ معنی نہیں کہ فقط لَا إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ کہہ کر فارغ ہو گئے اور کچھ

ذمہ ہی نہیں رہا۔ مگر بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ ایمان لا کر کسی چیز کو ضروری ہی نہیں سمجھتے۔ بلکہ بعضے تو صرف مسلمان کے گھر پیدا ہونے کو ہی کافی سمجھتے ہیں اور بعض کو خود اس ایمان کی بھی خبر نہیں کہ کیا چیز ہے۔

دین سیکھنے سے آتا ہے:

صاحبو! اس بے خبری کا علاج سیکھنا ہے اور دین سیکھنے ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ مگر افسوس! آج کل ادنیٰ درجہ کی چیزیں تو سیکھی جاتی ہیں، مگر دین نہیں سیکھا جاتا۔ اور یہ بھی سمجھ لیجیے کہ حتی الامکان دین کے سکھانے والے ایسے تجویز کیے جاویں جو خود بھی دین رکھتے ہوں، اپنے کو ان کے سپرد کرنا چاہیے۔ دیکھیے مدارسِ دنیوی میں لوگ تعلیم کے متعلق سب باتیں استاد کے سپرد کرتے ہیں اور جس چیز کا جو کورس ہے اس میں اسی کو وکیل بناتے ہیں، مگر اس قاعدہ پر عمل نہیں کرتے تو دین کے باب میں نہیں کرتے اور پورا دین سیکھنے ہی سے ایمان بھی پورا ہوتا ہے، تھوڑے دین کے سیکھنے سے ایمان بھی پورا نہیں ہوتا کہ وہ محض لفظی ایمان ہوگا اور ایمانِ لفظی کیا کام دے سکتا ہے؟ مگر حضرت! اس وقت وہ حالت ہے کہ لَا یَبْقٰی مِنَ الدِّیْنِ اِلَّا اِسْمُهٗ (دین سے بجز اس کے نام کے کچھ باقی نہیں ہے)۔

سو حق تعالیٰ نے اس آیت میں اَلْمُحْصَنَاتِ کو مقدم کر کے اشارہ اس طرف کیا ہے کہ فقط ایمان پر قناعت کرنا بدون عمل کے کافی نہیں ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک شخص بغاوت کرتا ہو، بم کے گولے چھوڑتا ہو، مگر گورنمنٹ کو بھی مانتا ہو۔ کیا خوشنودیٔ سلطنت وامن وعافیت کے لیے محض یہ مان لینا بدون اطاعت کے کافی ہو جاوے گا؟ سب جانتے ہیں کہ کافی نہیں ہو سکتا۔ تو حق تعالیٰ کی جناب میں بھی یہ مان لینا کیسے کافی ہوگا جب تک عمل نہ ہو۔ یہ نکتہ تھا اَلْمُحْصَنَاتِ کے مقدم کرنے میں المؤمنات پر۔ غرض حق تعالیٰ ان دونوں کلموں میں قوت علمیّہ وعملیہ دونوں کو بیان کر رہے ہیں۔ یہ حاصل ہوا اس بیان کا۔

علم وعمل کی فہرست:

اب صرف اس کی ضرورت رہ گئی کہ اس علم اور عمل کی فہرست بیان کر دی جائے۔ پس

سنیے کہ علم سے مراد علمِ دین ہے علمِ دنیا نہیں ۔اور اس کے یہ معنی نہیں کہ علمِ دنیا کی ممانعت ہے۔جس چیز کی ضرورت واقعی ہو اس کو کتاب وسنت منع نہیں کرتی، بلکہ اگر دین کی نیت سے سیکھے تو وہ دنیا بھی دین ہی ہو جاتی ہے۔البتہ وہ دین لغیرہٖ ہے اپنی ذات میں دین نہیں ہے۔ یہ اس وجہ سے عرض کر دیا کہ بعضی ذہین بیبیاں سن کر بہت خوش ہوں گی کہ یہ تو بڑی اچھی بات بتلائی کہ دنیا بھی دین ہوجاتا ہے نیت سے۔بس وہ کفایت کرلیں گی کھانے پکانے اور خانہ داری کے کام پر اور سمجھ لیں گی کہ بس دین کا کام تو کر ہی لیا، اب آگے کیا ضرورت رہی نماز وغیرہ کی؟ اس لیے میں نے کہا ہے کہ یہ چیزیں اپنی ذات میں دین نہیں ہیں، یہ اعمال نماز روزہ کے قائم مقام نہ ہوں گے۔

نماز روزہ اپنی ذات میں دین ہے:

بعض اسی کو بڑی عبادت سمجھتی ہیں کہ گھر کا کام کرلیا، شوہر کو آرام پہنچا دیا، خانہ داری کا بندوبست کرلیا، بس آگے اور کچھ نہیں ، بہت سی ایسے مذاق کی بھی ہیں۔خوب سمجھ لیجیے کہ نماز روزہ تو اپنی ذات میں دین ہے اور یہ چیزیں اپنی ذات میں دین نہیں، بلکہ یہ ملحق بہ عبادت ہوجاتی ہیں قائم قام نہیں ہوسکتیں، کجا وہ (نماز روزہ) کجا یہ (خانہ داری کا کاروبار)، مگر ہاں دین ہے ایک خاص اعتبار سے۔اب رہی یہ بات کہ وہ نیت کیا ہوگی جس سے یہ چیزیں عبادت ہوسکیں، تو نیت یہ ہوگی کہ ہم شوہر کی خدمت کریں گی ،اس کو آرام پہنچائیں گی تو اس کا حق ادا ہوگا۔بس اس نیت سے دنیا دین ہوجاوے گی۔اسی طرح تعلیم دنیا بھی اگر دین کی نیت سے ہو تو وہ بھی دین ہوجاتا ہے، مگر محض اس تعلیم پر کفایت نہ کرنا چاہیے۔تم کو اصل ضرورت علمِ دین کی ہے۔اب میں اس کی فہرست بھی بتلاتا ہوں۔

سب سے پہلے بچہ کی تعلیم کیا ہونی چاہیے:

سب سے پہلے بچہ کو کلمہ شریف سکھا دو خواہ ایک ہی کلمہ ہو، جس کو عورتیں بہت آسانی سے سکھا سکتی ہیں ۔ نیز بچہ کو زبانی تعلیم احکام کی بھی دیتی رہو۔مثلاً اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنا اور یہ بتلانا کہ اللہ تعالیٰ ہی رزق دیتے ہیں۔اور خداتعالیٰ کی جو صفات ہیں وہ بتلاؤ، مثلاً سب

چیزوں کو انہوں نے پیدا کیا ہے، وہی مارتے ہیں، وہی جلاتے ہیں، ان کو خبر ہے تمام چیزوں کی۔ اگر بچہ شرارت کرے تو کہو کہ اللہ میاں خفا ہوں گے۔ جو جو علوم ان کے مناسب ہیں عورتیں ان کے ذہن میں خوب ڈال سکتی ہیں۔ بار بار کہتے رہنے سے بچہ کو یقین ہو جائے گا کہ خدا تعالیٰ کو سب چیز کی خبر ہے۔ عورتوں کو چاہیے کہ ان کے خیالات کو درست کریں۔

اس کے بعد جب ان کو اور ہوش ہو تو چھوٹی چھوٹی سورتیں قرآن شریف کی یاد کرادیں۔ جب سات برس کے ہوں تو نماز پڑھنے کا طریقہ بتلادیں۔ دس برس کی عمر میں مار کر پڑھوائیں۔ اب تو نماز کے بارے میں کوئی بھی کچھ نہیں کہتا۔ اگر کوئی بچہ امتحان میں فیل ہو جائے تو اس پر تو افسوس ہوتا ہے، لیکن نماز اگر دس روز تک بھی نہ پڑھے تو ذرا بھی افسوس نہیں ہوتا۔

زبانِ حال سے اسلام شکایت کر رہا ہے کہ افسوس! میری طرف بالکل توجہ نہیں رہی۔ میں تم کو غیرت دلاتا ہوں۔ یہ بتلائیے کہ اس کی حفاظت آپ کے ذمہ ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کیوں نہیں کی جاتی۔ کیا نصاریٰ و یہود اس کی حفاظت کریں گے یا مجوس و ہنود اس کی حمایت کریں گے؟ جب اپنے اسباب کی مالک ہی حفاظت نہ کرے تو اور کون کرے گا؟

دین سب کی مشترک جائیداد ہے، سب کو حفاظت کرنی ضروری ہے:

شاید یوں خیال ہو گا کہ مولوی تو اس کی حفاظت کر رہے ہیں، تو میں کہتا ہوں کہ دین کیا صرف مولویوں کا ہے تمہارا نہیں ہے؟ ظاہر ہے کہ سب ہی کا ہے، جب سب کا ہے تو وہ ایک جائیدادِ مشترک ہوا۔ اور ظاہر ہے کہ جو جائیدادِ مشترک ہوتی ہے اس کی حفاظت جملہ شُرَکا کے ذمہ ہوتی ہے، تو پھر اس مشترک جائیداد کی سب کیوں نہیں حفاظت کرتے؟ خاص کر جب کہ حفاظت آسان بھی ہو۔ اور حفاظت یہ ہے کہ اس کی ضروریات کی پابندی کرو۔ سو یہ کیا مشکل ہے؟ اور اگر مشکل ہے تو ایسی مشکل ہے جیسے ایک معمولی کام کا اگر ارادہ نہ کرو تو وہ مشکل نظر آتا ہے۔

ارادہ نہ کرنے سے معمولی کام مشکل ہو جاتا ہے:

سو ارادہ نہ کرنے سے ہر کام مشکل ہونے لگتا ہے۔ چناں چہ اگر کسی شخص کو آدھی رات

میں پیاس لگے اور اس وقت ہمت نہ ہو اٹھ کر پانی پینے کی کہ اس وقت کہاں جائے اور اس لیے پیاسا پڑا رہے۔ فرض کیجیے! اگر اسی وقت اتفاق سے کلکٹر کا اردلی آیا اور کہا کہ صاحب! کلکٹر کو آپ سے خاص بات کہنی ہے اور اسی وقت بلایا ہے۔ اور وقت بھی ایسا کہ بارش ہو رہی ہے اور بجلی چمک رہی ہے۔ یہ صاحب وہی ہیں کہ چار قدم بھی پانی پینے کو نہیں جاسکتے تھے، مگر یہی وہ ہیں کہ باران کوٹ پہن کر سوار ہو کر چل دیے اور ایک میل پہنچے۔ اور جب وہاں سے آئے تو خوش بہ خوش فخر کرتے ہوئے آئے کہ ہم سے صاحب کلکٹر نے مشورہ لیا، اسی کا تذکرہ ہے، اسی کا چرچا ہے۔ ان ہی کو پہلے چار قدم جانا مشکل تھا اور اب آٹھ فرلانگ چلے گئے، آخر اس میں تفاوت کیا ہے؟

بس بات یہی ہے کہ چار قدم جانے کا تو ارادہ نہ تھا اور ایک میل جانے کا ارادہ ہوگیا۔ ارادہ نہ کرنے سے وہ مشکل ہوگیا اور ارادہ کرنے سے یہ آسان ہوگیا۔ کبھی سردی میں سفر کا ارادہ ہوتا ہے تو حالت یہ ہوتی ہے کہ ہاتھ پاؤں ٹھٹھرے ہوئے ہیں، گلے جاتے ہیں، مگر سفر کر رہے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ارادہ نہیں کرتے دین کا، اس لیے دین مشکل معلوم ہوتا ہے۔ بس چوں کہ ہم میں ارادہ نہیں۔ اس لیے نماز جیسی آسان چیز بھی مشکل ہوتی ہے۔

حاصل یہ کہ بچوں کی تعلیم کی ابتدا نماز سے کی جائے اور اس کو عادتِ ثانیہ بنایا جائے۔ جب بچہ دس برس کا ہوجائے اور نماز نہ پڑھے تو اس کو مارو پیٹو۔ غرض بچپن ہی میں نماز کا طریقہ تعلیم کردو، جب سیانا ہوجائے لڑکی ہو یا لڑکا اس کو علم دین پڑھائیں۔

قرآن شریف کسی حالت میں ترک نہ کرنا چاہیے:

قرآن شریف بڑی چیز ہے کسی حالت میں ترک نہ کرنا چاہیے۔ یہ خیال نہ کریں کہ وقت ضائع ہوگا۔ اگر قرآن شریف سارا نہ ہو آدھا ہی ہو، یہ بھی نہ ہو ایک ہی منزل پڑھا دی جائے اخیر کی طرف سے۔ اس میں چھوٹی چھوٹی سورتیں نماز میں کام آئیں گی۔ اور قرآن شریف کی یہ بھی برکت ہے کہ قرآن کے حافظ کا دماغ ایسا مناسب ہوجاتا ہے دوسرے علوم کے لیے کہ دوسروں کا نہیں ہوتا۔ یہ تجربہ ہے رات دن کا۔ صاحبو! بھلا ایک منزل پڑھانے میں کیا وقت صرف ہوتا ہے۔

قرآن شریف نہ پڑھانے کا بہانہ:

آج کل قرآن شریف کے پڑھانے میں ایک اور بہانہ کیا جاتا ہے کہ اس طرح پڑھانے سے یعنی بے معنیٰ طوطے کی طرح پڑھانے سے کیا فائدہ؟ میں کہتا ہوں کہ اگر اسی طرح پڑھانے سے کسی بڑے عہدہ کا وعدہ ہوجائے تو انعام کی توقع کے بعد بھی کیا کوئی صاحب یوں کہیں گے کہ کیا فائدہ؟ اور پھر معنی ہی میں فائدہ کو منحصر سمجھنا خود یہی غلط ہے۔ کیا ثواب فائدہ نہیں ہے؟ سو اس کی نسبت رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ قرآن شریف کے پڑھنے میں ہر حرف پر دس دس نیکیاں ملتی ہیں، تو کیا نیکی روپیہ سے بھی گئی گذری ہے؟ مگر نیکی وہ سکّہ ہے جس کی قیمت دنیا میں معلوم نہیں ہوتی کیوں کہ یہ سکّہ دوسرے ملک میں چلتا ہے۔ سعدی رحمۃ اللہ علیہ اسی کو کہتے ہیں:

قیامت کہ بازار مینو نہند
مراتب باعمال نیکو دہند
کہ بازار چندانکہ آگندہ تر
تہیدست رادل پراگندہ تر

قیامت کے دن بازار لگائیں گے، نیک اعمال کے مطابق مراتب عطا کریں گے۔ بازار جس قدر بھرتا اور رونق پر آتا ہے تہی دل کا دل زیادہ پراگندہ ہوتا ہے۔

غرض آخرت میں ایک بازار لگایا جائے گا اور وہ سکّہ وہاں چلے گا۔ پھر تو جس کے پاس یہ سکّہ نہ ہوگا اس کی یہ حالت ہوگی تہی دست رادل پراگندہ تر۔ پاس کچھ نہیں مارے پھر رہے ہیں، کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ اس وقت قدر ہوگی اس سکّہ کی۔ سو دیکھیے! کتنا بڑا انعام ہے کہ قرآن کے ایک حرف پر دس نیکیاں! اسی کو تو کہتے ہیں:

خود کہ باید ایں چنیں بازار را
کہ بیک گل می خری گلزار را

ایسا بازار کہاں مل سکتا ہے کہ ایک پھول کے بدلہ میں چمن ہی کو خرید لے۔

ہاں اگر مسلمان ہوکر یہ کہہ دیں کہ آخرت میں بھی ضرورت نہ پڑے گی تو بس صبر آجاوے، پھران کو خطاب ہی نہ کیا جاوے۔ لیکن ضرورت بھی مانتے ہیں اور پھر محض لفظ ہی لفظ ہیں، اس سے جی کڑھتا ہے صبر نہیں آتا۔ غرض قرآن شریف ضرور پڑھنا چاہیے۔

مشغول شخص کا نصابِ دین:

اس کے بعد ضرورت اس کی ہے کہ اگر کوئی شخص فارغ صاحبِ ثروت نہ ہوتو کم از کم اتنا ضرور چاہیے کہ مکمّل نصاب اردو کا پڑھ لے اور اس نصاب کے لیے اس وقت اردو میں کافی ذخیرہ موجود ہے۔ علُما سے اس کو منتخب کرا کر آدھا دن دین کی تعلیم کے لیے اور آدھا دنیا کی تعلیم کے لیے مقرر کرلیں۔ مگر یہ ضرور ہے کہ تعلیم ایسے شخص سے ہو جو مذہبی آدمی ہو۔ اور یہ خیال نہ کیجیے کہ ایسی معمولی استعداد سے جو اُردو پڑھنے سے حاصل ہوگی کیا فائدہ؟ اس سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ قلب میں دین کی عظمت پیدا ہوجائے گی اور رگ وریشہ میں دین رچ جائے گا۔ خصوصاً بچوں کو ایسے لوگوں کے سپرد کیجیے جو بے طمع، خوش اخلاق لوگ ہوں۔ چناں چہ پہلے زمانہ میں جو مکتبی تعلیم کا طریقہ تھا بہت ہی اچھا طریقہ تھا۔ ان کی صحبت کا یہ اثر دیکھا جاتا ہے کہ جو لوگ پرانے مکتب کے پڑھے ہوئے ہیں ان کے قلب میں بزرگوں کی، دین کی عزت اور عظمت ہے، جس کا نئی تعلیم میں نام ونشان بھی نہیں۔ وجہ یہ کہ نری زبان سے کچھ نہیں ہوتا جب تک قلب کے اندر کوئی بات پیدا نہ ہو، اور دل میں پیدا نہیں ہوتی جب تک صحبت نہ ہو، اس لیے صحبت کی بڑی ضرورت ہے، خواہ کتابیں تھوڑی ہی پڑھائی جاویں مگر صحبت زیادہ ہو۔

بچیوں کے لیے تعلیم:

رہی لڑکیوں کی تعلیم، سو اگر گھر کے مرد ذی علم ہوں تو وہ پڑھا دیں، ورنہ اگر مستورات پڑھی ہوئی ہوں تو خود پڑھائیں ورنہ دوسری نیک بیبیوں سے پڑھوائیں۔ اور نصاب وہی ہو جو میں نے ذکر کیا ہے۔ اور یہ میری سمجھ میں کسی طرح نہیں آتا کہ زنانہ مکتب قائم کیا جائے جیسے مردانے مکتب باقاعدہ ہوتے ہیں۔ اس باب میں واقعات اس کثرت سے ہیں کہ ان واقعات نے یقین دلایا ہے کہ ایسے مکتبوں کا اثر اچھا نہیں ہوتا اور امتحان ہوجانے کے بعد ہمیں وجہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں، جیسا مقناطیس کی کشش کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ

خاص تعلّق کے موقع پر تعلیم ہونا چاہیے لڑکیوں کی۔ تجربہ سے معلوم ہوا کہ خاص تعلّق کے گھر میں جتنی حفاظت ہوتی ہے وہ عام جگہ نہیں ہوسکتی۔ لیکن یہ میری رائے ہے، میں فتویٰ نہیں دیتا ہوں۔ اگر تجربہ سے دوسری تجویز مفاسد سے خالی ہو تو اس پر عمل کیا جاوے۔ مگر عورتوں کو تعلیم ضرور دینا چاہیے، لیکن مذہبی تعلیم نہ کہ تعلیم جدید۔ اور تعلیم کے ساتھ ساتھ ایک اور کام بھی کرنا چاہیے۔ وہ یہ کہ لڑکیاں کسی تعلیم کے خلاف عمل کریں تو ان کو روکو، بلکہ ان کے خلاف عمل کرنے پر یوں کرو کہ جب کبھی غیبت کریں کتاب منگا کر اور وہ مضمون دکھا کر تنبیہ کرو۔

اگر اس طرح سے عمل رہا تو ان شاء اللہ تعالیٰ ایسا پاکیزہ نشو ونما ہوگا جس کا کچھ کہنا ہی نہیں۔ دوسرے گھر یعنی سسرال میں جا کر نیک نامی ہوگی۔ اور یہ بھی مشاہدہ سے سب کو معلوم ہوجاوے گا کہ دین داری ایسی چیز ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اخلاق درست ہوں گے، اعمال درست ہوں گے۔ اس سے زیادہ کیا راحت ہوگی کہ اخلاق بھی درست ہوں، اعمال بھی درست ہوں۔ غرض دینی تعلیم سے دونوں باتیں نصیب ہوں گی: آسایشِ دین، اور آسایشِ دنیا۔ بلکہ ایسوں سے دوسروں کو بھی راحت ہی پہنچتی ہے، کیوں کہ ایسے لوگ دشمنوں تک سے بھی مخالفت نہیں کرتے۔ اسی کو کہتے ہیں:

شنیدم کہ مردانِ راہ خدا
دل دشمناں ہم نکردند تنگ
ترا کی میسّر شود ایں مقام
کہ باد وستانت خلاف ست وجنگ

میں نے سنا ہے کہ اہل اللہ نے دشمنوں کے دل کو بھی رنجیدہ نہیں کیا ہے، تجھ کو یہ مرتبہ کب حاصل ہوسکتا ہے کہ تو اپنے دوستوں سے بھی اختلاف اور لڑائی رکھتا ہے۔

پس ان کی تعلیم کا یہ طریقہ ہے، اور یہ طریقہ وہاں تو آسان ہے جہاں عورتیں پڑھی ہوئی ہوں۔

ناخواندہ عورتوں کو دینی تعلیم:

اور جہاں پڑھی ہوئی نہ ہوں تو عورتوں پر لازم ہے کہ وہ مردوں سے پڑھانے کی التجا

کریں۔ پھر عورتوں کے پڑھانے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ مردان کو کتابیں سنا دیا کریں۔

دینی کتابوں سے متعلق ایک کام کی بات:

اس کے متعلق میں ایک کام کی بات بتلاتا ہوں مردوں کو بھی، عورتوں کو بھی۔ اور وہ بڑے کام کی بات ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہ جو عادت ہے کہ جس کسی کتاب کے ساتھ مولوی کا نام لکھا ہوا پایا اس کتاب کو لے لیا، یہ نہ چاہیے۔ دیکھیے دنیا میں اطِبّا بہت سے ہیں، مگر آپ سب کو برابر نہیں سمجھتے۔ ہر کسی کا علاج نہیں کرتے۔ حکیم وہ تجویز کیا جاتا ہے جو باقاعدہ طب پڑھا ہوا ہو اور خدا تعالیٰ نے اس کے ہاتھ میں شفا بھی دی ہو، اس کو مریضوں پر شفقت بھی ہو، حریص وطمّاع بھی نہ ہو۔ اے اللہ! حکیم کے واسطے تو آپ نے اتنی صفتیں لگا دیں اور دین میں یہ حالت ہے کہ ایک کتاب دیکھی کہ فلاں مولوی صاحب کی ہے، بس اسے خرید لیا۔ یہ بحث ہی نہیں کہ انہوں نے باقاعدہ کہیں پڑھا بھی ہے؟ وہ اہلِ فن کے نزدیک معتبر بھی ہیں؟ باقی محض مولوی نام ہونے سے کیا ہوتا ہے؟

آج کل خطابات بہت سستے ہو رہے ہیں۔ یہ حالت ہے کہ جو قدوری بھی نہیں پڑھا سکتے ان کو مولوی کا خطاب مل جاتا ہے۔ بہت سے شمس العلماء ایسے ہیں کہ اگر ان کے سامنے کوئی چھوٹی سی کتاب بھی پڑھانے کے لیے رکھ دو تو پڑھا نہ سکیں۔ میں تو ایسے لوگوں کو شمسِ مکسوف کہا کرتا ہوں۔ تعجب ہے کہ لوگ یہ بھی تو نہیں دیکھتے کہ حکام کا کسی کو کوئی خطاب دے دینا کہاں تک حجّت کمال کی ہے۔

اس پر مجھ کو ایک حکایت یاد آئی۔ ایک نائی کسی بادشاہ کی حجامت بنایا کرتا تھا۔ ایک دفعہ وہ اپنے وقت پر حجامت کے لیے نہ پہنچا۔ بادشاہ انتظار کر کے سو رہے۔ نائی گیا تو خبر ملی کہ بادشاہ سو رہے ہیں۔ وہ یہ سن کر فکر میں پڑ گیا کہ نہیں معلوم بیدار ہونے کے بعد کیا حکم دیں؟ اس نے دربان سے سازش کر کے سوتے ہی میں حجامت بنا دی کہ بادشاہ کو خبر بھی نہ ہوئی۔ بادشاہ نے اٹھ کر آئینہ میں جو خط بنا ہوا پایا، پوچھا تو معلوم ہوا کہ سوتے میں بنایا گیا ہے۔ اس پر بادشاہ نے خوش ہو کر نائی کو استاد کا خطاب عطا کیا۔ یہ خبر جب پھیلی تو اس نائی کے یہاں

برادری کی عورتیں جمع ہوئیں اور اس کی نائن سے کہا کہ بہن! تجھے مبارک ہو، بادشاہ نے تیرے میاں کو استاد کا خطاب دیا ہے۔ نائن نے سن کر کہا کہ یہ تو کوئی خوشی کی بات نہیں کہ بادشاہ نائی تھوڑا ہی ہے جو فن کو جانتا ہے۔ خوشی کی بات تو جب تھی کہ اپنے چار بھائی مل کر خطاب دے دیتے۔ بادشاہ کا خطاب دینا معتبر تھوڑا ہی ہے جب کہ اس پیشہ ہی کو نہیں جانتا۔

گورنمنٹ کا کسی کو شمس العلماء کا خطاب دینا معتبر نہیں:

واقعی یہ بات ہے کہ اس نائن کی عقل ہم سے زیادہ تھی، تو گورنمنٹ کے خطاب دینے سے کسی کو شمس العلماء سمجھ لینا محض حماقت ہے۔ گورنمنٹ خود ہی شمس العلماء نہیں۔ ہاں شمس السلاطین کہہ دو تو خیر۔ کھلّم کھلاّ دیکھتے ہیں کہ ایسے لوگ صرف ونحو پوری نہیں جانتے۔ خدا کے واسطے! ذرا حس درست کیجیے اور جس طرح بعضوں نے غیر واقعی مولویوں کو مولوی سمجھ لیا۔ بعضوں نے واقعی مولویوں کو بھی مولوی نہ سمجھا، انہوں نے یہاں تک حد سے تجاوز کیا ہے کہ سارے مولویوں کو بے ایمان سمجھ لیا۔ کیا سارے مولوی تمہارے نزدیک بے ایمان ہیں؟ بات یہ ہے کہ آپ نے ان مولویوں کو دیکھا ہے جو آپ کے دروازوں پر آتے ہیں۔ کبھی آپ نے ان کی بھی تلاش کی ہے جو کسی کے دروازے پر نہیں جاتے؟ اگر آپ ان کو تلاش کرتے تب آپ کو ان کا حال معلوم ہوتا۔

عُلَما کون سے ہیں؟

آپ کو خبر ہی نہیں کہ مولوی کیسے ہوتے ہیں، کیوں کہ آپ گئے ہی نہیں۔ سو ذرا ان کو تلاش کرلو۔ جیسا مولانا کہتے ہیں:

خوب را بگذارا مشب اے پدر
یک شبے در کوئے بے خواہاں گزر

خواب کو ترک کر کے آج ایک رات کو بے خوابوں میں گزاریں۔

یعنی تلاش کرنے سے معلوم ہوگا کہ نہ سونے والوں میں کیسے کیسے ہیں، مگر کبر ونخوت تلاش سے مانع ہے اس کو چھوڑو تو وہ ملیں۔ اور اس وقت یہ مضامین سمجھ میں آویں جو عارف

شیرازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

مبیں حقیر گدایانِ عشق را کیں قوم
شہاں بے کمرو خسرواں بے کلہ اند

گدایانِ عشق کو حقیر نہ سمجھو کہ یہ بے تخت وتاج اور ٹیکے کے بادشاہ ہیں۔

اور فرماتے ہیں:

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں
کہ ناز بر فلک وحکم بر ستارہ کنم

گدائے میکدہ ہوں، لیکن مستی کے وقت فلک پر ناز اور ستارے پر حکم کرتا ہوں۔

مگر ان کے پاس قیمتی کپڑے نہ ہوں گے، نہ انگریزی لباس ہوگا۔ ان دونوں سے عریاں ہوں گے۔ ان میں بناوٹ نہ ہوگی۔ اور ان کو جب اپنی جان کی بھی پروا نہیں تو کپڑے وغیرہ کی تو کیا ہوگی؟ ان کی تو یہ حالت ہے:

آنکس کہ ترا شناخت جان راچہ کند
فرزند وعزیز وخاں وماں راچہ کند

جس کو آپ کی معرفت حاصل ہوگئی اس کو جان اور فرزند و مال واسباب کی پرواہ نہیں۔

میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ وہ پھٹے ہوئے کپڑوں میں مستغنی ہیں۔ بس ایسے لوگوں سے رجوع کیجیے۔ اس کے ساتھ ایک اور کام کی بات بتلاتا ہوں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ہر شخص اپنے ایمان کی حفاظت کرنا چاہتا ہے اور اس کے ذمہ بھی ہے ایمان کی حفاظت۔

ایمان کی حفاظت کا طریقہ، ایک متبعِ سنت عالم کی پیروی کرنا ہے:

سو ایمان کی حفاظت تجربہ سے آج کل اسی میں ہے کہ کسی ایک عالم متبعِ سنت کو اپنا مقتدا اور ہادی بنالے۔ یہ نہیں کہ جس کو مولوی دیکھا بس اسی کو قبلہ وکعبہ بنایا۔ دیکھ بھال کر خوب سمجھ بوجھ کر ایک معیّن کرلیا جاوے۔ جب معیّن ہوجاوے تو ہر بات کو اسی سے پوچھو۔ اسی سے پوچھ کر کتابیں سنانے اور پڑھانے اور دیکھنے کے لیے منتخب کرو۔ خیال کیجیے کہ دنیاوی معاملات میں ہر شخص ایک معتمد کو تجویز کرلیتا ہے۔ اور اس میں حکمت یہی ہے کہ ایک کے معین

کر لینے میں انتخاب بھی اچھا ہوتا ہے اور اس معتمد کو بھی تعلّق وتوجہ زیادہ ہوجاتی ہے۔ دیکھیے جس وکیل کے یہاں ہمیشہ مقدمات لے کر جاتے آتے ہیں، جیسی وہ عنایت کرے گا دوسرا نیا آدمی نہیں کرسکتا۔ سو آپ نے دین کے معاملہ میں ایسا کیوں نہیں کیا۔ یعنی آپ نے اپنی اصلاح کے لیے کوئی مولوی درویش کیوں نہیں تجویز کیا۔ بس بات یہ ہے کہ دین کو ایسا ضروری نہیں سمجھا، ورنہ جس طرح دنیوی معاملات میں مصلحت کے لیے تعین کیا جاتا ہے دینی معاملات میں بھی ایسا ہی ہوتا۔

عالم کون ہے؟

لیکن اگر تعیّن کے لیے انتخاب کرو تو یہ دیکھ لینا کہ وہ مولوی ایسا ہو کہ جس نے باقاعدہ پڑھا بھی ہو، شفیق بھی ہو، حریص وطمّاع نہ ہو، متبعِ سنت بھی ہو۔ بس ایسے شخص کو عالم سمجھیں۔ اس منتخب کرنے ہی میں بڑے سلیقہ کی ضرورت ہے۔ پھر جب منتخب ہوجائے تو ہر بات میں اسی کی طرف رجوع کریں۔ اور انتخاب میں اس احتیاط کی اس لیے ضرورت ہے کہ اس دین کے پردہ میں ایسے لوگ گھس رہے ہیں کہ:

اے بسا ابلیس روئے ہست
بس بہر دستے نباید داد دست

اے طالب! آدمی کی صورت میں بہت سے شیاطین بھی ہیں،
پس ہر ایک کی طرف رجوع اور بیعت نہ کرنی چاہیے۔

کار شیطاں می کند نامت ولی
گر ولی این ست لعنت بر ولی

کام تو شیطان کے کرتا ہے اور نام ولی ہے، اگر یہی ولی ہے تو ایسے ولی پر لعنت ہے۔

اور ایسے لوگوں کے بارے میں فرماتے ہیں:

ظالم آں قومی کہ چشماں دوختند
از سخن ہا عالمے را سوختند

بڑے ظالم تھے وہ لوگ جنہوں نے آنکھیں بند کر کے ایسی باتوں سے ایک عالم کو ویران کر دیا۔

اور اچھے لوگوں کی علامت جو کہ معیارِ انتخاب ہو سکتا ہے، فرماتے ہیں:

کار مرداں روشنی وگرمی ست

کار دوناں حیلہ وبے شرمی ست

مردانِ حق کا کام روشنی وگرمی ہے، کمینوں کا کام حیلہ اور بے شرمی ہے۔

یہ دو علامتیں ہیں: گرمی اور روشنی۔ حاصل یہ کہ ان میں متعدد صفات ہیں: ایک صفت ان میں سے گرمی ہے، اور ایک صفت روشنی ہے۔ روشنی سے مراد علم اور گرمی سے مراد عشق، یعنی حق تعالیٰ کی محبّت۔ اور یہ گرمی ایسی ہے جیسے انجن میں گرمی ہوتی ہے۔ ان گاڑیوں کو مبارک ہو جو ایسے انجن سے وابستہ ہوں۔ اور علامت اس گرمی کی یہ ہے کہ ان کی صحبت سے خدا تعالیٰ کی محبّت بڑھتی جاوے اور دنیا سے دل سرد ہوتا جاوے۔ مگر یہ مطلب نہیں کہ تعلقات دنیویہ بالکل ترک ہو جاویں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ دنیا سے دلچسپی نہ رہے اور دنیا کو قبلہ وکعبہ نہ بنائے۔ بس ایسے شخص سے رجوع کرو، اور جو بات پوچھو اسی سے پوچھو، کتابیں بھی اسی سے انتخاب کراؤ، جو کتابیں دیکھنا چاہو پہلے اس کو دکھلا لو۔

ہر ایک کتاب کو نہ دیکھنا چاہیے:

ہر کتاب کو مت دیکھنے لگو ورنہ یہ ہوگا:

شد پریشان خواب من از کثرت تعبیر ہا

کثرت تعبیر سے میرے خواب پریشان ہو گئے۔

آج اس کی کتاب دیکھ لی، کل اس کی دیکھ لی۔ یہ نہیں چاہیے، اس سے بڑی خرابی پیدا ہوتی ہے۔ پہلے اسی شخص کو جس کو تجویز کیا ہے دکھلا لو۔ اگر وہ اجازت دے تو دیکھو ورنہ مت دیکھو۔ محتاط اُمرا کی عادت ہوتی ہے کہ کھانا کھاتے ہیں تو اول حکیم سے پوچھ لیتے ہیں۔ اگر وہ اجازت دیتا ہے تو کھاتے ہیں ورنہ نہیں۔ یا بعضے محتاط مریضوں کی عادت ہے کہ اگر کوئی شخص ان کو کوئی دوا کھلانا چاہے تو کہتے ہیں کہ بجائے ہمارے، فلاں طبیب سے اس دوا کی

بابت کہو، اگر وہ کہے گا تو استعمال کرلوں گا ورنہ نہیں۔ ایسا ہی یہاں کرو۔

پھر ایک ادب اس شخص کا یہ ہے کہ ایسے شخص سے کسی رائے میں مناقشہ نہ کرنا چاہیے۔ دیکھو! طبیب سے علاج میں کوئی مناقشہ نہیں کرتا، کیوں کہ اگر جھگڑیں تو وہ علاج نہ کرے، نسخہ پھاڑ کر پھینک دے۔ تو دیکھیے! یہ لوگ دنیوی اُمور میں کیسے بھولے بن گئے کہ طبیب و وکیل سے مناقشہ ہی نہیں کرتے، مگر جب دین کا وقت آیا تو سارے زمانہ کے ہوشیار و زِیرک بن گئے کہ مناقشہ کے لیے تیار ہیں۔

ایک صاحب کہنے لگے کہ کیوں صاحب! نماز پانچ وقت کیوں فرض ہوئی، زیادہ کم کیوں نہ ہوئی؟ میں نے کہا کہ آپ کی ناک یہاں کیوں لگی؟ گدی پر کیوں نہ لگی، اور میں نے کہا کہ اپنے افعال تکلیفیہ کی حکمت سے پہلے تو اپنے اجزا کی حکمت دریافت کیجیے، کیوں کہ یہ تو آپ کے جسم ہی میں ہیں اور افعال تو پھر بھی خارج ہیں۔ پس عجیب بات ہے کہ ان لوگوں کا مذاق دنیوی معاملات میں اور ہے اور دینی امور میں اور۔ ایک مذاق رکھیے اور ایک اصلِ صحیح قائم کرکے اس پر عمل کیجیے۔ یہ نہیں کہ دنیا میں تو اور اصل، اور دین میں اور اصل۔ یہ بحث تھی انتخاب اور اس کے آداب کی۔

کتابیں انتخاب کرا کر پھر گھر والوں کو سنانا چاہیے، خواہ پندرہ منٹ روزانہ ہو:

پس ایسا شخص (جس کی صفات پہلے گزر چکیں) جب کتب دینیہ انتخاب کردے تو وہ کتابیں اپنے گھر والوں کو سناؤ۔ زیادہ نہ ہو تو پندرہ بیس منٹ ہی سہی۔ مگر سناتے وقت یہ بھی نہ دیکھو کہ کون سنتا ہے، کون نہیں؟ ''کس بشنود یا نشنود'' پر عمل ہو، یعنی کوئی سنے یا نہ سنے، مگر تم اپنا کام کیے جاؤ۔ گھر میں پڑھنا شروع کردو اور روز سنایا کرو۔ اٹھ کر نہ آؤ، خواہ بگڑ بگڑ پڑیں۔

بہت شخصوں نے بیان کیا کہ کتابیں سناتے سناتے اصلاح ہوگئی۔ کیا اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کا نام کھٹائی سے بھی کم ہے، کھٹائی کا تو منہ میں اثر ہو، جو ایک حقیر چیز ہے کہ منہ میں پانی بھر آوے اور اللہ تعالیٰ و رسول ﷺ کے نام کا اثر نہ ہو، مگر بات یہ ہے کہ کرے کون؟ کون دقّت اُٹھائے؟

دینی نصاب بار بار سنایا جائے:

اور جو نصاب تجویز کیا جائے گا اس میں ایک بات کی اور ضرورت ہے عورتوں کو بھی اور مردوں کو بھی۔ وہ یہ کہ اس نصاب کو ایک دفعہ ختم کر کے اس کو کافی نہ سمجھیں۔ جیسے کسی نے عید کے چاند کی شہادت دی تھی۔ اس سے پوچھا گیا کہ نماز بھی پڑھتا ہے؟ تو آپ کہتے ہیں: نماز کی یوں سنو، ایک مولوی صاحب ہمارے گاؤں میں آئے تھے، جب تو ہم نے نماز پڑھ لی تھی، پھر تو ہماری توبہ ہے۔ سو جیسے اس نے ایک دفعہ پڑھ کر توبہ کر لی تھی، ایسے ہی آج کل بھی کرتے ہیں کہ ایک دفعہ کتاب سنائی اور الگ، پھر سروکار ہی نہیں۔ مگر اس اصل پر کھانے پر عمل نہیں کیا جاتا۔ کھانا تو دونوں وقت کھاؤ، بلکہ کھانے پر تو ایسا عمل کہ بھوک بھی نہ ہو تو کہتے ہیں: رات کیسے گزرے گی؟ کچھ نہ سہی تو کباب ہی لے آؤ۔ کھانا تو بے بھوک بھی کھاتے ہیں مکرر، سہ کرر، چو کرر، دونوں وقت کھانا کھایا جاتا ہے، لیکن اگر اس پر عمل نہیں تو دین کے بارے میں۔

خوب اچھی طرح جان لیجیے کہ جو نصاب تجویز کیا جائے گا اس کو روزمرہ کا وظیفہ سمجھیے اور کچھ نہیں چار ہی ورق سہی دو ہی سہی۔ جیسے قرآن شریف کی تلاوت کیا کرتے ہیں اسی طرح دو ورق اس کے بھی پڑھ لیے یا سن لیے۔ اگر تمام عمر بھی اس میں لگا رہنا پڑے تب بھی ہمت کرنا چاہیے۔ وجہ یہ کہ دنیا کی ضرورت محدود ہے اور دین کی غیر محدود۔ چناں چہ دین کی ضرورت مرنے کے بعد تک بھی رہے گی۔ پس تعجب ہے کہ محدود ضرورت میں اتنا وقت صرف کریں اور غیر محدود میں کچھ بھی نہیں، بڑا تعجب ہے۔ جب دنیا کی دھن ہے تو دین کی کیوں نہ ہو۔ صاحبو! یہ (دین) فراغت کی چیز نہیں۔ مولانا فرماتے ہیں:

اندریں رہ می تراش و می خراش
تا دم آخر دمے فارغ مباش

تم کو چاہیے کہ اس طریق وصول الی اللہ میں ہمیشہ خراش تراش کرتے رہو
اور آخری وقت تک ایک لحظہ بھی فارغ مت رہو۔

اور گو ہے تو عمر بھر کا دھندا، مگر دشوار نہیں۔ آسانی سے عمر بھر اس میں مشغول رہ سکتا ہے۔

دین کی مشقت اور اس کا مزہ:

اگر کوئی یہ کہے کہ آپ تو کہتے ہیں کہ دشوار نہیں، مگر ہم نے تو دو چار دن کر کے دیکھا بڑی مشقت ہوئی۔ عقلی جواب تو اس کا یہ ہے کہ اس مشقت کو تو بڑا سمجھتے ہیں، مگر اس میں کوتاہی کرنے سے جو مشقت پیش آئے گی وہ اس سے بھی بڑی ہے، یعنی آخرت کی خرابی جس کا مآل عذابِ جہنّم ہے۔ تو اسکے اعتبار سے پھر یہ آسان ہی ہوا۔ عقلی جواب تو یہ ہے اور یہی کافی ہونا چاہیے۔ مگر میں وجدانی جواب بھی دیتا ہوں۔ وہ یہ کہ آپ کو کیسے خبر ہوئی کہ یہ مشقت تمام عمر رہے گی؟ کسی تمبا کو کھانے والے سے پوچھ کر دیکھو کہ تمبا کو جب پہلے پہلے کھایا تھا؟ کسی طبیب نے بتلایا تھا کہ تمباکو کو کھایا کرو، تو اس کو کھا کر کیسی پریشانی ہوتی تھی کہ ذرا سا کھا کر جی بھی میلا ہوتا تھا، سر بھی چکر کھاتا تھا۔ مگر اب یہ حال ہے کہ حقہ مل جائے تو جان مل جائے۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ دین کی مشقت تمبا کو کی مشقت کے برابر بھی نہیں۔ جب مزہ آجاوے گا تو یہ حالت ہوگی کہ ذرا سی کمی ہونے سے غم سوار ہو جائے گا۔ اسی کو تو کہتے ہیں:

بر دلِ سالک ہزاراں غم بود
گرز باغ دل خلالے کم بود

عارف کے دل پر ہزاروں غم کھا جاتے ہیں اگر اس کے باغ دل سے ایک تنکا بھی کم ہو جاتا ہے۔

ذرا سی کمی پر پہاڑ سا بوجھ ہوگا۔ غور کرلیں! وہ لوگ جو نماز کے پابند ہیں، جس روز نماز قضا ہو جاتی ہے یا دیر ہو جاتی ہے تو ان کی کیا حالت ہو جاتی ہے، کس قدر انقباض ہوتا ہے، دوسرا شخص اس کا اندازہ نہیں کرسکتا۔ یہ حالت تو وساوس وخطرات والی نماز کی ہے، اور اگر خالص ہو جاوے تو کیا کیفیت ہو؟ مولانا فرماتے ہیں:

جرعہ خاک آمیز چون مجنون کند
صاف گر باشد ندانم چوں کند

ایک گھونٹ مٹی کا ملا ہوا جب مجنون کر دیتا ہے، اگر صاف ہو تو نا معلوم کیا اثر کرے گا؟

ایک شخص نے شراب پی جس میں مٹی ملی ہوئی تھی، اس نے جب یہ حال کر دیا تو صاف

اگر پی جاتی تو خدا جانے کیا حال بنا ڈالتی۔ ہماری نماز خاک آمیز ہے۔ جب اس کی یہ کیفیت ہے تو اگر صفائی و خلوص آجاوے تو کیا کچھ حالت ہو؟ پس وہ شبہ رفع ہو گیا کہ دین تو ساری عمر کا جنجال ہو گیا۔

کام تو کرنے سے ہوتا ہے:

صاحبو! بس سال بھر ایسا کر لیجیے اور بس روز کر لینا کچھ مشکل بھی نہیں، پھر دیکھ لینا کیا ہو گا؟ اور خواہ اعتقاد سے نہ کرو بلکہ امتحان ہی کے طور پر کر کے دیکھ لو۔ مولانا اسی کو فرماتے ہیں:

سالہا تو سنگ بودی دل خراش
آزموں را یک زمانے خاک باش

برسوں تم دل خراش پتھر کی طرح رہے ہو، آزمائش ہی کے طور پر کچھ زمانہ خاک بن جاؤ، خاکساری کر کے بھی دیکھ لو۔

آگے فرماتے ہیں:

در بہاراں کے شود سرسبز سنگ
خاک شوتا گل بروید رنگ رنگ

بہار کے موسم میں پتھر سرسبز نہیں ہوتے، تم خاک ہوتا کہ رنگ رنگ کے پھول اُگیں۔

مگر کرنا شرط ہے، کیوں کہ کرنے کا کام کرنے ہی سے ہوتا ہے صرف باتوں ہی سے کام نہیں چلتا۔ اور اگر کوئی کہے کہ ہم نے تو کیا تھا مگر کچھ نفع نہ ہوا؟ بات یہ ہے کہ نرے کرنے سے بھی کچھ نہیں ہوتا۔ طریقہ سے کرو تو سب کچھ ہو۔ لوگ بے طریقہ کام کرتے ہیں، اس لیے کچھ نہیں ہوتا۔ اور طریقہ اس کا رائے اور ذہانت سے کام لینا نہیں ہے، بلکہ پستی اور شکستگی اختیار کرنا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

فہم وخاطر تیز کردن نیست راہ
جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ

فہم وخاطر کا تیز کرنا راہ سلوک نہیں ہے، فضل الٰہی سوائے شکستہ دل کے اور کسی پر متوجہ نہیں ہوتا۔

بس آپ نے پستی اختیار نہیں کی جس کی ایک فرع یہ بھی ہے کہ کسی کو اپنا مقتدا نہیں بنایا،

اس کی رائے پر عمل نہیں کیا۔ یاد رکھیے کہ بلا پستی اختیار کیے اور دوسرے کی جوتیاں اٹھائے کچھ نہیں ہوتا۔ مولانا فرماتے ہیں:

ہر کجا پستی ست آب آنجا رود
ہر کجا مشکل جواب آنجا رود
ہر کجا درد ے آنجا رود
ہر کجا رنج شفا آنجا رود

جس جگہ نیچان ہوتا ہے اسی طرف پانی رواں ہوتا ہے، جہاں مشکل پیش آتی ہے جواب وہیں دیا جاتا ہے۔ جہاں مرض ہوتا ہے اسی جگہ دوا کی جاتی ہے، جہاں مرض ہوتا ہے وہیں شفا آتی ہے۔

اپنے کو پست بناؤ، تکبّر چھوڑو، نیاز مند ہوجاؤ، کسی کے سامنے خاک بن جاؤ۔ سچّے طالب ہوجاؤ۔ دیکھیے اگر طالبِ کیمیا کو معلوم ہوجائے کہ فلاں شخص کیمیا گر ہے اور وہ اس سے یوں کہے کہ کیمیا اس وقت بتلاؤں گا جب کہ پھٹے کپڑے پہنو، تو وہاں کچھ بھی پرواہ نہ کروگے، نہ منصب کی، نہ جاہ کی، کیمیا کی امید میں سب کچھ گوارا کروگے، تو دین کے باب میں یہ انقیاد کیوں نہیں گوارا ہوتا۔ طالب کی شان تو یہی ہے کہ جس طرح چلائے چلے۔ طبیب مُسہل دیتا ہے تو کہتا ہے: سونا مت، دستوں کے دھیان میں رہنا۔

حکیم صاحب کا کہنا سر آنکھوں پر قبول، مگر اللہ والے بتلائیں تو یوں کہیں گے کہ یہ تو ترکِ دنیا بتلاتے ہیں۔ وہ اصل سب جگہ جاری کیوں نہیں کی جاتی؟ یہ کیا معنی کہ کہیں تیتر اور کہیں بٹیر۔ اگر وہاں خیال ہے کہ طبیب کے کہنے پر عمل نہ کرنے سے صحت نہ ہوگی، یہاں بھی یہی سمجھ لو کہ اس کے کہنے پر عمل نہ کروگے تو صحت نہ ہوگی۔ کیوں کہ طبیبِ ظاہری امراضِ ظاہری کا معالج ہے، اہل اللہ امراضِ باطنی کے معالج ہیں۔ اسی کو کہتے ہیں:

چند خوانی حکمت یونیاں
حکمت ایمانیاں را ہم بخواں
صحت ایں حس بجوئید از طبیب
صحت آں حس بجوئید از حبیب

صحت ایں حس ز معموری تن
صحت آں حس ز تخریب بدن

یونانی حکمت کی کتابیں کب تک پڑھتے رہو گے، کچھ حکمتِ ایمانی یعنی معرفت کی تو پڑھو۔ اس حسِ جسمانی کی درستی چاہتے ہو تو طبیب سے رجوع کرو، اور اگر حسِ روحانی کی درستی منظور ہے تو مرشدِ کامل سے رجوع کرو۔ حسِ جسمانی کی صحت بدن کی درستی سے ہوتی ہے، اور حسِ روحانی بدن کی تخریب سے ہوتی ہے۔

اللہ والوں کے سامنے اپنے آپ کو مٹانے سے دین آتا ہے:

اور یاد رکھو! میں بشارت دیتا ہوں کہ اللہ والے جو بتلائیں گے وہ بہت آسان اور تھوڑے دنوں کا کام ہے، مگر اس کے نافع ہونے کی یہ ضرور شرط ہے کہ اپنے آپ کو اللہ والوں کے تابع بنادیں۔ اپنے نفس کی خواہش اور رعونت کو بالائے طاق رکھ دیں۔ اپنے کو ان کے سامنے فنا کردیں۔ جیسے وہ کہیں ویسے عمل کریں۔ اگر چاہو کہ یہی تنعم رہے اور اللہ والے ہمارے نوکر بن کر رہیں تو یہ ہونے سے رہا۔ تنعم سے کام نہیں چلتا۔ مگر ترکِ تنعم کے یہ معنی مت سمجھنا کہ وہ کھانا پینا چھڑائیں گے۔ کھانا پینا ہرگز نہ چھڑائیں گے، ہاں نفس کی تھوڑی سی مخالفت کرائیں گے۔

مثلاً کسی میں کبر ہے جو ایک مرض ہے، اور اس مرض کے مریضوں کی حالت مختلف ہوتی ہے۔ بعض کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اگر اچھا کپڑا پہنیں تو کبر ہو اور گھٹیا پہنیں تو کبر نہ ہو۔ اور بعض کی حالت یہ ہوتی ہے کہ گھٹیا کپڑا پہنیں تو کبر ہو اور بڑھیا کپڑا پہنیں تو کبر نہ ہو۔ سو اہل اللہ ہر شخص کا علاج اس کے حسب حال کریں گے۔

پس بعض کو ترکِ تنعم کرائیں گے اور بعض کو تنعم کا امر فرماویں گے۔ اور اس میں خود صاحبِ مرض کی رائے قابلِ اعتبار نہیں، کیوں کہ علاج تجویز کرنا طبیب کا کام ہے مریض کا کام نہیں، اس لیے ضروری ہے کہ اس کے تابع ہو جاؤ اور كَالْقَلَمِ فِيْ يَدِ الْكَاتِبِ (مثل قلم کے کاتب کے ہاتھ میں) بن جاؤ، وہ آپ کو طریقہ بتلائیں گے۔ یہ انہیں (اہل اللہ کو)

ضرور کرنا پڑے گا۔ اور دنیا داریوں نہ سمجھیں کہ وہ حضرات ان ہی کے افعال پر دارو گیر اور اس میں تبدیلی کرتے ہیں۔ وہ تو ظاہری دین داروں کی بھی ایسی ہی گت بناتے ہیں جو جبے قبے ڈاٹے ہوئے، صدری پہنے، گھڑی لگائے ہوتے ہیں۔

چناں چہ ایک صاحب صدری پہنے ہوئے، گھڑی لگائے، اپنی شان بنائے ہوئے طلب طریق کے لیے آئے۔

میں نے کہا: یہ کیسی شکلِ طاؤسی بنائی ہے۔ وہ بولے کہ صدری اس لیے پہنی ہے کہ گھڑی رکھی جاسکے۔ میں نے کہا: کیا صدری کرتے کے نیچے نہیں پہن سکتے تھے؟ گھڑی تو وہاں بھی رکھی جاسکتی تھی، کیا شان دکھانے ہی کی شکل گھڑی رکھنے کی موقوف علیہ ہے۔ چناں چہ ان کو وہ صدری نیچے پہنائی گئی۔ غرض ان دین داروں کی بھی بے ڈھب گت بنتی ہے۔ اگر اتنا بھی نہیں ہوسکتا (یعنی شیخ کا اتنا بھی) اتباع نہیں ہوسکتا کہ جو بات نفس کے خلاف بتلائے اس پر آمادہ ہوجاویں تو پھر کچھ بھی نہیں۔

دین کے لیے تھوڑی بہت تکلیف برداشت کرنی ہی پڑتی ہے:

مولانا نے ایک قصّہ لکھا ہے کہ کوئی شخص کسی گودنے والے کے پاس اپنی کمر پر شیر کی تصویر بنوانے گیا تاکہ کمر میں قوت رہے۔ چناں چہ وہ بدن ننگا کرکے تصویر بنوانے بیٹھا۔ گودنے والے نے تصویر بنانا شروع کی۔ دم سے ابتدا کی۔ کچ سے سوئی چبھوئی تو آپ کہتے ہیں: آہ! پھر پوچھتے ہیں کہ کیا بنا رہے ہو؟ اس نے کہا کہ دُم بنا رہا ہوں۔ آپ نے کہا کہ یہ شیر مکھیاں تھوڑا ہی جھلے گا، ضرورت ہی کیا ہے دُم کی؟ اس نے دم چھوڑ کر پیٹ بنانا شروع کیا۔ دوسری جگہ کچ سے سوئی چبھوئی۔ پھر کہا: آہ! اور پوچھا: اب کیا بناتے ہو؟ اس نے کہا کہ پیٹ بناتا ہوں۔ آپ بولے کہ یہ کوئی کھائے گا تھوڑا ہی، پیٹ بھی جانے دو۔ اس نے تیسری جگہ سوئی چبھوئی۔ پوچھا: اب کیا بناتے ہو؟ اس نے کہا کہ سر بناتا ہوں۔ آپ بولے کہ یہ دیکھے یا سنے گا تھوڑا ہی، اس کو بھی رہنے دو۔ اس پر گودنے والے نے جھلا کر سوئی پھینک دی اور کہنے لگا:

شیر بے گوش وسر وشکم کہ دید

ایں چنیں شیرے خدا خود نافرید

بے کان اور سر اور پیٹ کا شیر کس نے دیکھا ہے؟ ایسا شیر تو خدا نے بھی پیدا نہیں کیا۔

کہ ایسا شیر تو خدا نے بھی پیدا نہیں کیا کہ جس کے نہ کان ہوں، نہ سر، نہ پیٹ۔ پھر میں کیا بناؤں؟ تمہارا سر؟ تو جیسے اس تصویر بنوانے والے نے چاہا تھا کہ تکلیف تو ہو نہیں اور شیر کی تصویر بن جائے، ایسے ہی ہم لوگوں کی حالت ہے کہ کچھ تکلیف تو ہو نہیں اور کام ہو جاوے۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں:

چوں نداری طاقت سوزن زدن

پس تو از شیر ژیاں ہاں دم مزن

جب تم کو سوئی چبھنے کی برداشت نہیں ہے تو پھر ایسے شیر کا نام مت لینا،

یعنی اگر مشقت و ریاضت کا تحمّل نہیں ہے تو طلب حق کا دعویٰ نہ کرنا۔

ہماری تو یہ حالت ہے کہ ذرا شیخ نے تنبیہ کی اور شکایتیں پیدا ہونے لگیں۔ لَا حَولَ وَلَا قُوَّۃَ یہ کیا لغو بات ہے؟ کیا اتنا بھی تحمّل نہیں؟ اس کو فرماتے ہیں:

تو بیک زخمے گریزانی زعشق

تو بجز نامے چہ میدانی زعشق

جب تم ایک ہی زخم سے بھاگتے ہو تو تم بجز عشق کے نام کے کچھ نہیں جانتے۔

مشائخ کی تربیت اور اصلاح بالکل ایسی ہے جیسے آپریشن ہو:

اے صاحبو! ہر طالب کو مشائخ کی طرف سے تنبیہات ہوتی ہیں اور نفس کی مخالفت کرائی جاتی ہے۔ مشائخ کی تربیت اور اصلاح بالکل ایسی ہے جیسے آپریشن۔ آپریشن میں پہلے چیرتے پھاڑتے ہیں پھر اس کی درستی کرتے ہیں۔ اسی طرح یہاں بھی پہلے نفس کی تھوڑی سی مخالفت کراتے ہیں، پھر نرمی اور توسع کرتے ہیں۔ تعجب ہے کہ آپریشن سے کوئی برا نہیں مانتا اور یہاں لوگ ذرا ذرا سی بات پر بگڑتے ہیں۔ آپریشن کرنے والے کو تو فیس بھی دیتے ہیں، اس کی شکر گذاری بھی کرتے ہیں۔ یہاں شکر گزاری نہ کرو تو برا بھی مت کہو۔ بس تھوڑے

دنوں نفس کی مخالفت ضرور کرنا پڑے گی۔ بعضوں کو تنبیہ سے عزت کم ہوجانے کا خیال ہوتا ہے۔

سو صاحبو! ہماری عزت ہی کیا ہے جس کے جانے کا خیال ہو؟ ﴿فَإِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا﴾ عزت تو صفت حقیقیہ اللہ ہی کی ہے اور یہ مشقت چند روز ہے، پھر اس کے بعد وہ راحت ہوگی کہ دنیا کے اسباب میں کبھی خواب میں بھی نہ دیکھی ہوگی۔ لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے آرام میں ہیں، مگر واقعی یہ ہے کہ یہ حُبِّ مال اور حُبِّ جاہ والے بڑی بلاؤں میں مبتلا ہیں۔

اہل اللہ کی صحبت میں رہنے سے کیا ہوتا ہے:

اگر اہل اللہ کی صحبت میں رہ گئے اور ان کے کہنے پر عمل کر لیا، اس وقت محبوبِ حقیقی کے ساتھ وہ تعلّق ہوجائے گا کہ دوسرے پر نظر ہی نہ رہے گی اور یہ حال ہوجاوے گا:

یکے خوان یکے دان یکے بین یکے گو

ایک ہی کو پڑھ، ایک ہی کو جان اور ایک ہی کہہ۔

یعنی اسی کا خیال رہ جاوے گا۔ پھر ایسے شخص کو کسی چیز سے بھی پریشانی نہیں ہوگی اور حقیقی راحت اس وقت دیکھو گے۔ بس یہ ثمرہ ہوگا جو طریقہ سے کام کرو گے۔

کام کرنے کا خلاصہ:

خلاصہ یہ ہے کہ ایک شخص کا اتباع کرنے سے یہ دولت حاصل ہوگی۔ اوپر ذکر اس پر تھا کہ کتابیں دیکھیے اور اسی کے ضمن میں یہ مضمون مربی کے اتباع کا آ گیا تھا کہ کتابیں بھی اسی سے منتخب کرائے۔ اب میں اسی کی طرف عود کرتا ہوں کہ وہی کتابیں عورتوں کو بھی سنایا کیجیے اور خود بھی پڑھیے، تعلیم عام ہوجائے گی۔ یہاں تک قوتِ علمیّہ کی تکمیل کا بیان تھا۔ اب ایک دوسری چیز بھی ہے کہ قوتِ عملیہ درست ہو۔

قوتِ عملیہ کے واسطے ہمت کی ضرورت ہے:

قوتِ عملیہ کی حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ احکام معلوم ہوں ان پر عمل کیا جائے۔ اور اس قوتِ عملیہ کے واسطے ایک چیز کی اور ضرورت ہوگی جس کا نام ہے ہمت۔ اور میں ہمت بڑا سا بوجھ اٹھانے کو نہیں کہتا ہوں جس کا اٹھانا بھی مشکل ہو، بلکہ مطلب اس کا یہ ہے کہ قصدِ مصمّم

کر لیجیے اس امر کا کہ جس وقت جس چیز کا ضروری ہونا آپ کو معلوم ہوا ہو اسی کو کرنا شروع کر دیا، دل میں وسوسہ بھی نہ لائیے کہ معلوم نہیں یہ کام ہم سے ہوگا بھی یا نہیں؟ بس شروع کر دیجیے۔ مثلاً نماز ہے اس کو شروع کر دیجیے، روزہ ہے پس شروع کر دیجیے۔ سوچیے ہی نہیں کہ معلوم نہیں ہم سے رکھا بھی جائے گا یا نہیں۔

کانپور میں ایک صاحب تھے جنہوں نے رمضان شریف کے روزے کبھی رکھے ہی نہ تھے۔ میں نے کہا کہ آج کا روزہ رکھ لو، گناہ ہوگا، خواہ رکھ کر اگر پورا نہ ہو سکے توڑ ہی دینا مگر شرارت نہ کرنا۔ چناں چہ وہ روزہ پورا ہو گیا۔ کہنے لگے: آج کا تو روزہ ہو گیا۔ میں نے کہا کہ ایک اور رکھ لو۔ دوسرے روز بھی ہو گیا۔ پھر کہنے لگے کہ یہ تو بہت ہی آسان ہیں، اب تو سارے مہینے رکھیں گے۔ چناں چہ سب رکھ لیے۔ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ جب عزمِ مصمّم ہوتا ہے تو حق تعالیٰ تائید فرماتے ہیں۔ اگر پہلے سے وسوسہ شروع کر دیے کہ معلوم نہیں یہ کام ہوگا یا نہیں؟ تو پھر کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اور اگر ایسے ہی وسوسے لانا ہے تو کھانے میں کیوں نہیں کہتے کہ میں کھانا کھاؤں یا نہیں؟ ممکن ہے کہ کھانا کھا کر ہیضہ ہو جائے، ممکن ہے کہ میں مر جاؤں۔ دونوں وقت یوں ہی کیا کیجیے۔ بس خاتمہ ہو جاوے گا۔ وہاں تو شبہ بھی نہیں ہوتا اور یہاں یہ خیالات ہوتے ہیں کہ شاید یہ نہ ہو، شاید وہ نہ ہو۔ میں کہتا ہوں کہ اگر نہ ہوگا تو پورا مت کیجیو، شروع تو کر دو۔

توبہ ٹوٹنے کے خیال سے یہ نہ کریں کہ توبہ نہ کریں:

لوگ کہتے ہیں کہ رشوت سے توبہ نہیں ہوتی، توبہ کرنے سے کوئی نتیجہ نہیں، نبھنے کی توبہ نہیں۔ میں کہتا ہوں: ایک دفعہ توبہ تو کرلو، اگر ٹوٹ جائے پھر کر لیجیو، خدا تعالیٰ آپ کے قصدِ مصمّم کر لینے پر آپ کو نہیں چھوڑیں گے۔ غیب سے ایسے اسباب پیدا ہو جاویں گے کہ سب سامان ہو جاوے گا۔ اگر کوئی کہے کہ یہ تو دل لگی ہوئی کہ توبہ کی اور توڑ دی۔ میں کہتا ہوں: کیا آپ صاحبِ قانون ہیں، جن کا قانون ہے وہ تو یوں کہتے ہیں کہ اگر کوئی دن میں ستّر مرتبہ خطا کرے اور پھر توبہ کر لے تو قبول ہے۔ جن کا قانون ہے وہ تو یوں کہتے ہیں اور آپ یوں کہتے

ہیں مدعی سست گواہ چست۔ آپ کا مذہب تو یہ ہونا چاہیے:

چوں طمع خواہد زمن سلطان دیں
خاک برفرق قناعت بعد ازیں

سلطان دیں جب مجھ سے طمع کا خواہاں ہو، تو پھر قناعت کے سر پر خاک ڈال دوں گا۔

جب وہ لنگڑی لنجی توبہ کو قبول کرتے ہیں، تو آپ کون ہیں قانون قانون چھانٹنے والے؟ وہ یوں کہتے ہیں کہ اگر نہ نبھے تو بھی قبول کرلوں گا، تو اس میں آپ کا کیا بگڑتا ہے؟ کیا اس کا جواب ہے کسی کے پاس؟ اصل یہ ہے کہ یہ شریر نفس کچھ نہیں کرنے دیتا:

خوئے بدرا بہانہ بسیار

بدعادت کے لیے سینکڑوں بہانے ہیں۔

اس طریقہ سے کر کے تو دیکھو، اول تو گناہ چھوٹ ہی جائے گا۔

گناہ نہ چھوٹے تو کیا کرے:

اور میں اخیر درجہ میں کہتا ہوں کہ اگر گناہ کسی طرح نہیں چھوٹتا تو خیر، دو باتیں تو کرلو: ایک تو گناہ کو گناہ سمجھو۔ اب تو یہ حالت ہے کہ گناہ کو گناہ بھی نہیں سمجھتے، یہ زیادتی ہے۔

لوگ ڈاڑھی منڈاتے ہیں اور اس کو گناہ نہیں سمجھتے اور اس کو گناہ بتلانے والے سے مہمل مہمل سوال کرتے ہیں۔ چناں چہ ایک شخص کہنے لگے کہ ڈاڑھی رکھنے کا وجوب قرآن میں کہاں ہے؟ میں کہتا ہوں کہ اس کی تو ایسی مثال ہے کہ کوئی شخص آپ پر دعویٰ کردے اور ثبوت میں پورے گواہ پیش کردے، کوئی کسر باقی نہ رہے اور حاکم آپ پر ڈگری کردے۔ اس پر آپ حاکم سے کہیں کہ ثبوت سب پورا ہے، گواہ سب ٹھیک ہیں، مگر میں تو جب مانوں گا کہ صاحب کلکٹر گواہی دیں۔ تو حاکم یوں کہے گا کہ ثبوتِ خاص مدعی کے ذمہ نہیں، مطلق ثبوت اس کے ذمہ ہے۔ اسی طرح یہ ضرور نہیں کہ ہر معاملہ میں قرآن ہی کی شہادت ہو۔ ہمارے لیے احکام کے ثابت کرنے کو چار دلائل ہیں۔ ہمیں اختیار ہے کہ ہم جس ایک سے بھی چاہیں ثابت کردیں۔

صحیح جواب تو یہ ہے، مگر آج کل لوگوں کا عجیب مذاق بگڑا ہے۔ اگر کوئی قرآن شریف سے ثابت کرنے کا دعویٰ کرے گو ثابت نہ کر سکے تو بڑے خوش ہوتے ہیں۔

ایک شخص مجھ سے کہنے لگا کہ میں نے ایک شخص کے مقابلہ میں ڈاڑھی کو قرآن شریف سے ثابت کر دیا۔ اس طرح سے کہ دیکھو قرآن میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ہارون علیہ السلام کی ڈاڑھی پکڑ لی تھی۔ معلوم ہوا کہ ہارون علیہ السلام کی ڈاڑھی تھی۔ تو دیکھو! قرآن سے ڈاڑھی کا ہونا ثابت ہو گیا۔ میں نے مستدل صاحب سے کہا کہ اگر وہ معترض یوں کہتا کہ اس سے تو ڈاڑھی کا وجود ثابت ہوا، وجوب ثابت کرو، تو آپ کیا کہتے؟ کہنے لگے کہ اتنی عقل معترض کو تھوڑا ہی تھی۔ اس وقت جتنے لیکچرار ہیں ان کے دلائل کی یہی کیفیت ہے کہ ادنیٰ طالب علم ان میں شبہ کر سکتا ہے مگر وہ خوش ہیں۔ غرض قرآن سے ثبوت چاہتے ہیں۔ اصل مقصود یہ ہے کہ حرام ہونا ثابت نہ ہو۔

زمانہ کا مذاق کہ حرام کو حرام نہیں سمجھتے:

اس زمانہ میں یہ مذاق بہت ہی غالب ہو گیا ہے کہ حرام کو حرام نہیں سمجھتے۔ لاہور میں بعض لوگوں کا خیال معلوم ہوا کہ سود کو حلال کرنے کی فکر میں ہیں تا کہ مسلمانوں کو ترقی ہو۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ آپ کے زعم کو اگر تسلیم بھی کر لیا جاوے کہ سود ترقی کا ذریعہ ہے، تو یہ سوچیے کہ ترقی کا مدار سود لینے پر ہے یا اس کو حلال سمجھنے پر؟ کیا آپ کے پاس اس کی کوئی دلیل ہے کہ ترقی حلال سمجھنے پر موقوف ہے، تو اس کے ذریعہ ترقی بنانی اس کے اعتقادِ حلت میں کیوں کوشش کی جاتی ہے؟ اگر سود لیتے ہو تو گناہ تو سمجھو۔ یوں تو سمجھو کہ گوہ کھا رہے ہیں، برا کر رہے ہیں۔ ایک بات تو یہ تھی کہ گناہ کو گناہ سمجھیں۔

گناہ نہ چھوٹے تو دوسرا کام یہ کرے:

دوسری بات یہ ہے کہ ایک پندرہ منٹ کے لیے روزمرہ خدائے تعالیٰ سے اس طرح عرض کر لیا کریں کہ اللہ! میں نہایت خبیث ہوں۔ بڑا گناہ گار ہوں۔ سر تا پا معاصی میں بھرا ہوا ہوں۔ میری قوت نہیں کہ معاصی چھوڑ سکوں۔ آپ میری مدد فرمائیں۔ میں شرمندہ ہوں آپ

کے سامنے۔ بس اس طرح روزمرہ خدا سے عرض کرلیا کرو۔

خلاصہ یہ ہے کہ کرنے والے کے لیے سوراستے ہیں اور نہ کرنے والے کے لیے ایک بھی نہیں۔ آپ نے کسی سے نہ سنا ہوگا جو میں نے کہا کہ سب کچھ کرتے رہو، مگر یہ بھی کرلیا کرو۔ سو یہ تو مشکل بات نہیں۔ اب آپ کو کون سا عذر ہے کہ ہم خدا تعالیٰ کے راستہ پر نہیں چل سکتے۔ یہ طریقہ ہے قوت عملیہ سے کام لینے کا۔

بعض اعمال عورتوں کے متعلق:

اب بعض اعمال خاص عورتوں کے متعلق عرض کرتا ہوں۔ ایک تو عورتوں میں نماز کی پابندی نہیں، اور اگر یہی ترک رہے تو کھانا بھی ترک کردو۔ مگر حالت یہ کہ نماز تو پانچ وقت کی قضا ہو جاوے اس کی ذرا پروا نہیں، مگر کھانا ایک وقت کا بھی ناغہ نہ ہو۔ ایک یہ کہ زکوٰۃ کی عادت نہیں۔ زیور کو عورتیں یوں سمجھتی ہیں کہ یہ تو برتنے کی چیز ہے، اس میں زکوٰۃ کیا ہوتی؟ خوب سمجھ لو کہ ہمارے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک زیور میں زکوٰۃ واجب ہے۔ ایک یہ کہ عورتیں حج بھی نہیں کرتیں، ان کو حج کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اور اب تو حج کے ذرائع بھی بہت آسان ہوگئے ہیں۔ حج نہ کرنے پر سخت وعید آئی ہے۔

عورتوں میں خاوند کی نافرمانی کا خاص مرض:

ایک خاص مرض عورتوں میں یہ ہے کہ خاوندوں کی نافرمانی کرتی ہیں۔ گو بعض مرد بھی ظلم کرتے ہیں، مگر بعض عورتیں ایسی ہیں کہ باوجود مدارات کے پھر خاوندوں کو تنگ کرتی ہیں۔ اور ہندوستان کی عورتوں کی خدمت کا انکار نہیں، مگر اس کا حاصل یہ ہے کہ جسم کو راحت پہنچاتی ہیں اور روح کو تکلیف دیتی ہیں۔ صرف جسمانی خدمت بہت کرتی ہیں، اس میں بے نظیر ہیں۔ اسی طرح عفیفہ بھی بہت ہیں۔ عفت کے خلاف تو شاید ان کو کبھی وسوسہ بھی نہ آتا ہوگا، مگر زبان ان کی ایسی ہیں کہ جو جی میں آیا کہہ دیا، کچھ روک ہی نہیں۔ اس سے خاوند کی روح کو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ اس کی اصلاح کا آسان طریقہ یہ ہے کہ زبان کو بند رکھیں۔ اس میں پہلے پہلے بے شک دشواری ہوگی، مگر پھر عادت ہوکر اس سے نجات ہو جاوے گی۔ اصل علاج

یہ ہے، نہ وہ جو بعض عورتیں نمک پڑھواتی ہیں خاوند کے تابع بنانے کو، آپ جو چاہیں کہہ لیں، مگر وہ چپکا سنا کرے۔

اس پر ایک حکایت یاد آئی۔ کسی بزرگ کے پاس ایک عورت آئی اور کہا کہ ایسا تعویذ کر دیجیے کہ میرا خاوند مجھے کچھ نہ کہا کرے۔ انہوں نے پانی پر جھوٹ موٹ چُھو کر کے دے دیا اور کہا کہ یہ پانی بوتل میں رکھ لینا۔ جس وقت خاوند آیا کرے اس میں سے تھوڑا پانی اپنے منہ میں لے کر بیٹھ جایا کرو اور وہ جب تک چلا نہ جائے منہ میں لیے رہا کرو۔ بس وہ پانی پانی ہو جاوے گا۔ اس نے ایسا ہی کیا کہ جہاں خاوند آیا، ڈاٹ کھولی، پانی منہ میں لے کر بیٹھ گئی۔ کچھ عرصہ کے بعد شوہر مہربان ہوگیا۔ وہ عورت ان بزرگ کے پاس نذرانہ لائی اور کہا کہ حضرت! اب تو وہ مجھے کچھ نہیں کہتا۔ ان بزرگ نے ہنس کر فرمایا: وہ تو ایک ترکیب تھی، کوئی جھاڑ پھونک نہ تھی۔ مجھ کو قرائن سے معلوم ہوگیا تھا کہ تو زبان دراز ہے، اس وجہ سے خاوند سختی کرتا ہے۔ میں نے زبان روکنے کے لیے یہ ترکیب کی تھی۔ بس اب زبان درازی مت کرنا۔ باقی یہ روپیہ اور مٹھائی میں نہیں لیتا۔ واقعی زبان بڑی آفت کی چیز ہے۔

پردہ میں کمی کا مرض:

ایک یہ کہ عورتوں کو پردہ کا لحاظ نہیں ہوتا۔ اکثر گھروں میں دور دور کے رشتہ داروں کے سامنے آئیں گی اور پھر تعریف یہ ہے کہ یہی عورتیں اپنے کو پردہ دار اور باہر پھرنے والی عورتوں کو بے پردہ کہتی ہیں، حالاں کہ پردہ دار وہ ہے کہ جس جس سے شرع میں پردہ ہے ان سے پردہ کرے۔ پردہ کے ساتھ قرآن کی تعلیم ہے عورتوں کو کہ مردوں کے ساتھ نرم لہجہ میں گفتگو بھی مت کرو۔ واقعی قرآن میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جذبات کی پوری رعایت ہے۔ نرم لہجہ سے اجنبی شخص کا ضرور میلان ہوتا ہے۔ کیسی عجیب سچّی بات ہے۔ اور سخت لہجہ سے اجنبی مرد کو نفرت ہوتی ہے، اس طرح سے آواز کا بھی پردہ ہے۔ عورتوں کو ایک اس امر کا بھی لحاظ چاہیے کہ کپڑا شریعت کے موافق ہو، بڑا چھوٹا نہ ہو، اس میں بدن نہ جھلکتا ہو۔

گھر کا کام کاج:

یہ ضروری اعمال تھے جو میں نے بیان کیے۔ یہ تعلیمات تو سب کے لیے ہیں اور بعض

خاص عورتوں کے لیے کہ وہ گھر کا کام نہیں کرتیں، گھر کی نگرانی نہیں کرتیں۔ حدیث میں ہے کہ عورتیں حاکم ہیں گھر میں۔ گھر کے انتظام کے متعلق ان سے پوچھا جائے گا۔ نگرانی نہ کرنے سے گھر میں چوری ہوتی ہے۔ اس کا بہت خیال چاہیے۔ گھر کا کام کرنا چاہیے۔ دوسروں پر نہ چھوڑنا چاہیے۔

غیبت کا مرض:

ایک امر اعمال میں سے اور یاد آگیا، وہ یہ کہ عورتیں غیبت بہت کرتی ہیں۔ خود بھی حکایت شکایت کرتی ہیں اور اوروں سے بھی سنتی ہیں اور اس کی جستجو میں رہتی ہیں۔ کوئی باہر سے آئی اور پوچھنا شروع کیا کہ فلاں فلانی مجھ کو کیا کہتی تھی؟ گویا منتظر ہی تھیں، آنے والی نے کچھ کہہ دیا کہ یوں یوں کہتی تھی۔ بس پھر تو پل باندھ لیا۔ خوب سمجھ لو کہ اس غیبت سے نا اتفاقی ہو جاتی ہے۔ آپس میں عداوت قائم ہو جاتی ہے۔ علاوہ اس کے غیبت کرنا اور اس کا سننا خود بڑا گناہ بھی ہے۔ کلام اللہ میں اس کی بڑی مذمت آئی ہے۔

عورتوں میں ایک اور مرض مردوں کے ساتھ مشابہت:

عورتوں میں ایک اور بھی مرض ہے۔ مجھ کو یہاں کی خبر نہیں مگر اپنے قصبہ کی حالت عرض کرتا ہوں۔ بعضی عورتیں کھڑے جوتے پہنتی ہیں۔ حدیث میں اس امر پر لعنت آئی ہے کہ عورتیں مردوں کی وضع اختیار کریں۔ آج کل بہت جگہ عورتوں کو فیشن کا بہت اہتمام ہو گیا ہے۔ دوسری قوموں کی وضع بناتی ہیں۔ سایا پہننے لگی ہیں۔ کانپور میں دیکھا، بعض عورتیں اچکن پہنتی ہیں۔ یہ آفت اب نازل ہوئی ہے۔ اور بعض جگہ عورتیں خود ایسا نہیں کرتیں، مگر بعض مرد اُن عورتوں کو اس پر مجبور کرتے ہیں۔ مگر یہ سمجھ لیجیے کہ لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ کہ اللہ کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت نہیں۔ پس عورتوں کو چاہیے کہ مردوں کے کہنے سے ایسا لباس ہرگز نہ پہنیں کہ اس میں تشبہ ہے مردوں کے ساتھ۔

ایک قوم کو دوسری قوم کے ساتھ مشابہت کی مخالفت:

آج کل لوگوں کو اس مسئلہ میں بھی شبہ ہے، غیر قوم کی وضع اختیار کرنے کے متعلق کہتے

ہیں: کیا اس سے ایمان جاتا رہتا ہے؟ اس باب میں دو مثالیں عرض کرتا ہوں۔ اس وقت سلاطین میں جنگ ہورہی ہے۔ اگر کوئی شخص جو برطانیہ کی فوج میں ہو وہ جرمنی سپاہی کی وردی پہن لے اور منصبی خدمت میں کوئی کوتاہی نہ کرے، تو کیا اس کا یہ فعل موجبِ ناخوشی افسران نہ ہوگا؟

دوسری مثال لیجیے کیا کوئی مرد زنانہ کپڑے پہننا اپنے لیے تجویز کرسکتا ہے؟ ذرا زنانہ کپڑے اور پازیب اور جوشن وغیرہ پہن کر جلسۂ عام میں بیٹھ تو جائیں۔ زنانی وضع میں سوائے تشبہ کے اور کیا عیب ہے؟ افسوس! ایک مسلمان تو دوسرے مسلمان کی وضع اختیار نہ کرے، کیوں کہ اس مثال میں فرق اگر ہے تو صرف مرد اور عورت کا ہے، اسلام تو مشترک ہے۔ اور مسلمان ہوکر غیر مسلمان کی وضع اختیار کرے۔

بعضے لوگ کہتے ہیں کہ بضرورت پہنتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر اس کی ضرورت تسلیم بھی کرلی جاوے تو کیا ہر وقت ہی ضرورت رہتی ہے؟ یہ سب حیلے ہیں، میں اس کا اصلی گُر بتلادوں۔ صرف بات یہ ہے کہ یہ ایسی قوم کی وضع ہے جو رعب وادب والی قوم ہے، اس کو محض اس لیے اختیار کرتے ہیں کہ ہمارا بھی رعب پڑے، اہلِ ہیبت کی وضع بناتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ کون سا کام اٹکا ہوا ہے اس ہیبت پر؟ اس کا منشا محض کبر ہے۔ بس اپنے کو بڑے بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ بڑا بننا قانونِ الٰہی میں بڑا جرم ہے، گو تعزیراتِ ہند میں نہ ملے گا مگر تعزیراتِ شرع میں ملے گا۔ حضور ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ جس کے قلب میں رائی کے دانہ کے برابر بھی کبر ہوگا جنّت میں نہیں جاسکتا۔ جو جنّت کو نہ مانے وہ تو مخاطب ہی نہیں، مگر جو جنّت کو مانتا ہے وہ سمجھ لے کہ اس پر کیسی وعید ہے۔ جنّت جیسی چیز کا ہاتھ سے جاتا رہنا کیا چھوٹی بات ہے؟ حدیث کے علاوہ قرآن شریف میں لیجیے، حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِیْنَ ۝﴾ (النحل: ۲۳)

اللہ تعالیٰ تکبّر کرنے والوں سے محبّت نہیں رکھتے۔

اور لیجیے شیطان محض سجدہ نہ کرنے سے اس درجہ کا راندۂ درگاہ نہیں ہوا بلکہ سبب اس کا یہی کبر تھا۔ چناں چہ قرآن شریف میں ہے: ﴿وَاسْتَكْبَرَ﴾ (اپنے آپ کو بڑا سمجھا) غرض اپنے کو بڑا سمجھنا یہ جرم ہے۔ اور یہ جو غلو پیدا ہوگیا ہے فیشن وغیرہ میں، منشا اس کا یہی کبر ہے۔

یہ عورتوں کے اعمال کی ضروری فہرست تھی۔

عورتوں میں رسوم کی پابندی:

ایک مرض ان میں اور بھی ہے جو مفسدہ میں سب سے بڑھ کر ہے۔ وہ یہ کہ عورتیں رسوم کی سخت پابند ہیں۔ اور تعجب یہ ہے کہ اکثر مرد بھی ان کے تابع ہوجاتے ہیں، اور بعض مرد جو اس میں مخالفت کرتے ہیں وہ دو قسم کے ہیں: ایک تو اہلِ دین جو دین کی حیثیت سے ان کا خلاف کرتے ہیں۔ دوسرے انگریزی تعلیم یافتہ جو کہ دینی حیثیت سے ان کی مخالفت نہیں کرتے، ہاں عقل کے خلاف سمجھتے ہیں۔ سو پہلے لوگ قابلِ قدر ہیں۔ باقی دوسروں کی مخالفت ایسی ہے کہ فَرَّمِنَ الْمَطَرِ وَوَقَفَ تَحْتَ الْمِيزَابِ ، یعنی بارش سے بھاگ کر پرنالہ کے نیچے کھڑے ہوگئے۔ وجہ یہ کہ عورتیں تو رسوم میں دو تین ہی بار عمر بھر میں صَرف کرتی ہوں گی، اس پر ان کو ملامت کی جاتی ہے کہ ہائیں! فضول خرچی کرتی ہو۔ اور خود رات دن اس سے بڑھ کر فضول میں مبتلا ہے۔ کہیں فوٹوگراف آرہا ہے، کہیں ہارمونیم ہے، کہیں ولایتی فضول چیزوں سے کمرہ سجایا جارہا ہے۔ چھ چھ جوڑے جوتے رکھے ہیں۔ فیشن کے کپڑے قیمتی قیمتی سلوائے جارہے ہیں۔ آٹھ روپیہ کا کپڑا اور سولہ روپے سلائی۔ بعض کے کپڑے لندن دھلنے اور سلنے جاتے ہیں۔ یہ لوگ رات دن اسی قصّہ میں مشغول ہیں۔ خود کی تو یہ حالت اور عورتوں کو فضول خرچ بتاتے ہیں۔

پس یہ حضرات جو عورتوں کو رسوم سے روکتے ہیں تو صرف اس لیے کہ دوطرفہ خرچ نہ ہو۔ یہ روکنا قابلِ قدر نہیں، ہاں دین کے سبب سے ہو وہ البتہ مطلوب ہے جس میں روکنے والا اپنے نفس کو بھی شریک رکھتا ہے، یعنی وہ بھی اس اصل کا عامل ہے۔ بعضے طعن و تشنیع کے خوف سے رسوم پر عمل کرتے ہیں، مگر جس میں احکام کی تعمیل کا مادہ ہوگا وہ رسوم کے ترک کرنے میں کسی کے طعن و تشنیع کا خیال بھی نہ کرے گا۔ اور گو یہ ہمت مسلمان سے کچھ بعید نہیں، لیکن آج کل بوجہ مخالفتِ عامہ کے قابلِ تعریف ہے۔ ایسا شخص آج کل ولی اور خدا کا مقبول ہے۔ ایک زندہ نظیر اس کی آپ کے پیشِ نظر ہے۔ میرے دوست تحصیل دار میاں عبدالحمید صاحب ہیں۔ ان کو اپنی دختر کی تقریب کرنا تھی۔ ماشاء اللہ انہوں نے نہایت تدیّن وخلوص سے کام لیا،

کیوں کہ بعض رسوم تو شرک و بدعت ہیں۔

سو یہ تو اکثر لوگوں میں سے جاتی رہیں۔ انگریزی تعلیم بھی ان کے مانع ہے اور دینی تعلیم بھی، مگر ایک دوسرے قسم کی رسوم ہیں جو تفاخر کے لیے کی جاتی ہیں، یہ متروک نہیں ہوئیں۔ ان کے کرنے والے بعضے کہہ دیتے ہیں کہ ہم نے ٹونے ٹوٹکے کچھ نہیں کیے، پھر ہم نے تقریب میں کون سی رسم کی؟ سو سمجھ لیجیے کہ جو یہ رسوم تفاخر کے لیے کی جاتی ہیں وہ بھی گناہ ہیں۔ چناں چہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس شخص کے کھانے سے منع فرماتے ہیں جو تفاخر کے لیے کھلائے۔

بس جو رسم تفاخر کے لیے کی جائے گی وہ منع کیوں نہ ہوگی؟ تو تحصیل دار صاحب نے یہ ہمت کی کہ ان رسموں کو بھی چھوڑا اور سُبکی کی کچھ پروا نہ کی۔ اور کمال یہ کیا کہ اتفاق سے میرے پاس تشریف لائے اور مجھ کو نکاح پڑھنے کے لیے وطن لے جانا چاہا۔ میں نے کچھ عذر کیا، تو انہوں نے سفر ہی میں اس کام کو تجویز کیا اور یہ تجویز ہوگئی کہ اسی جلسہ میں عقد کر دیا جائے۔ اس میں دو مصلحتیں ہوگئیں: ایک تو اس سنت سے اس گھر میں بھی برکت ہوگی۔ دوسرے یہ بھی معلوم ہو جاوے گا کہ نکاح یوں بھی ہو جاتا ہے۔

نکاح میں سادگی کا اہتمام:

اور حدیث سے تو یہی ثابت ہے کہ نکاح نہایت سادی چیز ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا نکاح ہوا تھا، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ مجلس میں موجود بھی نہ تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ پڑھ کر یوں فرمایا تھا کہ إِنْ رَضِيَ عَلِيٌّ بِذٰلِكَ یعنی اگر علی اس نکاح کو منظور کریں۔ جب علی کو خبر ہوئی تو انہوں نے فرمایا: میں نے قبول کیا۔ کیسا سادہ نکاح تھا کہ جہاں دولہا بھی موجود نہ تھے۔ بعضے اس سادگی کی وجہ میں یہ کہہ دیتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھا ہی کیا؟ فقر و فاقہ کی حالت تھی۔

تو خوب سمجھ لیجیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کمی کس بات کی تھی۔ جہاں جبرائیل علیہ السلام دربانی کریں۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تو ملائکہ آتے، جنّت سے جوڑے جہیز میں لاتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کیا پوچھتے ہو؟ اولیاء اللہ عجب عجب شان کے ہوئے ہیں کہ ان کی مرادیں مسترد نہیں

ہوتیں۔ کیا حضور ﷺ خواہش کرتے اور وہ مسترد ہوتی؟ حاشا وکلاّ! پھر رشتہ ہوا تو کس طرح کہ نہ نائی، نہ ڈوم، نہ رسم، نہ نشانی، صرف زبانی درخواست، زبانی منظوری۔ پہلے شیخین نے اپنے بارے میں حضور ﷺ سے فاطمہ کے نکاح کی بابت عرض کیا تھا کہ یہ شرف ہم کو حاصل ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ فاطمہ کی عمر کم ہے، تم سے مناسب نہیں ہے۔ پھر شیخین نے حضرت علی کو رائے دی کہ تم اپنے لیے عرض کرو۔ حضرت علی شرماتے تھے۔ ہمت دلا کر بھیجا کہ جاؤ، اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ حضرات شیخین اور حضرت علی میں کیسا اتحاد تھا۔ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر شرم غالب آئی، چپکے بیٹھ گئے۔ اسی وقت وحی آئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھ کو خدا تعالیٰ نے حکم کیا ہے کہ میں فاطمہ کا نکاح تم سے کر دوں، یہ تو رشتہ تھا۔ پھر نکاح ہوا تو کس طرح کہ نکاح کے وقت آپ ﷺ نے ایک صحابی سے فرمادیا کہ جو کوئی مل جاوے اسے بلا لو، پہلے سے کوئی اہتمام نہ کیا۔ نکاح کے بعد امّ ایمن رضی اللہ عنہا سے فرمادیا کہ حضرت فاطمہ کو پہنچا دو۔ وہ برقعہ چادر پہنا کر ہاتھ پکڑ کر جا کر پہنچا آئیں۔ اگلے دن حضور ﷺ ان کے گھر تشریف لائے، فاطمہ دلہن تھیں۔ ان ہی سے کہا کہ برتن میں پانی لاؤ۔ یہ دلہن ہے کہ شوہر کے سامنے پھر رہی ہیں۔ آپ ﷺ نے پانی ان کے منہ اور ہاتھ پر اور پشت پر چھڑکا۔ پھر اسی طرح حضرت علی کے ساتھ کیا۔ غرض آپ ﷺ نے دکھادیا نمونہ امت کو کہ کیا کیا کرو۔

غمی کی رسمیں:

اسی طرح غمی میں بھی کچھ نہیں کیا، صرف ایصالِ ثواب کر دیتے تھے۔ سعد رضی اللہ عنہ کی ماں مرگئی تھیں، انہوں نے کنواں بنوا کر کہہ دیا: هٰذَا لِأُمِّ سَعْدٍ، کہ اس کا ثواب سعد کی ماں کے لیے ہے۔ نہ فاتحہ دلائی، نہ کچھ کیا۔ اب تو مٹھائی کے دُونے لیے نیاز دلوانے کو پھرتے ہیں۔ جب تک خاص سورتیں پڑھ کر فاتحہ نہ دی جائے ثواب ہی نہیں ہوتا۔ اور مصلح کو کہتے ہیں کہ یہ منکر ہے ثواب کا۔ میں کہتا ہوں کہ اگر ایک شخص بے وضو اور قبلہ کو چھوڑ کر نماز کے لیے کھڑا ہوا اور کوئی اس کو منع کرے تو کیا وہ نماز کا منکر سمجھا جاوے گا۔ اسی طرح اس شخص کو جو قیودِ مروّجہ کے ساتھ فاتحۂ مروّجہ یا میلادِ مروّج کو روکے تو کہتے ہیں کہ یہ ذکرِ رسول ﷺ کا منکر ہے۔ ہم

کہیں گے کہ جس طرح وہ نماز کا انکار نہیں یہ ذکر کا انکار نہیں۔ ہاں تمہارے اس بے ڈھنگے پن سے دونوں جگہ روکتے ہیں۔ لوگوں نے اپنی طرف سے اختراعات کر لیے ہیں۔ ان لوگوں کی بالکل ایک نئی شریعت ہوگئی ہے۔ ایک نیا مذہب ہوگیا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا حضور ﷺ کی ہر تعلیم کے مقابلہ میں لوگوں نے ایک ایک رائے تجویز کر رکھی ہے۔ ہر امر میں مقابلہ کیا گیا ہے۔ شادی میں، غمی میں، بیع میں، شرا میں۔ ہمارا یہ اسلام و ایمان ہے کہ شادی غمی میں بھی رسول اللہ ﷺ ہی کا اتباع کرنا چاہیے۔ اور عورتوں کو زیادہ خصوصیّت کے ساتھ خطاب کرتا ہوں۔

آیت کے تفسیری نکات:

مقصود بیان تو سب ہوگیا۔ اب یہاں دو باتیں بطور نکتہ کے بیان کرنا باقی رہ گئیں۔ ایک تو یہ کہ یہاں تین صفتیں بیان ہوئیں: اَلْمُحْصَنٰتِ، الْغَافِلَاتِ، اَلْمُؤْمِنَاتِ دو صفت میں تو صیغہ اسمِ فاعل کا لائے یعنی الْغَافِلَاتِ، اَلْمُؤْمِنَاتِ، مگر اَلْمُحْصَنٰتِ صیغہ اسمِ مفعول کا لایا گیا۔ محصنات صیغہ اسمِ مفعول کا ارشاد فرمایا گیا۔ بات یہ ہے کہ اس طرح لانے سے ہمیں ایک سبق بھی دیا ہے جس کی ضرورت چودہویں صدی میں آکر واقع ہوئی، وہ یہ کہ اس میں مردوں کو پردہ کی تاکید کی گئی ہے، کیوں کہ اَلْمُحْصَنٰتِ کے معنی ہیں: پارسا رکھی ہوئی عورتیں، یعنی مردان کو پارسا رکھیں ان کے ذمہ ہے پارسا رکھنا۔

مرد کے ذمہ عورت کی عصمت کی حفاظت ہے:

معلوم ہوا کہ عورت اکیلی کافی نہیں جب تک مرد اس کو محفوظ نہ رکھے۔ اسم فاعل کے صیغہ سے یہ بات حاصل نہ ہوتی، اس لیے مفعول کا صیغہ لائے۔ دوسری یہ بات کہ بیچ میں غافلات کا لفظ کیوں؟ اس کی کیا ضرورت تھی؟ بات یہ ہے کہ اس کے بیچ میں ہونے سے دونوں صفتوں میں اتصال ہوگیا۔ اشارہ اس طرف ہے کہ قوتِ علمیّہ اور عملیہ کا کمال اس پر موقوف ہے کہ وہ غافلات بھی ہوں، یعنی ان کے خیالات محدود ہوں، عرفی تبادلۂ خیالات نہ ہوں، تب ان کا علم و عمل مقصود باقی رہ سکتا ہے۔ مردوں کے لیے تو وسیع خیالات کا ہونا کمال ہے اور عورتوں کے لیے یہ کمال ہے کہ غیر وسیع الخیال ہوں، ان کا مکان بھی محدود، آنا جانا بھی

نہ ہو، علم بھی محدود، یعنی صرف دین ہی کا علم ہو۔ اس زمانہ میں دونوں نکتوں کے مقتضیٰ کے خلاف کیا جا رہا ہے۔ چناں چہ بعض لوگ گھروں میں رکھنے کو قید کہتے ہیں، یہ لوگ ان کو آزاد رکھنا چاہتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ یہ قید نہیں ہے، بلکہ باہر نکلنا حقیقت میں قید ہے، کیوں کہ قید کی حقیقت ہے خلافِ مرضی محبوس کرنا۔ پس قید تو جب ہو کہ وہ باہر نکلنا چاہیں اور تم ہاتھ پکڑ کر اندر لے جاؤ، یہ ہے قید۔ ان کے لیے تو اگر طبع سلیم ہو بے پردہ ہو کر باہر نکلنا، یہ موت ہے۔ پس بے پردگی قید ہوئی پردہ میں رہنا قید نہ ہوا۔ بعضی عورتوں نے جانیں دے دی ہیں اور باہر نہیں نکلیں۔ ضلع اعظم گڑھ میں ایک شخص کا زمانۂ طاعون میں عارضی مکان چھپّر کا تھا۔ اس میں اتفاقاً آگ لگی، اس کی بی بی جل کر مرگئی۔ باہر نکل کر لوگوں کو صورت نہیں دکھائی۔ میں یہ فتویٰ بیان نہیں کرتا کہ یہ اچھا کیا۔ مطلب ان کے جذباتِ فطریہ کا بیان کرنا ہے۔ پھر لغت سے تائید لیجیے، خود عورت کے معنیٰ ہیں: چھپانے کی چیز۔ پھر واقعات دیکھ لیجیے۔ جہاں پردہ نہیں ہے ان کے واقعات دیکھ لیجیے اور ان واقعات کا اب انتظام آسان ہے، کیوں کہ پردہ عادتِ عامہ ہے اگر یہ اٹھ گیا پھر انتظام نہ ہو سکے گا۔ پھر وہ واقعات دیکھ کر آپ خود کہیں گے کہ پردہ ہونا چاہیے، مگر نہ ہو سکے گا۔ اس وقت علما کو آپ وحشیانہ خیال والے کہتے ہیں، مگر آئندہ چل کر معلوم ہو جاوے گا۔

ایک صاحب نے پردہ کی مذمت میں لکھ مارا تھا کہ دو شخصوں کی شادی ہوئی تھی۔ دلہنیں رخصت ہو کر جا رہی تھیں۔ ایک جگہ ریل بدلی گئی، ڈولی میں دونوں اتاری گئیں۔ اتفاق سے دونوں شخصوں کی بیبیاں بدل گئیں، اس کی تو اُس کے یہاں پہنچ گئی اور اُس کی اِس کے یہاں۔ آگے لکھا تھا: ''یہ ساری خرابی پردہ کی ہے۔'' خوب آپ نے اتفاقیات سے استدلال کیا۔ قصور لوگوں کا تھا کہ کیوں نہ خیال رکھا۔ اور جس طرح کثرت سے خرابیاں بے پردگی کے سبب پیش آتی ہیں ان کے سامنے ایسا ایک امرِ اتفاقی کس شمار میں ہے۔ اور اگر یہ قید ہی ہے تو عفت کی قید ہے۔ میرا ایک رسالہ[1] پردہ کے بارے میں ہے، بقیہ شبہات کے رفع کے لیے اس کو بھی

[1] پردہ کے شرعی احکام

دیکھ لیجیے !اور میں تو اخیر بات کہتا ہوں کہ اگر خدا اور رسول ﷺ کا حکم بھی پردہ کا وجوب کے درجہ میں نہ ہوتا اور واقعات بھی نہ ہوتے، تب آخر تو غیرت بھی کوئی چیز ہے۔ مرد کو تو طبعاً غیرت آنی چاہیے کہ اس کی عورت کو کوئی دوسرا دیکھے۔ پھر واقعات مزید برآں، خصوص اس زمانہ میں۔ اسی واسطے علُما نے لکھا ہے کہ جوان داماد یا دودھ شریک بھائی سے بھی احتیاط چاہیے بے مُحابا سامنے نہ آنا چاہیے۔ اس کے متعلق واقعات ہوئے ہیں۔ اور بعضے لوگ ان کو جدید علوم وفنون سکھلا کر ان کو وسیع الخیال بنانا چاہتے ہیں، مگر غافلات کا لفظ یہ بتلا رہا ہے کہ عورتوں کو غیر ضروری علوم سے غافل ہی ہونا چاہیے۔

خلاصۂ وعظ:

خلاصہ یہ کہ عورتوں کے واسطے قوت علمیّہ وعملیہ کی تکمیل کی ضرورت اور اس کے طریقہ کا بیان بقدر ضرورت ہوگیا، الحمد للہ۔ اب تقریر ختم کرتا ہوں اور اس وعظ کا نام ''العاقلات الغافلات'' رکھتا ہوں، یعنی وہ عورتیں جو ضروریات میں عاقل اور غیر ضروریات میں غافل ہوں۔ فقط

وعظ کے بعد نکاح:

وعظ کے بعد حضرت مولانا مدظلہم نے تحصیل دار عبدالحمید صاحب کی دختر کا نکاح پڑھا، جس میں صرف مبلّغ پانچ روپیہ کے چھوہارے حاضرین کو تقسیم ہوئے۔ بہت ہی سادہ طریقہ سے نکاح ہوا، کوئی بات بھی فخر یا رسم کی نہیں تھی۔ کیا اچھا ہو کہ مسلمان اس کی تقلید کریں۔ اسی طرح اگر ایسے موقع پر پہلے وعظ ہو جایا کرے بجائے اور رسوم کے تو کیسی اچھی بات ہو۔ میں نے اُمرا میں پورا سنت کے موافق صرف یہی نکاح دیکھا ہے۔

قارئین سے استدعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے دعا فرماویں کہ ناشر کی مساعیٔ دینیہ قبول فرماویں اور مقبولانِ حق کے ساتھ محشور فرماویں۔ آمین بِحُرْمَةِ سَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ ﷺ.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الوعظ

المسمّٰی بہ

الکمال فی الدین للنساء

(عورتوں کے لیے کمالِ دین حاصل کرنے کا طریقہ)

الکمال فی الدین للنساء

أین (کہاں ہوا): دہلی، بر مکان محمد رفیع صاحب
متی (کب ہوا): ۲۷ ذی الحجہ ۱۳۴۰ھ بعد ظہر، بروز سہ شنبہ
کم (کتنی دیر ہوا): ڈھائی گھنٹہ
کیف (کیوں کر ہوا): بیٹھ کر
لم (کیوں ہوا: مستورات کی درخواست تھی کہ ہم کو بھی اصلاح کا طریق بتایا جائے۔
ماذا (کیا مضمون تھا): عورتوں کے لیے کمالِ دین حاصل کرنے کا طریقہ اور کاملین کی صحبت کا فیض ان کو کیوں کر پہنچ سکتا ہے؟
من أي شأن (کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا): طبقۂ اِناث کو خصوصاً اور جو لوگ دنیوی مشاغل سے فراغت نہیں پاتے ان سب کو عموماً۔
من ضبط (کس نے ضبط کیا): احقر ظفر احمد تھانوی عفا اللہ عنہ
المستمعون (سامعین کی تخمینی تعداد): مرد تقریباً دو سو اور مستورات کی تعداد معلوم نہ ہو سکی۔
الأشتات (متفرقات): اس وعظ میں وہی آیت تلاوت کی گئی جو اس سے پہلے وعظ میں تلاوت کی تھی، لیکن مضامین اکثر غیر مکرر تھے اور بعض بالکل جدید۔

خطبۂ مسنونہ

الحمد لله نحمدهٗ ونستعينه ونستغفرهٗ ونؤمن به ونتوكّل عليه، ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا. من يهده الله فلامضل له، ومن يضلله فلا هادي له. ونشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له، ونشهد أن سيدنا ومولانا محمدًا عبدهٗ ورسوله صلى الله عليه وسلم. أما بعد، فأعوذ بالله من الشيطٰن الرجيم. بسم الله الرحمٰن الرحيم.

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ (التوبة: ۱۱۹)

اے ایمان والو! تقویٰ حاصل کرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔

تمہید:

بیان کرنے سے پہلے اتنا کہہ دینا مناسب ہے کہ اگر مردوں کو آواز کم پہنچے یا مضامین ان کے مناسب کم ہوں تو وہ مجھ کو معذور سمجھیں، کیوں کہ یہ بیان خاص عورتوں کے لیے ہے۔ اول تو اس بیان سے مقصود وہی ہیں، مردوں میں اس سے پہلے بیان ہو چکا ہے۔ دوسرے عورتوں کو مواعظ کے سننے کا بھی موقع کم ملتا ہے، اس لیے ضرورت اس کی ہے کہ گاہے گاہے خاص ان کے مناسب مضامین بیان کیے جائیں تاکہ ان کو بھی اپنی اصلاح کا طریقہ معلوم ہو۔ مردوں کو مواعظ کے سننے کا بہت موقع ملتا رہتا ہے۔ دوسرے ان کو وقتاً فوقتاً علما سے ملنے کا بھی موقع ملتا رہتا ہے۔ اگر مواعظ بھی نہ سنیں تو ضروری باتیں وہ زبانی دریافت کر سکتے ہیں۔ بے چاری مستورات کو اس کا بھی موقع نہیں ملتا، اس لیے ان کی اصلاح کے لیے خاص طور پر اہتمام کی ضرورت ہے کہ ایک بیان ایسا ہو کہ جس میں ان ہی کے مناسب مضامین ذکر کیے جائیں۔

مسلم معاشرہ میں عورتوں کا اہم کردار:

پھر عورتوں کے متعلق بچوں کی بھی تربیت ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ بچے ابتدائے عمر میں

اپنی ماؤں کے پاس زیادہ رہتے ہیں، باپ کے پاس کم رہتے ہیں، اس لیے بچوں کی تربیت اسی طرح عمدہ ہوسکتی ہے کہ مستورات کی اصلاح ہوجائے۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ابتدائے عمر میں بچوں کو سمجھ ہی کیا ہوتی ہے، جو وہ اچھی یا بری بات سے اثر لیں۔ بچپن میں ان کا تربیت کرنے والا خواہ کیسا ہو، سمجھ آنے کے بعد کسی نیک آدمی کے پاس ان کو رکھنے کی ضرورت ہونی چاہیے۔ سو خوب سمجھ لیجیے کہ یہ خیال غلط ہے۔ بچپن میں جب کہ بچہ دودھ پیتا ہے، اس وقت بھی اس کے دماغ میں اخذ کا مادہ ہوتا ہے، گو وہ زبان سے کچھ نہ کہہ سکے۔ اور اس کی مثال ایسی ہوتی ہے جیسے فوٹو گراف کہ تم جو کچھ کہتے ہو وہ سب اس میں جا کر محفوظ و منقش ہوجاتا ہے۔ گو اس وقت آواز نہ نکلے، لیکن جس وقت ان نقوش پر سوئی چلے گی وہ سب باتیں اس میں سے بعینہٖ نکلیں گی۔ یہ ہی حال بچوں کے دماغ کا ہے کہ ابتدائے عمر میں بھی وہ سب باتوں کو اخذ کر کے محفوظ کر لیتا ہے۔ گو اس وقت ان پر عمل نہ کر سکے یا زبان سے ظاہر نہ کر سکے۔ پھر جب اس میں قوتِ عمل و نطق کامل ہوجاتی ہیں، تو پہلی باتوں کے آثار اس سے ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ ایک تجربہ کار کا مقولہ ہے کہ بچوں کی اصلاح کا وقت پانچ سال تک ہے۔ اس عرصہ میں جتنے اخلاق اس میں پختہ ہونے ہوتے ہیں پختہ ہوجاتے ہیں۔ اس کے بعد اس میں پھر کوئی عادت پختہ نہیں ہوتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہم جس زمانہ کو ناسمجھی کا زمانہ خیال کرتے ہیں وہی وقت بچوں کی اصلاح کا ہے اور بچے اسی زمانے میں سب کچھ اخذ کر لیتے ہیں۔

بچوں کی اصلاح کا سہل طریقہ:

ایک مسماۃ نے بیان کیا کہ بچوں کی اصلاح کا سہل طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے بچہ کی کامل طور پر تربیت کر دی جائے۔ پھر سارے بچے اسی جیسے اٹھیں گے، جیسے کام کرتا ہوا اس کو دیکھیں گے، اگلے بچے بھی وہی کام کریں گے اور اسی کی عادتیں اور خصلتیں سیکھ لیں گے۔ غرض بچوں کی تربیت چونکہ زیادہ تر عورتوں کے ہاتھ میں ہے، اس لیے ان کی اصلاح سے مردوں کی بھی اصلاح متوقع ہے، کیوں کہ یہ بچے ایک وقت مرد بھی بنیں گے۔

ان وجوہ سے اس وقت کا بیان زیادہ تر مستورات کے لیے مخصوص ہوگا، لیکن اس کا یہ

مطلب نہیں کہ مردوں کے لیے یہ بیان کسی درجہ میں بھی مفید نہ ہوگا۔ کیوں کہ اس میں بھی آخر احکامِ شرعیہ ہی کا بیان ہوگا۔ اور احکام اکثر مردوں اور عورتوں میں مشترک ہی ہیں، البتہ طرزِ بیان میں مردوں کی دلچسپی کا لحاظ نہ کیا جائے گا، بلکہ زیادہ تر عورتوں کی دلچسپی کے مضامین ہوں گے۔ سو دلچسپی اگر نہ ہوئی بلا سے نہ ہو، یہ مقصود تھوڑا ہی ہے۔ اور جو مشترک نہ ہو تب بھی ایک نفع تو یقیناً سب کو ہے۔ وہ یہ کہ حدیث میں آتا ہے کہ جب کہیں اللہ کا ذکر ہوتا ہے تو فرشتوں کی ایک جماعت وہاں مجتمع ہو جاتی ہے۔ پھر وہ ذاکرین کے اوپر سکینہ نازل کرتے ہیں۔ پھر جب وہ حق تعالیٰ کے پاس جاتے ہیں تو وہاں سوال ہوتا ہے کہ تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا۔ وہ عرض کرتے ہیں کہ یا اللہ! ہم نے ان کو آپ کا ذکر کرتے ہوئے چھوڑا۔ حق تعالیٰ سوال فرماتے ہیں کہ کیا انہوں نے ہم کو دیکھا ہے؟ وہ عرض کرتے ہیں کہ نہیں، یا اللہ! انہوں نے آپ کو دیکھا نہیں۔ اگر دیکھ لیتے تو اس سے بھی زیادہ کوشش کرتے۔ پھر سوال ہوتا ہے کہ وہ ہم سے کیا چاہتے ہیں؟ فرشتے عرض کرتے ہیں کہ وہ آپ سے جنّت اور آپ کی رضا کو طلب کرتے ہیں اور آپ کی ناراضی اور جہنّم سے پناہ مانگتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے کہ گواہ رہو، ہم نے ان سب کو بخش دیا۔ اس پر بعض فرشتے کہتے ہیں کہ یا اللہ! فلاں شخص تو ذکر کے قصد سے نہیں آیا تھا، ویسے ہی آکر ان کے پاس بیٹھ گیا تھا۔ ارشاد ہوتا ہے کہ ہم نے اس کو بھی بخش دیا۔ یہ جماعت ایسی نہیں کہ ان کے پاس بیٹھنے والا محروم ہو۔

یہ تو حدیث کا مختصر مضمون ہے اور ظاہر ہے کہ وعظ کی مجلس بھی مجلسِ ذکر ہے، اس میں خدا تعالیٰ کے احکام کا ذکر ہوتا ہے اور یہ بھی ذکر اللہ ہی ہے۔ ذکر اللہ فقط تسبیح و تہلیل میں منحصر نہیں۔ صاحب حصنِ حصین نے اس مسئلہ پر متنبہ کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: بَلْ کُلُّ مُطِیْعٍ لِلّٰہِ فَھُوَ ذَاکِرٌ کہ ہر شخص جو خدا کی اطاعت میں مشغول ہو وہ ذاکر ہی ہے۔ تو اگر مردوں کو اس بیان سے دلچسپی بھی نہ ہوئی تو یہ نفع کیا تھوڑا ہے کہ وہ جتنی دیر مجلسِ وعظ میں بیٹھے رہیں گے اتنی دیر تک وہ ملائکہ کی صحبت سے مستفید ہوں گے اور ذاکر شمار ہوں گے اور رحمت و مغفرت کے مورد ہوں گے۔

(اس وقت کچھ مستورات کی باتوں کی آواز آئی، حضرت حکیم الامّت نے فرمایا کہ

بھائی! اس وقت باتیں نہ کرو بلکہ غور سے ہماری باتیں سنو۔ یہ کیا انصاف ہے کہ ہم تو تمہارے لیے اپنا وقت اور دماغ صرف کریں اور تم اس کی بے قدری کرو اور تھوڑی دیر کے لیے بھی تم اپنی باتیں قطع نہ کرو۔ اول تو یہ تہذیب کے خلاف ہے۔ دوسرے شریعت کے بھی خلاف ہے۔ عُلَما نے لکھا ہے کہ جس طرح خطبۂ جمعہ کا سننا فرض ہے اور اس وقت باتیں کرنا حرام ہے، اسی طرح جس مجلس میں بھی احکامِ شرعیہ بیان ہو رہے ہوں، وہاں خاموش رہنا اہلِ مجلس کے ذمہ لازم ہے۔ باتیں کرنے سے گناہ ہوتا ہے۔ پس جن مستورات کو باتیں کرنا ہوں یہاں سے اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی جائیں تاکہ گناہ سے بھی محفوظ رہیں اور دوسری سننے والیوں کے سننے میں خلل انداز بھی نہ ہوں۔

تیسرے باتیں کرنے سے بیان بھی خبط ہو جاتا ہے۔ بیان کرنے والے کے ذہن میں مضامین کی آمد بند ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ مضامین کی آمد نشاط و انشراحِ قلب پر موقوف ہے اور سامعین کی بے توجہی دیکھ کر بیان کرنے کی طبیعت مکدّر ہو جاتی ہے۔ بعض دفعہ جو رات کو مجھے بیان کرنے کا اتفاق ہوتا ہے تو بعض لوگ اس وقت اُونگھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اونگھنے والے کی صورت دیکھ کر مجھے مضمون کی آمد بند ہو جاتی ہے۔ پس یہ سخت ناانصافی ہے کہ میں تو اپنا دماغ صرف کروں، آپ کے لیے اپنا وقت خرچ کروں اور تم اس کی یہ قدر کرو کہ اپنی اپنی باتوں میں لگی رہو۔ باتوں کے لیے ساری عمر پڑی ہے۔ جب میں چلا جاؤں گا، پھر جتنی چاہے باتیں کر لینا۔)

اس وقت جو آیت میں نے تلاوت کی ہے، یہ وہی آیت ہے جو پرسوں ہی مردوں کے سامنے تلاوت کی گئی تھی۔ اس وقت اسی آیت کو اختیار کرنے کی چند وجوہ ہیں: ایک تو یہ کہ بعض مضامین اس آیت کے متعلق اس روز بیان سے رہ گئے تھے۔

دوسرے یہ بھی بتلانا مقصود ہے کہ حق تعالیٰ نے جس طرح مردوں کو کمالِ دین حاصل کرنے اور اپنی اصلاح کا حکم فرمایا ہے وہ حکم عورتوں میں بھی مشترک ہے، گو خطاب صیغہ کے اعتبار سے بظاہر مردوں کو ہے لیکن حکم مشترک ہے۔ پس کسی کو یہ خیال نہ ہو کہ حق تعالیٰ کو مردوں ہی کی طرف توجہ ہے اور عورتوں کا اعتنا نہیں ہے۔ یہ وہم پہلے بھی ہو چکا ہے اور منشا اس

وہم کا محبّت ہے۔

ازواجِ مطہّرات رضی اللہ عنہن کا دینی جذبہ:

حدیث میں آتا ہے کہ ازواجِ مطہّرات رضی اللہ عنہن میں سے کسی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں دیکھتی ہوں کہ حق تعالیٰ احکام میں مردوں ہی کا ذکر فرماتے ہیں، ہمارا (یعنی عورتوں کا) ذکر نہیں فرماتے۔ ازواجِ مطہّرات کو یہ خیال اس لیے بھی ہوا کہ وہ صاحبِ زبان تھیں۔ عربی زبان کو خوب سمجھتی تھیں۔ اور عربی میں مذکر ومؤنث کے لیے جدا جدا صیغے استعمال کیے جاتے ہیں، تو ان کو تمام احکام میں مذکر صیغے دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوا کہ حق تعالیٰ ہم کو خطاب نہیں فرماتے، نہ ہمارا ذکر فرماتے ہیں۔ اور ہماری مستورات تو عربی زبان حاصل ہی نہیں کرتیں۔ اور یہ بھی ایک بڑی کمی ہے جس کا افسوس ہوتا ہے، کیوں کہ پہلے زمانہ میں عورتیں بھی مثل مردوں کے عربی کی تحصیل کرتی تھیں، تو عربی زبان سے ناواقف ہونے کے سبب اب مذکر ومؤنث کے صیغوں کا فرق وہ نہیں سمجھ سکتیں۔

اور اگر ترجمہ پڑھیں گی تو اس میں ان صیغوں کا ترجمہ نظر سے گزرے گا۔ اور اردو میں خطاب کا صیغہ مردوں اور عورتوں میں مشترک ہے، دونوں کے لیے الگ الگ صیغہ موضوع نہیں ہے۔ مثلاً: ﴿وَاتَّقِيْنَ اللّٰهَ﴾، ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ کا ترجمہ یکساں ہوگا۔ دونوں جگہ اردو میں یہی بولتے ہیں کہ خدا سے ڈرو، خواہ اس کے مخاطب مرد ہوں یا عورتیں۔ اس لیے اوامر و نواہی کے صیغوں میں وہ ترجمہ دیکھ کر یہ نہیں سمجھ سکتیں کہ یہ خطاب خاص مردوں کو ہے۔ لیکن پھر بھی بعض جگہ اردو ترجمہ سے بھی مردوں کی تخصیص سمجھ میں آسکتی ہے۔ مثلاً: ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ﴾ کا ترجمہ ہے: اے لوگو! اور ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ کا ترجمہ ہے: اے ایمان والو! یہ لفظ اردو میں بھی مردوں کے لیے مخصوص ہے۔ عورتوں کو "اے لوگو" یا "اے ایمان والو" کہہ کر ندا نہیں کر سکتے، بلکہ ان کو خطاب خاص ہوگا تو "اے عورتوں" یا "اے ایمان والیو" کہا جائے گا۔ پس ہر چند کہ اوامر ونواہی کے صیغوں میں ترجمہ دیکھ کر ان کو تخصیصِ رجال کا وہم نہیں ہوسکتا، مگر ندا کے صیغوں میں ان کو بھی وہم ہوسکتا ہے۔ اور ازواجِ مطہّرات تو اس فرق کو خطاب کے موقع میں بھی سمجھتی تھیں، اس لیے ان کو غایتِ محبّت کی وجہ سے یہ خیال پیدا ہوا کہ

ہائے! اللہ تعالیٰ ہم کو خاص طور پر خطاب نہیں فرماتے جیسا مردوں کو خطاب فرماتے ہیں۔

دیکھیے! وہ عورتیں کیسی تھیں۔ اَللّٰہُ أَکْبَرُ! ان کا کیسا مذاق تھا۔ اگر آج کل کی عورتوں جیسی وہ سست اور کم ہمت اور کام چور ہوتیں تو یوں سمجھتیں کہ اچھا ہوا، ہم ان احکام سے بچ گئے کیوں کہ ان میں تو خاص مردوں کو مخاطب بنایا گیا ہے۔ مگر اس زمانہ میں مستورات کو اس کا وہم بھی نہیں ہوا کہ یہ احکام ہمارے لیے نہیں ہیں، بلکہ وہ خوب سمجھتی تھیں کہ احکام سب کو عام ہیں (بجز چند مخصوص باتوں کے جن کا مردوں کے ساتھ خاص ہونا دوسرے دلائل سے ان کو معلوم ہوگیا تھا، اور ایسی خصوصیّت عورتوں کے لیے بھی ہے کیوں کہ بعض احکام صرف عورتوں ہی کے لیے مخصوص ہیں مردوں کے لیے نہیں ہیں۔ ان کے علاوہ بقیہ احکام میں جن کا کسی کے لیے خاص ہونا دلائل سے معلوم نہ ہوا تھا، انہوں نے یہی سمجھا کہ مردوں اور عورتوں سب کے لیے مشترک ہیں گو لفظاً خطاب خاص مردوں کو کیا گیا ہے) اور عمومِ احکام پر نظر کر کے پھر ان کو یہ تمنّا ہوئی کہ جب یہ احکام سب کو عام ہیں تو ان میں ہمارا بھی تذکرہ ہوتا تو اچھا تھا۔ ان کے دل نے گوارا نہ کیا کہ تمام احکام میں مردوں کے واسطہ سے ہی ان کو خطاب فرماویں۔ ان کا جی چاہتا تھا کہ کبھی کبھی ہم کو مردوں سے جدا کر کے بھی خطاب فرمادیا کریں۔ اور وجہ اس تمنّا کی یہ تھی کہ ان کو خدا تعالیٰ سے محبّت تھی (اور عاشق کا دل چاہا کرتا ہے کہ اس کا تذکرہ کبھی تو محبوب کی زبان پر آجایا کرے:

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

خدا تعالیٰ کا کسی کو اپنے احکام کا مخاطب بنانا ایک بڑا شرف ہے جو مردوں کو حاصل تھا، تو ازواج مطہرات کو اس کی تمنّا ہوئی کہ اس شرف سے ہم بھی محروم نہ رہیں۔

(اس وقت پردہ کے پیچھے سے پھر عورتوں کی کچھ آواز آئی۔ حضرت حکیم الامت نے پھر فرمایا کہ بھائی! باتیں کرنے سے طبیعت اچاٹ ہوئی جاتی ہے، مضمون گڑبڑ ہوجاتا ہے۔ اگر تم اپنی باتیں بند نہیں کرتیں تو پھر ہم سے کہہ دو، ہم اپنی باتوں کو بند کردیں، ورنہ اس کی احتیاط رکھو۔ اول تو اس وقت باتیں کرنا جائز نہیں جیسا کہ ابھی میں نے حکم بتلایا تھا، اور اگر کسی کی طبیعت باتوں سے نہیں رکتی تو بلند آواز سے تو نہ کرو، آہستہ ہی کرلو۔)

خواتین سے اللہ تعالیٰ کا خطاب:

غرض وہ عورتیں دین کی عاشق تھیں۔ وہ اپنے اوپر بوجھ لادنا چاہتی تھیں، وہ یہ نہ چاہتی تھیں کہ ہم احکام کی مخاطب نہ بنیں تو اچھا ہے۔ کیوں کہ ان کو دین کے ثمرات پر اطلاع تھی اور وہ جانتی تھیں کہ دین کے ثمرات ایسے ہیں کہ ان کے لیے محنت کرنا کوئی چیز نہیں۔ اسی پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّی لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ﴾(النساء: ۱۹۵)

یعنی احکام میں کسی کی کچھ تخصیص نہیں، جو کوئی بھی عمل کرے مرد ہو یا عورت سب کو اجر ملے گا اور کسی کا عمل ضائع نہ ہوگا۔ باقی رہی خصوصیّت خطاب کی وجہ، سو وہ یہ ہے: بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ کہ تم دونوں آپس میں ایک دوسرے کے جزو ہو، پس حکم بھی دونوں کا یکساں ہے، اس لیے ضرورت جدا خطاب کرنے کی نہیں۔ اس کے بعد بعض جگہ خاص عورتوں کو بھی خطاب کیا گیا ہے، جیسے:

﴿یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَیْتُنَّ﴾(الأحزاب: ۳۲)

اے نبی کے بیبیو! تم معمولی عورتوں کی طرح نہیں ہو اگر تم تقویٰ اختیار کرو۔

میں دور تک ازواجِ مطہرات کو خطاب ہے۔ اور

﴿وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَیَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ﴾

(النور: ۳۱)

اور مسلمان عورتوں سے کہہ دیجیے کہ اپنی نگاہیں نیچے رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔

میں سب مسلمان عورتوں کو ایک خاص حکم کا مخاطب بنایا گیا ہے۔ اس سے اس وہم کا ازالہ من کل الوجوہ ہوگیا اور معلوم ہوگیا کہ مردوں کی طرح حق تعالیٰ کو عورتوں پر بھی عنایت ہے۔ اور بعض جگہ مذکر و مؤنث کے دونوں صیغے مخلوط لائے گئے ہیں۔ چناں چہ اس آیت:

﴿اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْقٰنِتٰتِ

وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصَّائِمَاتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا﴾ (الأحزاب: ۳۵)

بے شک اسلام کے کام کرنے والے مرد اور اسلام کے کام کرنے والی عورتیں اور ایمان لانے والے مرد اور ایمان لانے والی عورتیں اور فرماں برداری کرنے والے مرد اور فرماں برداری کرنے والی عورتیں اور راست باز مرد اور راست باز عورتیں اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں اور خشوع کرنے والے مرد اور خشوع کرنے والے عورتیں اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں اور روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں اور اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں، ان سب کے لیے اللہ تعالیٰ نے مغفرت اور اجرِ عظیم تیار کر رکھا ہے۔

میں مردوں اور عورتوں دونوں کا ذکر دوش بدوش کیا گیا ہے (اور گو عورتوں کی تمنّا کا مقتضیٰ یہ تھا کہ اس جگہ صرف عورتوں کا ہی ذکر ہوتا، مردوں کا ذکر ان کے ساتھ مخلوط نہ کیا جاتا، مگر اس خلط میں اشارہ ہو گیا جواب کی طرف کہ چونکہ اکثر احکام مردوں اور عورتوں میں مشترک ہیں، چناں چہ یہی احکام دیکھ لو کہ ان میں کسی کی کچھ تخصیص نہیں اس لیے عورتوں کا ذکر جدا کرنے کی ضرورت نہیں، جو احکام مردوں کے لیے ہیں وہی عورتوں کے لیے ہیں۔

قرآن مجید میں مردوں کو خطاب کرنے کی مختلف وجوہات:

رہی یہ بات کہ ہر جگہ ایسا ہی کیوں نہ کیا گیا جیسا اس آیت میں دونوں کا ذکر ساتھ ساتھ کیا گیا ہے، اس کی دو وجوہات ہیں: ایک وجہ تصحیح کی، اور ایک وجہ ترجیح کی۔ تو تصحیح کی وجہ تغلیب ہے۔ (تغلیب کے معنیٰ یہ ہیں کہ ایک نوع کو دوسری نوع پر غلبہ دے کر ایک کو ذکر کرکے دونوں کا ارادہ کرلیا جائے۔ مثلاً ماں باپ کو والدین یا ابوین کہا کرتے ہیں۔ اسی طرح اہلِ عرب چاند اور سورج کو قمرین کہہ دیتے ہیں، حالانکہ ابوین کا لفظی ترجمہ ہے:

دو باپ، اور قَــمَـــرَیــن کا ترجمہ ہے: دو چاند۔ ظاہر میں ماں باپ کو اَبَوَین کہنا غلط معلوم ہوتا ہے، ان کو اَب واُم کہنا چاہیے۔ اسی طرح چاند اور سورج کو قــمَـرَیـن کہنا بھی بظاہر غلط ہے، اس کو شــمــسٌ و قمرٌ کہنا چاہیے۔ لیکن چونکہ اس طرح عبارت طویل ہو جاتی ہے اس لیے اہلِ زبان اَب واُم کی جگہ تغلیباً بغرض اختصار اَبوین اور شمسٌ و قَمرٌ کی جگہ قمرَین کہہ دیتے ہیں۔

اسی طرح اگر قرآن میں مردوں اور عورتوں کے لیے جدا جدا صیغہ استعمال کیا جاتا تو کلام میں طول ہو جاتا، اس لیے تغلیباً صیغۂ مذکر ہی میں مؤنث کو بھی داخل کر لیا گیا، جس سے کلام میں اختصار پیدا ہو گیا۔ البتہ ایک دو جگہ عورتوں کے وہم مذکور کو دفع کرنے کے لیے ان کے واسطے جدا صیغے بھی استعمال کیے گئے، تاکہ ان کی تسلّی ہو جائے اور اتنی مقدار سے ایجاز کلام بھی فوت نہیں ہوتا۔

اور ترجیح کی وجہ یہ ہے کہ عورتیں تابع ہیں مردوں کی ہر طرح سے، خلقت کے اعتبار سے بھی۔ چناں چہ آدم علیہ السلام کے ایک جزو سے حوا علیہا السلام کی پیدائش ہوئی ہے یعنی حق تعالیٰ نے ان کی بائیں پسلی میں سے کوئی مادہ نکالا۔ پھر اس مادہ سے حوا علیہا السلام کو پیدا کیا، جس کا اثر یہ ہے کہ عورتیں عموماً مردوں سے خلقۃً کمزور ہوتی ہیں۔ ان کے تمام قویٰ جسمانی اور دماغی مردوں کے برابر نہیں ہوتے۔ نیز ترتیب کے اعتبار سے بھی وہ مردوں کے تابع ہیں۔ چناں چہ کمانا اور کھیتی کرنا، تجارت کرنا، محنت ومشقت کے کام کرنا مردوں کے متعلق ہے اور پکانا کھانا عورتوں کے متعلق ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ عورتوں کی اصل یہ ہے کہ وہ پردہ دار ہوں، اور تعلقاتِ انتظامیہ کے لیے پردہ مانع ہے اس لیے امورِ انتظامیہ ان کے متعلق نہیں ہو سکتے۔ انتظام کا تعلّق مردوں ہی سے ہو سکتا ہے۔ اس وجہ سے تمام تر تعلّق انتظام کا مردوں کے سپرد کر دیا گیا۔ پس جہاں دیگر انتظامات ان کے متعلق ہیں وہاں عورتوں کی اصلاح کا بھی انتظام مردوں کے سپرد کر دیا گیا۔ اور جب مردوں کے متعلق عورتوں کی اصلاح کا انتظام ہے تو وہ اس کے سردار ہوئے۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ سلطنت کی طرف سے جو احکام صادر ہوا کرتے ہیں، ان کے مخاطب سردار ہوتے

ہیں رعایا کو مخاطب نہیں کیا جاتا، نہ اُس کی کچھ ضرورت سمجھی جاتی ہے۔ کیوں کہ لوگ خود سمجھ لیں گے کہ جب سردار ان احکام کے مخاطب ہیں تو چھوٹے بھی ان کے ساتھ ضرور شریک ہیں۔ پھر سردار اپنے ماتحت لوگوں کو ان احکام کی اطلاع بھی کردیتے ہیں اور ان سے کام بھی لیتے ہیں۔

اسی طرح قرآن میں اکثر مردوں کو احکام کا مخاطب بنایا گیا ہے۔ چونکہ وہ عورتوں پر سردار ہیں تو ان کے مخاطب ہونے سے عورتوں کا ان احکام میں شریک ہونا خود سمجھ میں آجاتا ہے۔ پھر مردوں کے ذمہ ہے کہ وہ عورتوں کو احکام سے بھی اطلاع کریں اور ان سے کام بھی لیں، کیوں کہ سرداروں کے ذمہ یہ کام ہمیشہ ہوتا ہے کہ اپنے ماتحت لوگوں کو احکامِ سلطنت سے مطلع کرتے رہیں اور ان سے کام لیں۔ اگر وہ اس میں کوتاہی کریں گے تو ان سے بھی باز پُرس ہوگی۔

مردوں کی غفلت:

افسوس ہے کہ آج کل مردوں نے یہ بات تو یاد کرلی ہے کہ ہم عورتوں کے سردار ہیں، مگر ان کو یہ خبر نہیں کہ سردار کے فرائض کیا ہوتے ہیں۔ وہ نہ تو عورتوں کو احکام سے مطلع کریں اور مطلع کریں تو کس طرح؟ سردار صاحب کو خود ہی خبر نہیں۔ اور نہ ان سے کام لیں، یعنی جن کو احکام معلوم بھی ہیں اور وہ عورتوں کو احکام سے مطلع بھی کرتے ہیں، وہ اس کی نگہداشت نہیں کرتے کہ ہمارے گھروں میں ان احکام پر عمل بھی ہورہا ہے یا نہیں؟ غرض جو احکام ایسے ہیں جن میں اشتراک کی خاصیّت ہے، جیسے نماز روزہ وغیرہ، ان میں مردوں کو خطاب کافی ہے۔

کمالِ دین حاصل کرنے کا طریقہ:

اس تمہید کے بعد یہ بات سمجھ میں آگئی ہوگی کہ اس آیت میں جو کہ میں نے اس وقت تلاوت کی تھی، جس طرح حق تعالیٰ نے مردوں کو تکمیلِ دین کا حکم فرمایا ہے اسی طرح وہ حکم عورتوں کے لیے بھی ہے۔ اور جو طریق کمالِ دین کے حاصل کرنے کا مردوں کے لیے اس میں مذکور ہے وہ طریق عورتوں کے لیے بھی ہے۔ پس حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ﴾ (التوبة:۱۱۹)

اے ایمان والو! تقویٰ اختیار کرو (خدا سے ڈرو) اور سچّے لوگوں کے ساتھ ہو جاؤ۔

یہ تو اس آیت کا ترجمہ ہے اور پہلے بیان میں اس بات کو اچھی طرح ثابت کر دیا گیا ہے کہ تقویٰ اور صدق سے کمالِ دین مراد ہے۔ پس حاصل یہ ہوا کہ اے مسلمانو! دین میں کمال حاصل کرو اور کاملین کے ساتھ رہو۔ پس اس میں اوّلاً حق تعالیٰ نے تکمیلِ دین کا حکم فرمایا ہے، پھر اس کا طریق بتلایا ہے کہ دین میں کامل ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ جو لوگ راسخ فی الدین[۱] (دین میں پختہ) ہیں ان کی صحبت حاصل کرو، کیوں کہ کاملین کی صحبت سے اعمال میں سہولت بھی ہوتی ہے، اس طرح سے کہ ان کی برکت سے تقاضائے نفس مضمحل ہو جاتا ہے، جو کہ اکثر اعمال میں مزاحم ہوتا ہے۔ نیز ان کی صحبت سے طریقِ عمل بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ کس عمل کو کس طرح ادا کرنا چاہیے۔ یہ بات محض مسائل جاننے سے حاصل نہیں ہوتی جب تک کسی کو عمل کرتے ہوئے نہ دیکھا جاوے، اور یہ بات کچھ دین ہی کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ دنیوی کاموں میں بھی طریقِ عمل معلوم کرنے کے لیے اہلِ کمال کی صحبت ضروری ہے۔

اگر کوئی شخص یوں چاہے کہ محض کتاب دیکھ کر قسم قسم کے کھانے پکانے سیکھ لے تو ایسا نہیں ہو سکتا، جب تک وہ کسی ماہرِ فن سے ہر کھانے کی ترکیبِ عمل نہ سیکھے گا اس وقت تک کبھی اس کو کھانا پکانے کا طریقہ معلوم نہ ہوگا۔ اور اگر کسی نے کتاب دیکھ کر عمل شروع بھی کر دیا تو اس کو قدم قدم پر دشواریاں پیش آئیں گی۔ چناں چہ جب چاہے اس کا تجربہ کر لیا جائے۔ اور

---

[۱] احقر جامع عرض کرتا ہے کہ اس آیت سے اشارۃً یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ جب تک دنیا میں قرآن اور اسلام کا وجود ہے اس وقت تک ہر زمانہ میں کاملین کا بھی وجود ضرور رہے گا۔ کیونکہ جب تک دنیا میں قرآن ہے اس وقت تک ہر شخص اس آیت کا مخاطب ہے اور اس آیت میں کمالِ دین کا طریقہ صحبتِ کاملین بتلایا گیا ہے بصورت امر جس کا امتثال بدون تحقق کاملین کے نہیں ہو سکتا۔ اور اوامرِ شرعیہ کے لیے متعذر الامتثال (فرماں برداری کا دشوار) ہونا خلاف اصل ہے، اس لیے یہ مدعا ثابت ہو گیا کہ ہر زمانہ میں کاملین کا وجود ضرور رہے گا، گو وہ قلیل ہی ہوں۔ پس جو لوگ یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ صاحب آج کل اہل کمال کہاں؟ اب تو کمال کا حاصل ہونا دشوار ہے، یہ آیت اشارۃ ان پر رد کر رہی ہے۔ فافہم

یہی حال ہر عمل کا ہے کہ محض ترکیب جان لینے سے کسی عمل میں کمال حاصل نہیں ہوسکتا، بلکہ استاد سے سیکھنے کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ پس دین میں بھی کمال حاصل کرنا صحبتِ کاملین پر موقوف ہے۔ عادۃُ اللہ اسی طرح جاری ہے۔ پس میں نے اسی آیت کو عورتوں میں اس لیے پڑھا ہے تاکہ دو شبہے مرتفع ہوجائیں۔

عورتوں کے دو شبہے:

ایک آرام طلب عورتوں کا شبہ کہ وہ یوں نہ سمجھیں کہ یہ حکم مردوں ہی کے لیے مخصوص ہے، کیوں کہ وہی اس کے مخاطب ہیں اور ہم اس سے بچے ہوئے ہیں۔ چناں چہ اکثر عورتوں کا یہ خیال ہے کہ بس خدا نے ہم کو تو کھانا پکانے اور سینے پرونے ہی کے لیے پیدا کیا ہے۔

دوسرے خدا طلب عورتوں کا شبہ کہ وہ اپنے دل میں یوں نہ کہیں کہ بس خدا تعالیٰ کو مردوں ہی پر عنایت ہے ہم کو منہ بھی نہ لگایا۔ ان دونوں شبہوں کا جواب میں نے دے دیا ہے کہ مردوں کو خطاب کرنا اس وجہ سے نہیں کہ عورتیں ان احکام سے مستثنٰی ہیں اور نہ اس واسطے ہے کہ حق تعالیٰ کو عورتوں پر عنایت نہیں بلکہ خصوصیتِ خطاب کا منشا کچھ اور ہے جس کو میں مفصلاً بیان کر چکا ہوں۔

پس عورتوں کو جان لینا چاہیے کہ ان کو بھی حق تعالیٰ کا حکم یہ ہے کہ اپنا دین کامل کرو، ہر چند کہ مقصود اتنے ہی بیان سے پورا ہوگیا، کیوں کہ آیت کا مطلب ظاہر ہے کہ اس میں دین کے کامل کرنے کا حکم ہے۔ اب ہر شخص دیکھ لے کہ دین کیا ہے اور اس کے کیا کیا اجزا ہیں، اس کے بعد سب کاموں کو طریقۂ شرعیہ کے موافق بجالانا شروع کردے۔ پس دین کامل ہوجائے گا۔ مثلاً: نماز دین کا کام ہے، اس کا کمال یہ ہے کہ اچھی طرح پڑھو، وقت پر پڑھو، جلدی جلدی ادا نہ کرو، اطمینان اور سکون کے ساتھ پڑھو۔ ایسے ہی زکوٰۃ دین کا کام ہے اور اس کے کمال کا طریقہ یہ ہے کہ سال پورا ہونے کے بعد فوراً ادا کرو، اور خوشی سے ادا کرو، بیگار مت سمجھو۔ نیز ریا و نمود سے بچو، محض رضائے حق کو مقصود سمجھو۔

پس دین کے کام اکثر لوگوں کو معلوم ہیں اور ان کے کمال کا طریقہ مسائل پڑھنے سے

معلوم ہوسکتا ہے۔ اگر اس وقت میں اجزائے دین کی تفصیل بیان کروں اور ہر اِک کے کمال کا طریقہ جدا جدا بتلاؤں تو اس کے لیے عمرِ طویل بھی کافی نہیں، لیکن مقصود کی تعیین تفصیل پر موقوف نہیں، اجمالاً سب کو دین کے کاموں کا علم ہے اور ان کے کمال کا طریقہ دریافت کرنے سے معلوم ہوسکتا ہے۔

خواتینِ اسلام کی غفلت:

لیکن اب مجھ کو عورتوں کی غفلت کی شکایت کرنا باقی ہے کہ افسوس! ان کو دنیا کی تکمیل کا تو خیال ہے، دین کی تکمیل کا مطلق خیال نہیں۔ میرا مقصود یہ ہے کہ عورتوں کو دین کی تکمیل سے بھی غافل نہ ہونا چاہیے جیسا کہ ان کو اپنے زیور، کپڑے اور مکان کی ضرورت کی تکمیل سے کسی وقت بھی غفلت نہیں ہوتی اور وقتاً فوقتاً مردوں سے اس کے متعلق فرمائشیں کرتی رہتی ہیں۔ اور اگر مرد کسی وقت کسی فرمائش کو غیر ضروری بتلاتے ہیں، برتنوں اور مکان کی ضرورتوں کے متعلق اختلاف ہونے لگتا ہے کہ مرد یوں کہتے ہیں کہ ان چیزوں کی ضرورت نہیں اور مستورات کے نزدیک ان کی ضرورت ہو، تو ایسے موقع پر عورتیں کہہ دیا کرتی ہیں کہ تم کو ان چیزوں کی کیا خبر؟ تم کو گھر میں رہنا تھوڑا ہی ہے، اس کو تو ہم تم سے زیادہ جانتے ہیں۔ اور بعض دفعہ تو عورتوں کا یہ کہنا صحیح ہوتا ہے، کیوں کہ واقعی مردوں کو ان ضرورتوں کا علم پوری طرح نہیں ہوتا۔

اور بعض دفعہ اس اختلاف کا سبب یہ ہوتا ہے کہ مردوں میں قناعت کا مادہ عورتوں سے زیادہ ہے۔ مرد تھوڑے سے سامان میں بھی گزر کرلیتا ہے اور عورتوں میں قناعت کا مادہ ہے ہی نہیں، ان کی طبعیت میں بکھیڑا بہت ہے۔ ان سے تھوڑے سامان میں گزر ہوتا ہی نہیں، جب تک سارا گھر سامان سے بھرا بھرا نظر نہ آوے۔ مردوں کے نزدیک تو ضرورت کا درجہ یہ ہے کہ جس کے بغیر تکلیف ہو۔ سو اتنا سامان تو اکثر متوسط الحال لوگوں کے گھروں میں بحمد اللہ موجود ہوتا ہی ہے، اس لیے مردوں کو اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ ہاں! اگر خدا وسعت دے تو اس کا بھی مضایقہ نہیں کہ اتنا سامان جمع کرلیا جاوے جس سے زیادہ راحت نصیب ہو۔ یہ درجہ مردوں کے نزدیک کمال کا مرتبہ ہے۔ مگر عورتوں کے نزدیک ضرورت کا

درجہ تو کوئی چیز ہی نہیں۔ مرد جس کو ضرورت کا درجہ سمجھتے ہیں وہ عورتوں کے نزدیک قلّت اور تنگی کا درجہ ہے۔ ان کے نزدیک ضرورت کا درجہ وہ ہے جس کو مرد کمال کا درجہ سمجھتے ہیں جو حقیقت میں ہوس کا درجہ ہے۔

ناشکری کا مادہ:

اور اس کا منشا یہ ہے کہ عورتوں میں ناشکری کا مادہ زیادہ ہے۔ اگر خدا تعالیٰ ان کو ضرورت کے موافق سامان عطا فرماویں تو یہ اس کو غنیمت نہیں سمجھتیں، نہ اس پر خدا کا شکر کرتی ہیں، بلکہ ناشکری کرتی رہتی ہیں کہ ہائے! ہمارے پاس کیا ہے، کچھ بھی نہیں۔ حدیث میں بھی ان کی اس صفت کا تذکرہ آیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ناشکری کا مادہ عورتوں میں ہمیشہ سے ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

لَوْ أَحْسَنْتَ إِلٰى إِحْدَاهُنَّ الدَّهْرَ ثُمَّ رَأَتْ مِنْكَ شَيْئًا،
قَالَتْ: مَا رَأَيْتُ مِنْكَ خَيْرًا قَطُّ.

اگر تم کسی عورت کے ساتھ عمر بھر بھی اچھا برتاؤ کرو، پھر کبھی ایک دفعہ کوئی خلاف مزاج بات دیکھ لے تو وہ یوں کہے گی کہ میں نے تجھ سے کبھی بھلائی نہیں دیکھی۔

بس ذرا سی بات میں ساری عمر کے احسانات فراموش کر جاتی ہیں۔ جہاں کسی دن ان کو شوہر کے گھر میں کھانے، پہننے کی تنگی ہوئی اور انہوں نے اس کو منہ پر لانا شروع کیا کہ اس نگوڑے گھر میں آ کر تو میں نے سدا تنگی ہی دیکھی۔ باپ ماں نے مجھے جان بوجھ کر کنوئیں میں دھکا دے دیا۔ میں نے اس منحوس گھر میں کیا آرام کیا۔ غرض جو منہ میں آتا ہے کہہ ڈالتی ہیں اور اس کا ذرا خیال نہیں کرتیں کہ آخر اسی گھر میں ساری عمر میں نے عیش برتا ہے، مجھے اس کو نہ بھولنا چاہیے۔ اور خدا کا شکر کرنا چاہیے کہ اس نے کلفت آج ہی دکھلائی اور زیادہ زمانہ عیش میں گذارا۔ سو عورتوں میں چونکہ ناشکری کا مادہ زیادہ ہے، اس لیے ان کو تھوڑے سامان پر قناعت نہیں ہوتی۔ چناں چہ دیکھا جاتا ہے کہ بعض عورتوں کے پاس سال بھر کے کپڑے موجود ہوتے ہیں جو صندوق میں بھرے رکھے ہیں، لیکن پھر بھی کیا مجال ہے کہ پھیری والا بزّاز[1] ان

[1] بزّاز یعنی کپڑا فروش۔

کے گھر کے سامنے سے خالی گذر جائے۔ جہاں بزّاز کی آواز سنیں گی فوراً اس کو دروازہ پر بٹھلا کر اور کپڑا پھڑوالیں گی۔ برتن گھر میں ضرورت سے زیادہ موجود ہوں گے، مگر پھر بھی ان کی فرمایشوں کا سلسلہ ختم نہ ہوگا۔

چیتھڑے، لیتھڑے، ٹھیکرے:

واعظوں کا بیان بڑے لچھے دار ہوتا ہے۔ دہلی میں مولانا عبدالرب صاحب ایک واعظ تھے، وہ عورتوں کی اس صفت کو بڑے لچھے دار فقروں میں بیان کیا کرتے تھے کہ ان عورتوں کی یہ عادت ہے کہ ان کے پاس چاہے کتنے ہی کپڑے ہوں، مگر جب پوچھیے کہ تمہارے پاس کتنے کپڑے ہیں؟ تو یوں ہی کہیں گی کہ میرے پاس کیا ہیں؟ دو چیتھڑے۔ اور جوتوں کے چاہے کتنے ہی جوڑے ہوں، مگر جب پوچھو یوں ہی کہیں گی: کیا ہیں؟ دو لیتھڑے۔ اور برتن چاہے کتنے ہی ضرورت سے زیادہ ہوں، مگر جب پوچھو یوں ہی کہیں گی کہ کیا ہیں؟ دو ٹھیکرے۔

خیر یہ تو مولوی صاحب کا لطیفہ ہے، مگر حقیقت میں عورتوں کی عادت کا فوٹو انہوں نے خوب کھینچا۔ غرض ان کو دنیا کی تکمیل کی بہت زیادہ فکر ہے۔ ہر وقت اسی دُھن میں رہتی ہیں، ان کی ہوس کبھی پوری نہیں ہوتی۔ زیور کی ہوس کا یہ حال ہے کہ بعض عورتیں سر سے پیر تک لدی پھدی رہتی ہیں، مگر پھر بھی بس نہیں۔ اگر نیا زیور نہ بنوائیں گی تو پہلے ہی زیور کی توڑ پھوڑ میں روپیہ برباد کرتی رہیں گی۔ آج ایک زیور بڑے شوق سے بنوایا تھا، کل کو کسی عورت کے پاس وہی زیور دوسرے نمونہ کا دیکھ لیا تو اب ان کو توڑ پھوڑ کی بیکلی لگتی ہے کہ میں بھی اسی نمونہ کا بنواؤں گی۔ مگر آج کل کچھ دنوں سے نوعمر لڑکیوں میں زیور کا شوق کم ہوگیا ہے۔ یہ نیا فیشن چلا ہے کہ نوعمر لڑکیاں آج کل کان وغیرہ ننگے رکھتی ہیں۔ یہاں بھی یہ اثر ضرور ہوگا۔ یہاں کی مجھ کو زیادہ تحقیق نہیں، مگر جب قصبات میں یہ اثر پہنچ گیا ہے تو شہروں میں بھی ضرور ہوگا۔ چاندی کا زیور تو آج کل عیب شمار ہونے لگا۔ یہ تو نیَنوں جلاہیوں کا زیور رہ گیا۔ شُرَفا کی لڑکیاں صرف سونے کا زیور پہنتی ہیں، وہ بھی صرف کانوں میں دو ہلکے ہلکے بُندے ہیں اور سارا بدن زیور سے ننگا ہے۔ ہاں پیروں میں کچھ چاندی بھی ڈال لیتی ہیں، کیوں کہ وہ حقیر چیز

ہے پیروں ہی میں رہنی چاہیے۔ تو آج کل زیور میں لڑکیوں نے اختصار کرلیا ہے۔ اور اس مذاق کی ابتدا میموں کے اتباع سے ہوئی ہے۔ میمیں زیور نہیں پہنتیں، کیوں کہ ان کی قوم میں اس کا رواج نہیں۔ حکمران قوم ہے، ان کو دیکھ دیکھ کر ہندوستانی عورتوں میں بھی یہ مذاق پیدا ہوگیا۔ اور ان کو میموں کا طرز اس طرح معلوم ہوا کہ آج کل جا بجا شفا خانے کھلے ہوئے ہیں جن میں زنانے شفا خانے بھی ہیں۔ ہندوستانی عورتیں وہاں جا کر میموں سے علاج کراتی ہیں، اس ذریعے سے ان کے پاس آمدورفت ہوتی ہے اور جو زیادہ وسعت والے ہیں وہ میموں کو اپنے گھروں پر بلاتے ہیں۔

دوسرے آج کل ریلوں میں بھی عورتیں سفر کرتی ہیں، اسٹیشنوں پر میموں پر نظریں پڑ جاتی ہیں، علمِ اجمالی تو اس طرح حاصل ہوا۔ پھر تفصیلی علم شفاخانوں میں جا کر یا ان کو گھر پر بلانے سے ہوگیا۔ پھر بعض عورتوں پر تو میموں کا اثر بلا واسطہ ہوا اور بعض پر بواسطہ ہوا کہ ایک نے تو میموں کو دیکھ کر ان کا طرز اختیار کیا۔ پھر اس کو دیکھ دیکھ کر دوسریوں نے اپنا رنگ بدلا۔ لوگ اس میں احتیاط نہیں کرتے اور یوں سمجھتے ہیں کہ یہ تو عورتیں ہیں، ان سے کیا احتیاط؟ اس لیے بے تکلّف میموں سے علاج کراتے ہیں، حالانکہ میمیں مردوں سے زیادہ قابلِ احتیاط ہیں، کیوں کہ مردوں سے تو مردوں کو سابقہ پڑتا ہے اور مردوں میں تاثر کا مادہ کم ہے، وہ ان کی باتوں سے متاثر بہت کم ہوتے ہیں۔ اور میموں سے عورتوں کو سابقہ پڑتا ہے اور ان میں تاثر کا مادہ زیادہ ہے، یہ ہر نئی چیز سے بہت جلد متاثر ہوتی ہیں۔ پھر میموں کی طرز تقریر میں ایک خاص بات ہوتی ہے جو کہ ہندوستانی عورتوں میں نہیں ہوتی، اس لیے وہ میموں کی باتوں سے بہت جلد متاثر ہو جاتی ہیں۔

چناں چہ ایک دین دار عورت نے اس حقیقت کو خوب سمجھا۔ اس کی آنکھ میں کچھ نقصان تھا۔ ڈاکٹر کو آنکھ دکھانے سے وہ انکار کرتی تھی اور یہ کہتی تھی کہ آنکھ ہی کی تو شرم ہے، جب غیر مرد کے سامنے آنکھ ہوگئی پھر پردہ کا ہے کا رہا۔ پھر اس نے ایک میم کو اپنی آنکھ دکھائی۔ اس نے دیکھ کر کہا کہ میں اس علاج میں ماہر نہیں ہوں، تم کو ڈاکٹر صاحب کو آنکھ دکھانا چاہیے۔ اس نے ڈاکٹر کو دکھانے سے انکار کردیا، اس پر میم نے ایسی تقریر کی کہ ان کی رائے فوراً بدل گئی اور

ڈاکٹر کو دکھانے کے لیے تیار ہوگئیں۔ پھر ان کو تنبّہ ہوا اور عہد کیا کہ اب ساری عمر بھی ان میموں کا منہ نہیں دیکھوں گی کہ اس ساحرہ نے تو میری عمر بھر کی غیرت وحیا کو ایک منٹ میں اپنی تقریر سے مغلوب کردیا، کہ اس وقت مجھے ڈاکٹر کے سامنے آنے سے بھی غیرت مانع نہ ہوئی تھی۔ان کا کیا اعتبار؟ یہ ظالم تو اپنی تقریر سے کسی کا دین بھی بدل دیں تعجب نہیں۔

بددین عورتوں سے احتیاط:

صاحبو! اس بات کو معمولی نہ سمجھو، اس کی بہت احتیاط ضروری ہے۔ خصوصاً یہ جو مشن کی میمیں ہیں ان سے تو بہت ہی احتیاط لازم ہے۔ یہ اپنے مذہب کی تبلیغ بڑی باریکی سے کردیتی ہیں کہ سننے والے کو پتا بھی نہیں چلتا، مگر اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ مخاطب کے ذہن میں ان کے مذہب سے نفرت نہیں رہتی۔ اور بعض دفعہ تو علاج کے ساتھ ساتھ وہ مذہبی گفتگو بھی صاف صاف کرتی رہتی ہیں۔ میں نے بہت واقعات ایسے سنے ہیں کہ بعض عورتوں نے میموں کا علاج شروع کیا پھر ان پر ایسا اثر پڑا کہ کم بختوں نے دین بدل دیا۔ بعض نے دین نہیں بدلا تو پردہ کرنا چھوڑ دیا اور بعض نے لباس اور زیور وغیرہ میں ان کا طرز اختیار کرلیا ہے۔ یہ تو سب سے ادنیٰ اثر ہے اور اب روز بروز اس کی زیادتی ہے۔ علاج کرانے کا کافر عورت سے مضایقہ نہیں، مگر اس میں چند باتوں کا خیال رکھیں:

۱۔ ان سے بجز علاج معالجہ کے اور کوئی بات نہ کریں۔

۲۔ ضرورت کے سوا زیادہ میل جول نہ بڑھاویں، ان سے بہناپا نہ کریں۔ آج کل تو غضب یہ ہے کہ جس گھر میں ایک دفعہ میم صاحب کا قدم آجاتا ہے، پھر وہ روز کے روز اسی میں کھڑی نظر آتی ہیں۔ اگر وہ خود بھی نہ آئی تو گھر والیاں بلاتی ہیں، اس کی بہت سختی کے ساتھ بندش کرنی چاہیے۔

۳۔ اگر وہ مذہبی باتیں شروع کرے تو فوراً روک دینا چاہیے یا کم از کم سننا نہ چاہیے، اور اگر وہ کسی بات کا جواب مانگے تو صاف کہہ دو کہ شہر میں علما موجود ہیں تم اُن سے جا کر کہو، وہ تم کو ہر بات کا جواب دیں گے۔

۴۔ اور ایک بات خاص ایسی ہے جس کی طرف اکثر عورتیں تو کیا خاص خاص مرد بھی توجہ نہیں کرتے، وہ یہ کہ جن مواضعِ جسم کا چھپانا نامحرم مرد سے فرض ہے کافر عورتوں سے بھی ان کا چھپانا فرض ہے۔ مثلاً سر کا کھولنا یا گلا کھولنا نامحرموں کے سامنے جائز نہیں، ان مواضع کا کھولنا کافر عورت کے سامنے بھی بلاضرورت معالجہ کے حرام ہے۔ البتہ اگر ان مواضع کو علاج کی غرض سے کھولنا پڑے تو جائز ہے، لیکن بلاضرورت ہرگز نہ کھولنا چاہیے، جس کی دلیل حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ﴿أَوْ نِسَائِهِنَّ﴾، اس سے پہلے حق تعالیٰ نے ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جن کے سامنے عورتوں کو آنا جائز ہے۔ چناں چہ ارشاد ہے:

﴿لَا جُنَاحَ عَلَيْهِنَّ فِيْٓ اٰبَآئِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآئِهِنَّ وَلَآ اِخْوَانِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآءِ اِخْوَانِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآءِ اَخَوٰتِهِنَّ وَلَا نِسَآئِهِنَّ وَلَا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ ۚ وَاتَّقِيْنَ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ۝﴾ (الأحزاب: ۵۵).

پیغمبر کی بیبیوں پر اپنے باپوں کے بارے میں کوئی گناہ نہیں اور نہ اپنے بیٹوں کے اور نہ اپنے بھائیوں کے اور نہ اپنے بھتیجوں کے اور نہ اپنے بھانجوں کے اور نہ اپنی عورتوں کے اور نہ اپنی لونڈیوں کے بارے میں، اور خدا سے ڈرتی رہو، بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر حاضر ناظر ہے۔

اور سورۂ نور میں ارشاد ہے:

﴿وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ۠ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ﴾ (النور: ۳۱)

اور اپنی زینت (کے مواقع) کو (کسی پر) ظاہر نہ ہونے دیں، مگر اپنے شوہروں پر یا اپنے شوہر کے باپ پر، یا اپنے بیٹوں پر یا اپنے شوہر کے بیٹوں پر، یا اپنے بھائیوں پر (خواہ حقیقی ہوں یا علاتی یا اخیافی اور چچا زاد، ماموں زاد، بھائی وغیرہ مراد نہیں) یا اپنے بھائیوں کی اولاد پر، یا اپنی بہنوں کی اولاد پر (یہاں بھی حقیقی وعلاتی واخیافی بہنیں مراد ہیں۔ چچازاد ماموں زاد بہنیں مراد نہیں) یا اپنی عورتوں پر (مراد مسلمان عورتیں ہیں، کیوں کہ وہی اپنی کہلاتی ہیں)، یا اپنی باندیوں

پر مطلقاً خواہ کافر ہوں یا مسلمان)۔

تو ان آیتوں میں یہ نہیں فرمایا: أَوِ النِّسَاءِ اگر اس طرح فرماتے تو یہ مطلب ہوتا کہ مسلمان عورتوں کو سب عورتوں کے سامنے آنا اور اپنے مواقع زینت کا کھولنا جائز ہے۔ بلکہ حق تعالیٰ نے ﴿أَوْ نِسَاءِ هِنَّ﴾ فرمایا ہے جس کا ترجمہ ہے: اپنی عورتیں، اور باتفاقِ مفسّرین اپنی عورتیں وہی ہیں جو مسلمان ہیں۔

پس مطلب یہ ہوا کہ مسلمان عورتوں کو مسلمان کے سامنے اپنی زینت کے مواقع کا کھولنا جائز ہے۔ کافر عورتوں کے سامنے گلا اور سر اور کلائیاں اور پنڈلیاں کھولنا جائز نہیں، اس میں بکثرت مستورات مبتلا ہیں۔ وہ یہ سمجھتی ہیں کہ عورتوں سے کیا پردہ؟ حالانکہ شریعت میں کافر عورتوں کا حکم مثل اجنبی مرد کے ہے۔ میموں سے تو ان کو کبھی کبھار ہی واسطہ پڑتا ہے، مگر اکثر بھنگنوں، چماریوں یا کنجڑتوں یا پٹونوں سے بہت واسطہ پڑتا ہے۔ یہ عورتیں رات دن گھروں میں گھسی رہتی ہیں، ان سے بہت کم احتیاط کی جاتی ہے۔ سو خوب سمجھ لو کہ یہ عورتیں مثل اجنبی مرد کے ہیں، ان کے سامنے بدن کا کھولنا ایسا ہی ہے جیسا کہ غیر مردوں کے سامنے بدن کھولنا۔

پس ان سے تمام بدن کو احتیاط کے ساتھ چھپاؤ، صرف منہ اور قدم اور گِٹّے تک ہاتھ کھولنا ان کے سامنے جائز ہے، باقی تمام بدن کا چھپانا فرض ہے، خصوصاً سر کھول کر گھر میں پھرنے کا عورتوں کو زیادہ مرض ہے، تو ان عورتوں کو آنے کے وقت تمام سر کو چھپا لینا چاہیے کہ بال تک بھی ان کو نظر نہ آویں۔ اس کی طرف عورتوں کو بالکل التفات نہیں، جس کا سبب یہ ہے کہ ان کو احکام کی طرف توجہ کم ہے۔ دنیا ہی میں ہر وقت لگی رہتی ہیں، ان کو اپنے زیور کپڑے سے اتنی بھی فرصت نہیں ملتی کہ تھوڑی دیر کے لیے کوئی کتاب مسائل کی پڑھ لیا کریں۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ ان میموں وغیرہ سے عورتوں کو بچنا چاہیے، بلاضرورت ان سے ہرگز نہ ملیں، نہ اپنے گھروں پر بلاویں اور اس کا پورا انتظام مردوں کو کرنا چاہیے۔ ان عورتوں کے اختلاط کا بہت برا نتیجہ ہے، مستورات کو ان کی اوضاع واطوار سے بچنا چاہیے۔ چناں چہ ان ہی کے اوضاع میں سے ایک اثر یہ بھی ہے کہ نوعمر لڑکیوں کو زیور کا خیال کم ہوگیا ہے۔ اس کا

منشا کفایت شعاری ہرگز نہیں، کیوں کہ بھلی ساری کفایت شعاری زیور ہی میں رہ گئی، اچھا کپڑوں میں کفایت شعاری کیوں نہیں کی جاتی؟ جولڑکیاں زیور کم پہنتی ہیں وہ کپڑوں میں بڑی رقم صرف کرتی ہیں۔

اسی طرح گھر کی آرائش اور زینت میں بھی خرچ کی پرواہ نہیں کرتیں۔اس سے معلوم ہوا کہ ان کا مقصود محض میموں کا اتباع ہے، جس چیز میں وہ رقم صرف نہیں کرتیں اس میں یہ بھی صرف نہیں کرتیں، اور جس میں ان کو زیادہ غلو ہے اس میں یہ بھی خرچ کی پرواہ نہیں کرتیں۔ بلکہ یہ مذاق اس درجہ غالب ہوا ہے کہ جن عورتوں میں مالی وسعت زیادہ بھی نہیں ہے وہ معمولی کپڑوں اور معمولی زیوروں ہی میں ایسی تراش خراش کرتی ہیں اور ایسی وضع سے ان کو بناتی ہیں جس سے وہ میم کی طرح نظر آنے لگیں۔ بس ایسی حالت میں ان کو زیور کا خیال کم ہونا کچھ باعثِ مسرت نہیں، بلکہ یہ تو اس کا مصداق ہوگیا:

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

اگر یہ اپنی پرانی وضع پر قائم رہیں پھر زیور کا شوق کم کردیں، اس وقت البتہ خوشی کی بات ہے۔ اور جن لڑکیوں میں یہ مذاق نہیں آیا، ان کی حالت یہ ہے کہ زیور سے کسی وقت ان کا پیٹ ہی نہیں بھرتا، کانوں میں بالے بھی ہیں، بالیاں بھی ہیں، پتے بھی ہیں ان کو کچھ حس ہی نہیں کہ اس سے کان ٹوٹیں گے یا کیا ہوگا۔ چاہے کان چھد پڑیں، مگر ان کو سب زیور لادنا فرض ہے۔ ناک میں نتھ بھی ہے اور لونگ بھی ہے، پھر چاہے لونگ سے ناک میں آگ ہی لگ جائے، مگر کیا مجال جو کسی وقت اُتر لے۔ پھر اس زیور کے شوق میں اُن کو ساری مصیبتیں آسان ہوجاتی ہیں۔ یعنی کان چھدوانے میں کتنی تکلیف ہوتی ہے، مگر لڑکیاں ہنسی خوشی سب کام کرلیتی ہیں، بلکہ اگر کوئی ان سے یہ کہے کہ کان چھدوا کر کیا لوگی، خواہ مخواہ تکلیف اپنے سر مول لیتی ہو، کان مت چھدواؤ، تو اس سے لڑنے کو تیار ہوجاتی ہیں۔

میرے ایک دوست ہیں، ان کو اپنی لڑکی سے بہت محبّت تھی۔ ایک دن وہ مجھ سے کہنے لگے کہ اگر میں اس بچی کے کان نہ چھدواؤں تو کچھ حرج تو نہیں۔ مجھے اس کی تکلیف سے

بہت تکلیف ہوتی ہے۔ میں نے کہہ دیا کہ نہیں کیا حرج ہوتا۔ یہ خبر کہیں اس لڑکی کو پہنچ گئی، مجھ پر بڑی خفا ہوئی کہ اپنی بیوی اور ماں بہن کو نہیں دیکھتے۔ بھلا یہ مسئلہ میرے ہی واسطے نکالا۔ پہلے اپنے گھر والوں کو اس کی تعلیم دی ہوتی، میں تو ضرور کان چھدواؤں گی۔ وہ دوست میرے پاس آئے کہ صاحب! اس لڑکی نے وہ بات سن لی تو آپ پر بڑی خفا ہوئی۔ میں نے کہا: بھائی! تم اُس کے ایک ایک کی جگہ دو دو سوراخ کرادو۔

ایک بنیے کا قصّہ مشہور ہے کہ اُس نے اپنی بیوی سے کہا کہ ذرا سِل کا باٹ اُٹھالا۔ اس نے کہا: مجھ سے سِل کا باٹ کیونکر اٹھے گا، بھاری پتھر ہے، کہیں میری کمر میں لچک نہ آجاوے۔ اُس نے پترے تو خود اُٹھالیا، لیکن سِل کو کسی بہانے سے باہر لے گیا اور ایک سُنار کو بلا کر کہا کہ اس سل کے اوپر سونے کے پترے خوبصورتی کے ساتھ جڑ دے اور اس میں ایک مضبوط زنجیر ڈال دے۔ جب وہ تیار ہو کر آگئی تو اُسی بیوی کو لا کر دی کہ لو! ہم نے تمہارے واسطے ایک ہینکل بنوایا ہے، اسے پہن لو۔ تو اُس نے خوش ہو کر اسے گلے میں ڈال لیا اور گلے میں لٹکائے پھرنے لگی۔ گردن بوجھ سے جھکی جاتی تھی، مگر زیور کے شوق میں سب تکلیف گوارا تھی۔ اس کے بعد بنیے نے نکال جُوتا خوب خبر لی کہ کم بخت! اُس روز تو تجھ سے سِل کا باٹ بھی نہ اٹھتا تھا اور آج تو اُسی سِل کو گلے میں لٹکائے پھرتی ہے۔ آج تیری کمر میں کچھ نہیں ہوتا۔ خیر! یہ قصّہ تو گھڑا ہوا معلوم ہوتا ہے، مگر جس نے تصنیف کیا ہے اس نے عورتوں کے مذاق کو خوب سمجھا ہے۔

زیورات کی حرص:

حقیقت میں ان کو زیور کی حرص ایسی ہی ہے کہ اگر سونے کا زیور بہت بھاری بھی ہو تو یہ کبھی اس کے پہننے سے انکار نہ کریں، گو گردن اور گلا کیسا ہی دکھتا رہے۔ اور یوں تو عورتوں میں زیور کپڑے کی حرص طبعی طور پر ہوتی ہے، لیکن آپس میں ملنے ملانے سے یہ حرص اور بڑھ جاتی ہے۔ ان کا آپس میں ملنا جلنا بڑا غضب ہے۔ ایک دوسری کو دیکھ کر رنگ پلٹتی ہے۔ اگر کسی کو خدا تعالیٰ نے زیور اور کپڑا حیثیت کے مطابق دے رکھا ہے تو وہ اسی وقت تک خوش ہے جب تک برادری کی بہنوں میں نہ جائے، اور جہاں برادری میں نکلنا ہوا پھر اُن کی نظر میں اپنا زیور اور کپڑا حقیر معلوم ہونے لگتا ہے۔ دوسروں کا زیور دیکھ کر ان کا دل للچاتا ہے کہ ہمارے

پاس بھی ایسا ہی ہونا چاہیے۔ اوراس میں اپنی حیثیت پر بھی ان کو نظر نہیں ہوتی کہ جس کے پاس ہم سے زیادہ زیور ہے اس کی حیثیت کیا ہے؟ جس کے مرد کی آمدنی پچاس روپے ماہوار ہے وہ بھی برابری کرتی ہے اس کی جس کے مرد کی آمدنی ہزار روپیہ ماہوار ہے۔

امیر عورتوں سے ملاقاتوں کا نتیجہ:

عورتوں پر ملنے جلنے کا ایسا اثر ہوتا ہے کہ سہارن پور میں ایک کورٹ انسپکٹر تھے جن کی تنخواہ چارسو پانچ سو روپے ماہوار تھی، مگر ان کی عادت یہ تھی کہ ساری تنخواہ اپنے غریب رشتہ داروں میں خرچ کرتے تھے، گھر میں کم رکھتے تھے۔ ان کی بیوی کے پاس زیور کا ایک چھلاّ بھی نہ تھا، گھر میں نہ کوئی خادمہ تھی، بے چاری اپنے ہاتھ سے آٹا پیستی تھی اور خود ہی پکاتی تھی اور اسی حالت میں خوش تھی۔ میرے ایک عزیز بھی اس زمانہ میں سہارن پور میں ملازم تھے اوران کا مکان کورٹ انسپکٹر صاحب کے مکان سے متّصل ہی تھا۔ وہ اپنی بیوی کو کسی کے یہاں بھیجتے نہ تھے، مگر ایک دفعہ ان عزیز کے گھر والوں کے اصرار پر انہوں نے ملنے کی اجازت دی۔ وہ جو یہاں آئی تو اُس نے یہاں باندیوں کو بھی اپنے سے اچھا پایا۔ ان کے پاس بھی کچھ زیور تھوڑا بہت تھا اور کورٹ انسپکٹر کی بیوی کے پاس چھلا تک نہ تھا۔

بس یہاں سے جا کر اُس نے اپنے میاں کی خوب خبر لی کہ واہ! سرشتہ دار صاحب کی تنخواہ بھی تم سے کم ہے، پھر بھی ان کے گھر والے زیور میں لدے پھدے ہیں اور میں بالکل ننگی ہوں۔ اوران کی بیوی اپنے ہاتھ سے ایک کام بھی نہیں کرتی، ایک چھوڑ کئی کئی باندیاں ہیں، سارا کام وہی کرتی ہیں اور میں سارا کام اپنے ہاتھ سے کرتی ہوں۔ اب تو مجھ سے اس طرح نہیں رہا جاتا، تم مجھے بھی زیور بنا کر دو اور عمدہ لباس بنا کر دو اور گھر میں خادمہ نوکر رکھو۔ وہ کورٹ انسپکٹر پھر مجھ سے الہ آباد میں ملے تھے۔ پھر بے چارے کہتے تھے کہ شیخ کامل کی صحبت کا اثر ایک منٹ میں ایسا ہوا کہ میری ساری عمر کا اثر فوراً زائل ہو گیا۔ اب میرے گھر میں رات دن زیور کی فرمایش کرتی ہے اور کوئی کام خود نہیں کرتی۔ زیور بناتا بناتا تھک گیا، مگر یہ سلسلہ ختم ہی نہیں ہوتا اور اب میری ساری خیر خیرات بند ہو گئی ہے۔

اسی لیے میں کہتا ہوں کہ ان کا آپس میں ملنا جلنا بڑا غضب ہے۔ اور میں یہ نہیں کہتا کہ مستورات کا آپس میں ملنا جلنا بالکل بند کر دو۔ میرا مطلب یہ ہے کہ عورتوں کو اپنے اس مرض کی اصلاح کرنی چاہیے۔ اگر کسی کا دل دوسروں کے زیور، کپڑے دیکھ کر نہ للچائے اس کو ملنے جلنے کا مضایقہ نہیں، مگر جس پر دوسروں کو دیکھ کر یہ اثر ہو اُس کو ضرور نہ ملنا چاہیے۔

قرآن شریف میں عورتوں کو حکم ہے: ﴿وَقَرْنَ فِي بُيُوْتِكُنَّ﴾ کہ تم اپنے گھروں میں جم کر بیٹھی رہو اس میں تقسیم الاحاد علی الاحاد (اکائی کی تقسیم اکائی پر) ہے، جس سے یہ مطلب حاصل ہوا کہ ہر عورت اپنے گھر میں جم کر بیٹھی رہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کے لیے اصل حکم یہی ہے کہ وہ اپنے اپنے گھروں سے باہر نہ نکلیں، نہ عورتوں سے ملنے کے لیے نہ مردوں سے ملنے کے لیے۔ پھر آخر کچھ تو بات ہے جو حق تعالیٰ نے عورتوں کے لیے گھر میں رہنے کا حکم دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گھر سے باہر نکلنا ان کے لیے مضر ہے (لیکن مواقع ضرورت اس سے مستثنیٰ ہیں)۔ پس جس کو ملنے جلنے سے یہ ضرر ہوتا ہو اس کے لیے یہی حکم ہوگا کہ وہ کسی سے نہ ملے، اپنے گھر ہی میں بیٹھی رہے۔ ہاں! جس کو ضرر نہ ہوتا ہو وہ اپنے خاوند کی اجازت سے دوسروں کے گھر جا سکتی ہے۔

بیبیو! آخر تم کھجلی والوں سے تو بچتی ہو اور ان کے پاس بیٹھنا اور اُن سے ملنا جلنا تم کو گوارا نہیں ہوتا کہ کہیں ہم کو بھی کھجلی نہ ہو جاوے اور یہ حالت تو کھجلی سے بھی بدتر ہے۔ کھجلی کا ضرر تو محض جسمانی ہے اور اس کا ضرر جسمانی بھی ہے اور روحانی بھی۔ جسمانی ضرر تو یہ ہے کہ جب تم دوسری عورتوں کو اپنے سے اچھی حالت میں دیکھو گی اور ان جیسا بننا چاہو گی اور تمہاری حیثیت اُن کے برابر نہیں ہے، تو تم کو خواہ مخواہ اس سے الجھن اور پریشانی ہوگی۔ اور رات دن تم اسی فکر میں گھلو گی کہ ہائے! میرے پاس بھی یہ چیز ہوتی، وہ ہوتی۔ پھر بعض دفعہ تم مردوں سے بھی اس قسم کی فرمایش کرو گی جو اُن کی حیثیت سے زیادہ ہے۔ اُن کو یہ فرمایش ناگوار ہوگی جس سے خواہ مخواہ دلوں میں کدورت پیدا ہوگی، جس سے بہت اوقات بہت دور تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ اور روحانی ضرر یہ ہے کہ اس سے ناشکری کا مرض بڑھتا ہے۔ جب تم دوسروں کو اپنے سے بڑھا ہوا دیکھو گی تو ان نعمتوں کی قدر نہ کرو گی جو خدا تعالیٰ نے تم کو عطا فرمائی ہیں۔

ہمیشہ یہی سمجھو گی کہ میرے پاس کیا ہے، کچھ بھی نہیں۔ اس لیے جس پر ملنے کا ایسا اثر پڑتا ہو اس کو یہی حکم دیا جائے گا کہ وہ کسی سے نہ ملے اور اگر ملے تو غریب نادار عورتوں سے ملے، کیوں کہ غریبوں سے مل کر تمہارا جی خوش ہوگا اور خدا کا شکر کروگی کہ الحمدللہ! میں بہت سی عورتوں سے اچھی حالت میں ہوں۔

غریب خواتین سے میل جول:

اور یہی نکتہ ہے اس حدیث میں کہ حضور اکرم ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا:

يَا عَائِشَةُ! قَرِّبِي الْمَسَاكِيْنَ وَجَالِسِيْهِمْ.

اے عائشہ! مساکین کے پاس بیٹھا کرو اور ان کو اپنے سے نزدیک کیا کرو۔

مساکین کے پاس بیٹھنے سے خدا کی نعمتوں کی قدر ہوتی ہے اور دل خوش رہتا ہے۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ اُمرا کے پاس بیٹھنے سے دن بدن میری پریشانی بڑھتی رہی اور میں یہ سمجھتا تھا کہ میرے اوپر خدا کی کچھ بھی نعمت نہیں۔ پھر میں نے غُربا کے پاس بیٹھنا شروع کیا تو مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا بادشاہ ہوں اور میری ساری پریشانی دور ہوگئی اور پھر خوشی بڑھ گئی۔

دُنیا میں اپنے سے نیچے اور دین میں اپنے سے اُونچے کو دیکھو:

اسی لیے حدیث میں ہے کہ دین کے باب میں انسان کو اپنے سے اونچے کو دیکھنا چاہیے جو اس سے زیادہ دین دار ہو، اور دنیا کے باب میں اپنے سے نیچے کو دیکھنا چاہیے۔ مگر آج کل معاملہ برعکس ہے، لوگ دین کے باب میں تو ان لوگوں پر نظر کرتے ہیں جو زیادہ کام نہیں کرتے پھر اپنے دل کو سمجھا لیتے ہیں کہ اگر ہم رات کو نہیں اٹھتے تو کیا ہوا فلاں مولوی صاحب بھی تو رات کو نہیں اٹھتے۔ اگر ہم عمدہ عمدہ کپڑے پہنتے ہیں تو کیا ہوا؟ فلاں شاہ صاحب بھی تو بڑا عمدہ لباس پہنتے ہیں۔ دین کے باب میں لوگ ان بزرگوں کو نہیں دیکھتے جن کا تہجّد کبھی قضا نہیں ہوتا اور بے چارے معمولی حیثیت میں رہتے ہیں۔ اور دنیا کے بارے میں ہمیشہ اپنے سے زیادہ پر نظر کرتے ہیں کہ ہائے! میں فلاں رئیس کے برابر نہ ہوگیا۔ فلاں سوداگر کے برابر نہ ہوا۔ جس سے بجز پریشانی بڑھنے کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ عورتوں کو بھی چاہیے کہ دنیا کے

بارے میں اپنے کو گھٹیا سے دیکھیں۔ مثلاً تمہارا گھر کسی رئیس زادی کے گھر سے کم ہے، تو تم ان لوگوں پر نظر کرو جن کے گھر تم سے بھی گھٹیا ہیں کہ نہایت تنگ ہیں، پلنگ بچھنے کے بعد چلنے کو بھی راستہ نہیں رہتا۔ وہاں ہوا کا تو کہاں گذر؟ بارش کا بھی بچاؤ نہیں۔ اور تم ہوادار صحن میں ایسے آرام سے سوتی ہو کہ صبح کی نماز بھی قضا ہو جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کے مکانات دیکھ کر تم کو اپنے مکان کی قدر ہوگی کہ بلا سے اس میں جھاڑ فانوس نہیں ہیں تو کیا ہوا؟ بارش کا بچاؤ تو ہے، ہوا کا گزر تو ہے۔

شیخ سعدی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ میرے پاس جُوتا نہ تھا، تو میں رنجیدہ تھا کہ اچانک میں نے ایک ایسے آدمی کو دیکھا جس کے پیر ہی نہ تھے۔ میں نے خدا کا شکر کیا کہ میرے پیر تو ہیں، بلا سے جُوتا نہیں تو کیا ہوا۔ تو حقیقت میں دنیا کے باب میں اپنے سے کمتر حیثیت والوں کو دیکھنے سے بڑی راحت دل کو ہوتی ہے۔

ہماری حالت:

مگر اب ایسا مذاق بدلا ہے کہ دنیا میں جہاں ذرا کمی ہوئی اس کا تو قلق ہوتا ہے اور اس پر کبھی نظر نہیں ہوتی کہ اللہ تعالیٰ کی بہت سی مخلوق ہم سے بھی ابتر حالت میں ہے، ہم پھر ان سے بہت اچھے ہیں۔ اور دین میں ایسا استغنا برتا جاتا ہے کہ پانچ وقت کی نماز ہی پر اکتفا کر لیا ہے۔ اگر کوئی ان سے تہجّد و اشراق کو کہہ دے تو جواب میں یوں کہتے ہیں کہ کیا ہم مر جائیں، بہت تو کام کرتے ہیں کہ پانچ وقت کی نماز پڑھ لیتے ہیں۔ گویا انہوں نے نماز کیا پڑھی ساری جنّت ہی خرید لی۔ جیسے ایک گنوار کا لڑکا کسی مُلّا جی کے پاس پڑھتا تھا، تو ایک دن وہ گنوار مُلّا جی سے کہنے لگا کہ میرے بیٹے کو بہت نہ پڑھا دیجیو، کہیں لوٹ پوٹ پگمبر نہ ہو جاوے (یعنی پیغمبر نہ ہو جاوے)۔ تو جس طرح اس جاہل کا خیال تھا کہ زیادہ پڑھنے سے آدمی پیغمبر ہو جاتا ہے، اسی طرح آج کل لوگوں کا خیال ہے کہ بس پانچ وقت کی نماز پڑھ لینے سے آدمی جنید و شبلی ہو جاتا ہے پھر اسے اور کسی کام کی ضرورت نہیں رہتی۔

اسی طرح ایک گنوار کے سر میں درد تھا۔ ایک دوسرے گنوار نے کہا کہ آ! میں تیرا سر جھاڑ

دوں، مجھے سر کے دَرد کی جھاڑ آتی ہے۔ وہ سر کھول کے اُس کے آگے بیٹھ گیا تو آپ نے کُلْ بِاللّٰہِ ھَدْ پڑھ کر اس کے سر کو جھاڑا (یہ ﴿قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ﴾ کو بگاڑا تھا) تو وہ دوسرا گنوار کہتا ہے جس کے سر میں درد تھا کہ جا! ساڑے کے ساڑے تُو تو ہاپج ہی ہوگیا۔ (ساڑے کے ساڑے یہ خرابی ہے سالے کی جو گالی کا لفظ ہے، اور ہاپج خرابی ہے حافظ کی) سو دیکھیے! اس کے نزدیک کُلْ بِاللّٰہِ ھَدْ ہی سے آدمی حافظ ہوجاتا ہے جس میں پوری ﴿قُلْ ھُوَ اللّٰہ﴾ بھی یاد ہونا شرط نہیں اور اس کا صحیح پڑھنا بھی شرط نہیں۔ یہی حال آج کل عام لوگوں کا ہو رہا ہے کہ ان کے نزدیک جنید و شبلی بننے کے لیے پانچ وقت کی نماز سے زیادہ اور کچھ ضرورت نہیں اور ان نمازوں کا اچھی طرح ادا کرنا بھی ضروری نہیں، بس الٹی پلٹی نماز پانچ وقت پڑھ لینا کافی ہے۔

جیسا ایک جولا ہے کا قصّہ ہے کہ اس کا لڑکا انگریزی پڑھتا تھا۔ کسی نے پوچھا کہ تمہارا لڑکا انگریزی پڑھتا ہے اب کتنی لیاقت ہوگئی؟ کہنے لگا کہ کھڑا کھڑا تو مُوتنے لگا ہے اب ذرا سی کسر رہ گئی ہے۔ اس کے نزدیک بس کھڑے ہو کر موتنے لگنا بڑی لیاقت تھی کہ اس کے بعد کامل لیاقت میں ذرا ہی سی کسر رہ جاتی ہے۔ شاید وہ کسر یہ ہو کہ کھڑا کھڑا ہگنے ہی لگے۔

حقیقت یہ ہے کہ اوچھا آدمی ذرا سی بات میں اِترانے لگتا ہے۔ جو بات کسی درجہ میں بھی قابلِ فخر نہیں ہوتی وہ اسی پر ناز کرنے لگتا ہے اور یہ ساری خرابی جہل کی ہے۔ ان لوگوں کو اصلی کمالات کی خبر ہی نہیں، اسی لیے ان کی نظر میں چھوٹی چھوٹی باتیں بھی کمالات معلوم ہوتی ہیں۔

مولانا نے اس کی خوب مثال دی ہے کہ جیسے ایک مچھر ایک تنکے پر بیٹھا ہوا تھا، اس کے قریب بیل بندھا ہوا تھا۔ بیل نے جو پیشاب کیا تو وہ تنکا اسمیں تیرنے لگا۔ مچھر اپنے دل میں بڑا خوش ہوا کہ آج میں نے سمندر کے اندر کشتی پر سواری لے لی۔ وہ بے وقوف بیل کے پیشاب کو سمندر اور گھاس کے تنکے کو کشتی سمجھ گیا، کیوں کہ اس نے اصلی سمندر کو دیکھا نہیں تھا۔ یہی حال ہم لوگوں کا ہے کہ ہم نے اصلی کمالات تو دیکھے نہیں اور ذرا ذرا سی باتوں کو کمالات سمجھنے لگے۔

مولانا دیو بندی رحمہ اللہ کے یہاں ایک بوڑھے میاں پڑھتے تھے اور قسمت سے بیٹے میاں بھی ابا جان کے ساتھ پڑھتے تھے۔ باپ اور بیٹے دونوں ایک ہی سبق میں شریک تھے۔ مگر ان

کو عقل کم تھی، سبق کے وقت میں بڑے اینڈے بینڈے سوالات کرتے۔ مولانا بڑے میاں کے سوالات کا جواب کم دیتے تھے۔ جماعت میں ایک ذہین نوجوان طالب علم بھی تھے۔ مولانا ان کے سوالات کے جوابات نہایت شوق سے دیتے تھے۔ ایک دن وہ بڑے میاں ان نوجوان طالب علم سے کہنے لگے کہ مولانا تمہارے سوالات کے جوابات خوب دیتے ہیں اور ہمارے سوالات کے جوابات نہیں دیتے، حالانکہ ہم اتنے بڑے آدمی ہیں۔ اس کی کیا وجہ؟ وہ طالب علم ہنسنے لگے اور کہا کہ اس کی وجہ تم مولانا ہی سے پوچھو، میں کیا بتلاؤں۔ وہ ان کو پکڑ کر مولانا کے پاس لے گئے اور پکڑ کر اس واسطے لے گئے تاکہ مولانا کے سامنے ان کی طرف اشارہ کر کے بتلاویں کہ آپ ان کے سوالات کے جوابات کیوں دیتے ہیں؟ جیسے ایک وہمی آدمی نے نیتِ اقتدا کرتے ہوئے امام کی کمر میں انگلی ماری تھی کہ نماز پڑھتا ہوں پیچھے اس امام کے۔ اس بندۂ خدا کو بدون انگلی لگائے تسلّی نہ ہوتی تھی۔ اور جیسے فاتحہ دینے والے کھانا سامنے رکھ کر فاتحہ دیتے ہیں، تاکہ معاذ اللہ! حق تعالیٰ کو ثواب دینے میں غلطی نہ ہو جائے، کبھی ایسا نہ ہو کہ پلاؤ کی جگہ کسی دوسری چیز کا ثواب مردہ کو پہنچ جائے۔ اس لیے وہ کھانا سامنے رکھ کر نام بنام ثواب بخشتے ہیں۔

ایک گنوار نے مجھ سے پوچھا کہ کھانا سامنے رکھ کر فاتحہ دینا کیسا ہے؟ میں نے کہا: بدعت ہے۔ کہنے لگا کہ اس میں کیا حرج ہے؟ میں نے کہا کہ سامنے رکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ آخر تم روپیہ اور کپڑا بھی تو اللہ کے نام پر دیا کرتے ہو، کیا اس پر بھی فاتحہ دیا کرتے ہو؟ کہنے لگا: جی نہیں۔ میں نے کہا: پھر کھانے پر فاتحہ دینے کی کیا ضرورت ہے؟ جیسا روپیہ کپڑے کا ثواب بدون فاتحہ کے پہنچ سکتا ہے اسی طرح کھانے کا ثواب بھی بدون فاتحہ کے پہنچ سکتا ہے، دونوں میں کیا فرق ہے؟ بے چارہ تھا سمجھ دار، فوراً سمجھ گیا اور کہنے لگا: جی بات تو یہی ہے یہ سارے ڈھونگ ہیں، تم سچ کہتے ہو۔

بعض گنوار سمجھ دار ہوتے ہیں، کیوں کہ اُن کی طبعیت میں اینچ پینچ نہیں ہوتا۔ سیدھی بات کو جلدی قبول کر لیتے ہیں، مگر بعض گنوار اکھڑ بھی ہوتے ہیں۔ چناں چہ ایک گنوار نے فاتحہ کے ثبوت میں یہ دلیل بیان کی تھی کہ قرآن میں تو اس کے لیے ایک خاص سورت اتری ہے جس کا

نام ہی سورۂ فاتحہ ہے۔ بے وقوف، بھلا اس سے کوئی پوچھے کہ یہ دلیل کیسی ہوئی، کیوں کہ یہ بھی تو ممکن ہے کہ تم نے اس بدعت کو ایجاد کر کے اس کا نام سورۂ فاتحہ کے نام پر رکھ دیا ہو اور واقعہ بھی یہی ہے۔ کیوں کہ نزولِ قرآن کے وقت اس رسم کا کہیں پتا بھی نہ تھا، نہ اس طرح ثواب بخشنے کو کوئی فاتحہ کہتا تھا، تو بعض گنوار ایسے کوڑ مغز بھی ہوتے ہیں۔

غرض وہ بڑے میاں ان طالب علم کو پکڑ کر مولانا قدس سرہ کے پاس لائے اور کہا کہ حضرت! اس کی کیا وجہ کہ آپ ان کے سوالات کے جوابات دیتے ہیں اور ہمارے سوالات کے جوابات نہیں دیتے، حالانکہ ہم اتنے بڑے آدمی ہیں؟ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے جوابات بہت مختصر اور چبھتے ہوئے ہوا کرتے تھے۔ فرمایا کہ وجہ تو تم نے خود بیان کر دی۔ بس یہی تو وجہ ہے کہ تم اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہو۔ ہائے! یہ تکبّر[1] بڑا سدِّ راہ ہے، یہ کم بخت انسان کو تمام فیوض و برکات سے محروم کر دیتا ہے۔ یہی تو وہ بلا ہے جس سے شیطان مردود ہوا۔

ہمارے اندر تکبّر کی عادت:

صاحبو! ہمارے اندر یہ تکبّر گھسا ہوا ہے، اسی واسطے ہم کمالِ دین سے محروم ہیں۔ اسی کا ایک اثر یہ ہے کہ ہم نے جہاں تھوڑا سا کام کر لیا، پانچ وقت کی نماز پڑھ لی اور اپنے آپ کو کچھ سے کچھ سمجھنے لگے۔ عورتوں میں بھی یہ مرض بہت ہے۔ اوّل تو ان میں دین دار بہت ہی کم ہیں اور جو دو چار دین دار ہیں بھی، وہ اپنے آپ کو نہ معلوم کیا سمجھتی ہیں۔ جس کا منشا یہ ہے کہ عورتیں کم حوصلہ ہوتی ہیں اور ذرا سی بات میں تکبّر اور بڑائی کرنا کم حوصلہ آدمی کا کام ہے۔

ایک عورت بڑی نمازن تھی۔ اتفاق سے اس کی شادی کسی ڈاڑھی منڈے بے نمازی سے ہوگئی تو وہ کیا کہتی ہے کہ اللہ رے تیری شان! ایسی پارسا ایسے بے دین سے بیاہی گئی۔ گویا نعوذ باللہ اسے خدا پر بھی اعتراض تھا کہ خدا تعالیٰ کے یہاں کچھ ضابطہ نہیں ہے، جوڑ بے جوڑ کچھ نہیں دیکھتے۔ أستغفر اللہ! ارے! تم کو کیا خبر ہے کہ خاتمہ کس کا اچھا ہو اور خدا تعالیٰ کس کو بخشے؟ کس کو جہنّم میں بھیج دے۔ کیا تعجب ہے کہ خدا تعالیٰ اس بے نمازی کو کسی ادا پر بخش دے اور تم کو اس تکبّر کی وجہ سے دوزخ میں ڈال دے۔ اول تو خاتمہ کا حال کسی کو معلوم نہیں،

---

[1] تکبّر یعنی اپنے آپ کو بڑا سمجھنا۔

دوسرے جن اعمال پر تم کو ناز ہے کیا خبر وہ قبول بھی ہوتے ہیں یا نہیں؟ گو امید تو یہی رکھنی چاہیے کہ قبول ہوتے ہیں، مگر کوئی وحی بھی نہیں آ گئی، اس لیے ڈرتے بھی رہنا چاہیے اور کبھی اپنے اعمال پر ناز نہ کرنا چاہیے، نہ دوسروں کو حقیر سمجھنا چاہیے، اس سے اندیشہ ہے حبطِ نورِ اعمال کا۔ اسی طرح بعض لوگوں کی یہ حالت ہے کہ جہاں ذرا ان کے قلب میں حرارت پیدا ہوئی اور وہ سمجھنے لگے کہ میں صاحبِ نسبت ہو گیا۔

مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب دہلوی رحمہ اللہ (شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ کے والد بزرگ) کے پاس ایک شخص آیا اور کہنے لگا کہ میرا دل جاری ہو گیا۔ شاہ صاحب ہنسنے لگے۔ فرمایا کہ لوگوں کو کبھی حرارتِ ذکر سے خفقان (اختلاجِ قلب) ہو جاتا ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ ذکر جاری ہو گیا۔ بعض لوگوں کے ذہن میں یہ بات جمی ہوئی ہے کہ قلب جاری ہونے کا مطلب یہ ہے کہ دل کو حرکت ہو، کھٹ کھٹ کی آواز سنائی دیتی ہو۔ یاد رکھو! یہ اختلاجِ قلب ہے جو کہ سخت مرض ہے۔ اس کا نام دل کا جاری ہونا نہیں ہے۔ مکّہ معظّمہ سے جب ہم غارِ ثور پر گئے اور پہاڑ پر چڑھنا شروع کیا تو سب لوگوں کے سانس پھول گئے۔ اس وقت بے تکلّف دل کی حرکت صاف محسوس ہوتی تھی اور کھٹ کھٹ کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے ساتھیوں سے کہا کہ لو آج سب کے دل جاری ہو گئے، سب صاحبِ نسبت ہو گئے۔ اگر یہی نسبت ہے تو بس روزانہ ایک میل دوڑ لیا کرو، دل جاری ہو جایا کرے گا۔ یہ محض غلط خیال ہے۔ ذکر جاری ہونے کے لیے آواز کھٹکا کچھ ضروری نہیں۔ بلکہ ذکر جاری ہونے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ سالک کو اکثر اوقات حق تعالیٰ سے ذہول وغفلت نہ ہوتی ہو، زیادہ اوقات میں حق تعالیٰ کی طرف توجہ رہے، اسی کا نام ملکۂ یادداشت ہے، لیکن یہ بھی نسبتِ مطلوبہ نہیں ہے۔ بعض لوگ ملکۂ یادداشت کو ہی نسبت سمجھتے ہیں، یہ بھی غلطی ہے۔

سالکین کی ایک غلطی:

اور اس سے ایک بڑا دھوکہ سالکین کو پیش آتا ہے۔ وہ یہ کہ صوفیائے کرام نے فرمایا ہے کہ معصیت سے نسبت سلب ہو جاتی ہے اور ملکۂ یادداشت معصیت سے زائل ہوتا نہیں، تو جو شخص اس کو نسبت سمجھتا ہے وہ ائمۂ فن کے خلاف یہ سمجھنے لگتا ہے کہ معاصی مجھ کو مضر نہیں۔

بعض تو معاصی کو حلال سمجھنے لگتے ہیں، وہ تو زندیق ہیں۔ بعض حلال تو نہیں سمجھتے، مگر یوں خیال کرتے ہیں کہ ہم کو نسبت حاصل ہوگئی ہے جس سے ہر وقت ہم ذکر میں رہتے ہیں اور ذکر حسنہ ہے اور حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ﴾ (الھود: ۱۱۴)

حسنات سیئات کو زائل کرتی رہتی ہیں۔

پس یہ نسبت ایسا حسنہ ہے جس سے تمام گناہ دھلتے رہتے ہیں اور کوئی گناہ ہم کو مضر نہیں ہوتا۔ وہ نسبت سب گناہوں کا کفارہ ہوتی رہتی ہے۔ یہ بڑی گمراہی ہے جس کا منشا یہ ہے کہ ان لوگوں نے ملکۂ یادداشت کو جو کہ مشقِ ذکر سے پیدا ہوجاتا ہے نسبت مقصودہ سمجھ رکھا ہے۔

خوب سمجھ لو کہ نسبت اس کا نام نہیں ہے۔ نسبتِ مقصودہ کے لیے گناہ اور معصیت سخت مضر بلکہ سمِ قاتل ہے۔ نسبت کی حقیقت واحکام کی تفصیل زیادہ ہے (جس کو میں کسی قدر پرسوں کے وعظ میں بیان کرچکا ہوں) مگر اجمالاً ایک حکایت سے اس کی حقیقت سمجھ میں آجائے گی۔ وہ حکایت یہ ہے کہ ایک طالب علم سے ان کے کسی مہمان نے پوچھا تھا کہ میاں! آج کل کیا شغل ہے؟ کہنے لگے کہ شہزادی سے نکاح کی فکر میں ہوں۔ اس نے پوچھا کہ پھر کچھ سامان کرلیا ہے؟ کہنے لگے کہ آدھا سامان تو ہوگیا، آدھا باقی ہے۔ اس نے کہا: یہ کیوں کر؟ کہا: میں تو راضی ہوں، مگر وہ راضی نہیں اور نکاح طرفین کی رضا سے ہوتا ہے۔ لہٰذا ایک کا راضی ہونا آدھا نکاح ہے۔

تو جو لوگ ملکۂ یادداشت حاصل کرکے معاصی سے اجتناب نہیں کرتے اور اپنے کو صاحبِ نسبت سمجھتے ہیں اُن کی نسبت ایسی ہی ہے جیسے اس طالب علم کا آدھا نکاح، کہ یہ لوگ تو خدا سے یادداشت کا تعلّق رکھتے ہیں، مگر خدا کو ان سے کوئی علاقہ نہیں۔ یادرکھو! نسبت اس تعلّق کو کہتے ہیں جو طرفین سے ہو، یعنی بندہ کو خدا سے تعلّق ہو اور خدا کو بندہ سے تعلّق ہو اور نصوص سے یہ بات معلوم ہوچکی ہے کہ عاصی سے خدا کو رضا کا تعلّق نہیں ہوتا۔ لہٰذا معصیت کے ساتھ نسبتِ مطلوبہ کبھی جمع نہیں ہوسکتی۔ مگر افسوس ہے کہ لوگ اس غلطی میں بہت مبتلا ہیں کہ وہ ملکہ یادداشت ہی کو نسبت سمجھتے ہیں۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ میں یہ بیان کررہا تھا کہ عورتوں

میں یہ مرض زیادہ ہے کہ جہاں ذرا نماز پڑھنے لگیں اپنے آپ کو رابعہ سمجھنے لگیں۔ اوچھے آدمی بہت جلدی اپنے معتقد ہو جاتے ہیں۔ مثل مشہور ہے: **الحائك إذا صلی یومین انتظر الوحي.** جلاہا دو دن نماز پڑھ کر تیسرے دن وحی کا منتظر ہو جاتا ہے۔

اپنے نیک کاموں پر ناز نہیں کرنا چاہیے:

بہت لوگ اپنے کمالات کے معتقد ہیں، مگر ان کو یہ خبر نہیں کہ ہم دھوکہ میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں کو امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی احیاء میں کتاب الغرور دیکھنی چاہیے۔ (غرور بمعنی تکبّر نہیں یہ اردو کا محاورہ ہے۔ عربی میں غرور کے معنی دھوکہ کے ہیں۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ﴾ (الحدید: ۱٤)

ان کو اللہ نے دھوکہ میں ڈال دیا۔

یہاں دھوکہ ڈالنا ہی مراد ہے) یہ وہ کتاب ہے جس نے امام غزالی رحمہ اللہ پر کفر کے فتوے لگوائے۔ کیوں کہ اس میں انہوں نے ہر فرقہ کی غلطیاں ظاہر کی ہیں اور ان دھوکوں پر متنبہ کیا ہے، جن میں وہ مبتلا ہیں۔ تو چوں کہ اس سے دنیا بھر کے اَترے پَترے کھلتے تھے اس لیے سب لوگ ان کے دَر پے ہو گئے۔ پھر کافر بنانے کو موقع مل ہی جاتا ہے۔

چشم بد اندیش کہ برکندہ باد
عیب نماید ہنرش در نظر

بدخواہ کی آنکھ پھوٹ جائے کہ اس کی نظر میں ہنر بھی عیب دکھائی دیتے ہیں۔

جب آدمی کسی کے دَر پے ہو جاتا ہے تو اس کو کمالات بھی عیوب نظر آتے ہیں۔ وہ کتاب دعوے پست کرنے والی ہے۔ جو لوگ اپنے کمالات کے معتقد ہیں اس کو وہ دیکھیں پھر غور کریں کہ وہ کس دھوکہ میں مبتلا تھے۔ بعض لوگ اپنے اعمال پر ناز کرتے ہیں اور خوش ہیں کہ ہم خدا کی عبادت کرتے ہیں مگر ہماری طاعات کی ایسی مثال ہے جیسے بعض دفعہ نوکر آقا کو پنکھا جھلتا ہے، کبھی اتنے زور سے کہ ٹوپی بھی اس کے سر سے اُڑ جاتی ہے، کبھی اتنے آہستہ کہ اس کو ہوا بھی نہ لگے۔ آقا کو ایسا پنکھا جھلنے سے تکلیف ہوتی ہے، مگر وہ خوش اخلاقی کی وجہ سے

کچھ نہیں بولتا۔ تو اگر وہ نوکر ایسی خدمت کر کے ناز کرے کہ میں نے آج دو گھنٹہ آقا کی خدمت کی تو اس کا یہ ناز بجا ہے یا بے جا؟ یقیناً ہر شخص اس کو احمق بتائے گا کہ تو ناز کس بات پر کرتا ہے، جتنی دیر تو نے خدمت کی ہے آقا کو تکلیف پہنچائی ہے، تو اسی کو غنیمت سمجھ کہ اُس نے تجھ کو سزا نہیں دی، نہ کہ تُو اُلٹا ناز کرتا اور اپنے کو انعام کا مستحق سمجھتا ہے۔

صاحبو! یہ ہی حالت ہماری طاعات کی ہے کہ حق تعالیٰ ان طاعات پر ہم سے مواخذہ ہی نہ فرمائیں تو بس غنیمت ہے، یہ اُلٹا ناز کیسا؟ آخر کیا ہم کو اپنی طاعات کی حقیقت معلوم نہیں کہ ہم اُن کو کس طرح بے سروپا ادا کرتے ہیں۔ مولانا نے مثنوی میں ایک بہرہ کی حکایت لکھی ہے کہ وہ اپنے ایک دوست کی عیادت کرنے گیا تھا۔ راستہ میں سوچنے لگا کہ میں تو بہرہ ہوں مجھے دوسرے کی خصوص ضعیف مریض کی بات سنائی نہ دے گی، اس لیے ابھی سے حساب لگالینا چاہیے کہ میں جا کر پہلے کیا کہوں گا وہ اُس کا کیا جواب دے گا، پھر مجھ کو اس کے جواب میں کیا کہنا چاہیے۔ چناں چہ اس نے حساب لگایا کہ پہلے اس سے پوچھوں گا کہ مزاج کیسا ہے؟ وہ کہے گا: شکر ہے، پہلے سے افاقہ ہے۔ میں کہوں گا: الحمدللہ! حق تعالیٰ اور زیادہ کرے۔ پھر میں کہوں گا کہ معالجہ کون سے طبیب کا ہے؟ وہ کہے گا: فلاں حکیم صاحب کا۔ میں کہوں گا: سبحان اللہ! بہت ہی لائق طبیب ہیں، بڑی شفقت فرماتے ہیں، اُن کا علاج ترک نہ کرنا چاہیے۔ پھر پوچھوں گا: کون سی دوا استعمال میں ہے؟ وہ کسی دوا کا نام لے گا، مَیں کہوں گا: خدا اس کو آپ کی رگ و پے میں پیوستہ کرے اور خوش گوار فرمائے۔

یہ حساب لگا کر وہ پہنچے۔ بیمار نے جو بہرہ کی صورت دیکھی، گھبرا گیا کہ یہ کم بخت کہاں سے آ گیا؟ اب یہ میرا دماغ کھائے گا، اپنی سب کچھ کہہ لے گا میری بات سنے گا نہیں۔ اب بہرہ میاں آگے آئے اور مزاج پوچھا کہ اب طبیعت کیسی ہے؟ بیمار نے جھلاّ کر کہا: حال کیا ہوتا، مر رہا ہوں۔ آپ نے کہا: الحمدللہ! خدا اور زیادہ کرے۔ بیمار اور جھلاّ گیا۔ پھر پوچھا: کون سے حکیم صاحب کا علاج ہے؟ اس نے کہا: ملک الموت علیہ السلام کا۔ آپ نے کہا: سبحان اللہ! بڑے ہی لائق طبیب ہیں، ان کا علاج کبھی نہ چھوڑیے، ماشاء اللہ! بڑے ہی شفیق ہیں، اللہ تعالیٰ ان کا قدم مبارک فرماوے۔ پھر پوچھا کہ آج کل کون سی دوا استعمال میں ہے؟ اس

نے کہا: زہر پی رہا ہوں۔ آپ بولے: ماشاء اللہ انگبین ہے، خدا اس کو آپ کی رگ رگ میں پیوستہ کرے اور خوشگوار بنائے۔

تو اب آپ غور کیجیے کہ ایسی عیادت سے کیا کسی کا جی خوش ہوسکتا ہے؟ ہرگز نہیں، مگر وہ بہرہ اپنے دل میں خوش تھا کہ میں نے اپنے دوست کا حق ادا کردیا، اس کی عیادت کرلی اور اس کا جی خوش کردیا۔ ڈلے پتھر، جی خوش کردیا! وہ تو اس کی جان کو کوستا ہوگا۔

مولانا فرماتے ہیں کہ بعض لوگ ایسی ہی عبادت کرتے ہیں جیسی اس شخص نے عیادت کی تھی اور ان کا اپنی عبادت پر خوش ہونا ایسا ہی ہے جیسا وہ بہرہ اپنی عیادت پر خوش تھا۔

صاحبو! یہ حال ہے ہماری ان عبادات کا جن پر ہم ناز کرتے ہیں، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو کچھ عبادت ٹوٹی پھوٹی ہم کررہے ہیں اس کو بھی چھوڑ دیا جائے۔ بعضے ایسے احمق ہیں کہ جو یہی مطلب سمجھے ہوں گے کہ جب ہماری عبادت کسی کام کی نہیں تو پھر کیوں سر مارا؟

اللہ تعالیٰ کی بے حساب رحمت:

ارے! وہ ایسے کریم ہیں کہ اکثر ٹوٹی پھوٹی عبادت کو بھی قبول کرلیتے ہیں۔ نقل کو اصل کی جگہ کردیتے ہیں۔ جیسا آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض کاریگر مٹی کا خربوزہ بنا کر رؤسا کے سامنے پیش کرتے ہیں اور وہ ان کو انعام دے دیتے ہیں، حالانکہ اس میں سوا مٹی کے اور کچھ نہیں ہوتا مگر چونکہ خربوزہ کی شکل ہوتی ہے اس لیے وہ اس کی وہی قدر کرتے ہیں جو اصلی خربوزہ کی کرتے ہیں، بلکہ اصلی خربوزہ سے بھی بعض دفعہ زیادہ قیمت دے دیتے ہیں، مگر شرط یہ ہے کہ نقل پوری ہو۔ افسوس یہ ہے کہ ہمارے اعمال میں تو نقل بھی صحیح نہیں ہوتی۔ اب یہ کیا نماز ہے کہ قیام میں ہاتھ زانوں پر پڑے ہوئے ہیں۔ ہاتھ بھی تو ڈھنگ سے نہیں باندھے جاتے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی کچھ بھی عظمت دل میں نہیں۔ عورتیں الحمد کو الہمد پڑھتی ہیں۔ الفاظ بھی درست نہیں اور خشوع خضوع کا تو کیا ذکر۔

یاد رکھو! قرآن کا صحیح پڑھنا واجب ہے۔ کم از کم جتنا قرآن نماز میں پڑھو اس کو تو ضرور صحیح کرلو۔ اس کی کوشش کرنا ہر ایک کے ذمہ واجب ہے۔ کوشش کے بعد بھی درست نہ ہو تو

معذور ہے۔ تو دیکھیے! ہم تو نماز کی نقل بھی صحیح طور پر نہیں کرتے۔ باقی امید تو یہ ہے کہ حق تعالیٰ اس مکروہ نماز کو بھی قبول فرمالیتے ہیں، کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ یہ لوگ مہمل ہیں، ان کے پاس ہے ہی کیا؟ اس مہمل نماز کو بھی رد کردیا جائے تو یہ بالکل ہی محروم رہ جائیں گے، اس لیے اکثر تو وہ ہماری بے ڈھنگی طاعت کو بھی قبول ہی فرمالیتے ہیں۔

قبولیت کی علامت:

حاجی صاحب کا ارشاد ہے کہ بھائی! جس عبادت کے بعد پھر اس کی توفیق دوبارہ ہوجائے تو یہ اس کے قبول ہونے کی علامت ہے۔ اگر پہلی عبادت قبول نہ ہوئی ہوتی تو دوبارہ اس کی توفیق نہ ہوتی۔ کیوں کہ بادشاہ کو جس شخص کا اپنے دربار میں آنا ناگوار ہوتا ہے تو ایک بار کے بعد دوبارہ اس کو اپنے دربار میں گھسنے نہیں دیا کرتا۔ یہ دلیل اُمید کے واسطے بہت ہے، گو قطعی دلیل نہیں۔ ہاں أَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِيْ بِيْ (میں اپنے بندہ کے گمان کے نزدیک ہوں جو اس کو میرے ساتھ ہے) کو اس کے ساتھ ملالو تو پھر کافی ہے۔

عورتوں کے لیے دین میں کمال حاصل کرنے کا طریقہ:

غرض میرا یہ مطلب نہیں کہ اگر اس وقت تم کو کامل عبادت کی توفیق نہیں تو ناقص کو چھوڑ دو، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اسی پر بس نہ کرو بلکہ اس کی تکمیل کی کوشش کرو۔ دین کا طریقہ معلوم کرو اور دین میں کامل بننے کی سعی کرو جس کا طریقہ کتبِ دینیہ کا پڑھنا سننا ہے۔ خصوصاً عورتوں کے لیے تو یہی ایک طریقہ ہے، کیوں کہ ان کو علما سے ملنے اور ان سے مسائل دریافت کرنے اور ان کے مواعظ و بیانات سننے کا موقع ہی نہیں ملتا لہٰذا ان کو کتبِ دینیہ کے پڑھنے اور سننے کا زیادہ اہتمام کرنا چاہیے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ اول تو عورتیں پڑھتی ہی نہیں ہیں اور جو لکھنا پڑھنا جانتی ہیں وہ دین کی کتابیں ہی نہیں دیکھتیں۔ اب ان کو پڑھنے کی کیا کتابیں رہ گئی ہیں؟ سانپ نامہ، معجزہ آلِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک جھوٹا قصّہ ہے، اور وفات نامہ جس میں غلط روایات ہیں، اور ہرنی نامہ، یہ قصّہ صحیح ہے مگر اس سے بھی کچھ احکام معلوم نہیں ہوتے، اور منظوم تفسیر سورۂ یوسف، اس میں بھی بعض روایات صحیح نہیں ہیں۔ پھر اس

میں زُلیخا کے عشق کو بہت صاف صاف بیان کیا گیا ہے جس کا اثر اخلاق پر بہت بُرا پڑتا ہے۔

آج کل کی عورتوں کی دینی تعلیم:

بس یہ ہے عورتوں کی انتہائی تعلیم۔ جس نے یہ کتابیں پڑھ لیں وہ گویا سب سے زیادہ پڑھی ہوئی ہے۔ جیسے سہارن پور میں ایک جاہل آیا تھا، اس نے یہی کتابیں پڑھی تھیں اور اس کو ناز تھا کہ میں بھی عالم ہوں۔ چناں چہ جمعہ کی نماز کے بعد اُس نے خود ہی اعلان کیا۔ بھائیو! اُواج (وعظ) ہوگی۔ آپ کی لیاقت کا حال تو لوگوں کو ان دو لفظوں ہی سے معلوم ہوگیا، مگر تماشا دیکھنے کے لیے لوگ بیٹھ گئے کہ دیکھیں بھائی! اُواج کیسی ہوتی ہے۔ وعظ تو بہت سنے مگر اُواج کبھی نہ سنی تھی۔ تھوڑی دیر میں واعظ صاحب منبر پر پہنچے اور تین مرتبہ یٰسٓ یٰسٓ یٰسٓ پڑھ کر اس کی تفسیر بیان کی: اے محمد، اے محمد، اے محمد! اگر میں تجھے نہ پیدا کرتا تو نہ عرش کو پیدا کرتا، نہ کرسی کو، نہ آسمان کو، نہ زمین کو۔ بھائیو! آدھی اُواج آج ہوگئی آدھی کل کو ہوگی۔ ہارے تھکے ہیں، خرچ پاس نہیں ہے، کچھ ہماری امداد کرو۔ بس وعظ ختم ہوا۔ اول تو احمق نے یٰسٓ کو شین سے پڑھا۔ پھر اس کی تفسیر کیسی خوبصورت کی۔ اس مجمع میں ایک نابینا عالم بھی جن کا نام مولانا سعید الدین صاحب تھا موجود تھے اور لوگ اُن کے علم وفضل کے معتقد تھے۔ انہوں نے لوگوں سے فرمایا کہ ذرا ان مولانا کو میرے پاس لانا۔ چناں چہ لایا گیا۔ آپ نے فرمایا کہ ان کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دو (کہیں بھاگ نہ جائیں)۔ غرض اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر آپ نے دریافت فرمایا کہ مولانا! آپ کی تحصیل کہاں تک ہے؟ تو واعظ صاحب فرماتے ہیں کہ ہماری تحصیل ہاپوڑ۔ مولانا سعید الدین صاحب سمجھ گئے کہ بے چارہ بالکل جاہل ہی ہے، اس کو تحصیل کے معنیٰ بھی معلوم نہیں۔ پھر آپ نے اردو الفاظ میں کہا کہ میں یہ پوچھتا ہوں کہ تم نے کہاں تک تعلیم حاصل کی ہے؟ کہنے لگا کہ ہم نے پڑھا ہے: ہرنی نامہ، وفات نامہ، معجزہ آلِ نبی ﷺ، ساپن نامہ۔ اور تُو کیا جانے اندھے؟ مولانا سعید الدین صاحب نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور لوگوں سے فرمایا کہ اس کو کچھ نہ کہو، جانے دو، بے چارہ معذور ہے۔

تو جیسے اس جاہل کو ان کتابوں کے پڑھنے پر ناز تھا کہ اس نے ایک فاضل شخص کو بھی منہ نہ لگایا اور صاف کہہ دیا کہ تُو کیا جانے اندھے؟ اسی طرح آج کل جو عورتیں یہ کتابیں پڑھ لیتی ہیں وہ اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھنے لگتی ہیں کہ بس اب ہم سے زیادہ پڑھا لکھا کون ہوگا۔ پھر غضب یہ ہے کہ عورتیں چونکہ عموماً اَن پڑھ ہیں اس لیے ان میں سے جو کچھ پڑھ لیتی ہیں ان کی قدر خوب ہونے لگتی ہے، کیوں کہ دوسری عورتیں اتنا بھی پڑھنا نہیں جانتی۔ جب ان کی قدر ہونے لگی تو اب ان کو آگے پڑھنے کی کیا ضرورت رہی۔

عورتیں جاہل پیروں کی جلدی معتقد ہوجاتی ہیں:

گنگوہ میں ایک جاہل واعظ آیا تھا جو جہنّم کو جہندم کہتا تھا۔ اس کے وعظ عورتوں میں ہوا کرتے تھے اور عورتیں اس کی بہت معتقد تھیں، بلکہ بعضے مرد بھی معتقد تھے اور یوں کہتے تھے کہ یہ ایسا بڑا عالم ہے کہ مولوی رسید کو تو بارہ برس پڑھاوے۔ میں نے کہا: واقعی مولانا رشید احمد صاحب کو تو بارہ برس میں بھی یہ علوم نہ حاصل ہوں گے۔ بارہ برس تو کیا وہ تو ساری عمر میں بھی جہنّم کو جہندم بھی نہ کہہ سکیں گے۔ تو یہ عورتیں ہر ایک کی بہت جلدی معتقد ہوجاتی ہیں، چاہے اس نے الف بے تے ہی پڑھی ہو، اور یہ سب جہل کی خرابی ہے۔ اور جو اُن میں پڑھی لکھی کہلاتی ہیں وہ بھی جاہل ہی ہیں، کیوں کہ ان کے درس میں ایسے ایسے فضول قصّے رہ گئے ہیں جن سے احکام کا علم بالکل نہیں ہوتا۔

مری بار کیوں دیر اتنی کری؟

آج کل ایک مناجات پڑھی جاتی ہے جس کو عورتیں اور مرد بڑے شوق سے سنتے ہیں، جس میں ہر دو شعر کے بعد یہ مصرعہ پڑھا جاتا ہے:

مری بار کیوں دیر اتنی کری

اس کا مضمون بالکل خلاف شرع ہے، مگر جہل ایسا عام ہوا کہ کسی کو بھی ادھر التفات نہیں ہوتا۔ اس نظم میں اوّل تو خدا تعالیٰ کی شکایت ہے کہ سب کو تو یہ یہ نعمتیں دے دیں اور میری بار میں کیوں دیر کر رکھی ہے۔ اس میں علاوہ شکایت کے حق تعالیٰ کی طرف نعوذ باللہ! ظلم کی بھی

نسبت ہے کہ عجب کارخانہ ہے جس میں کچھ ضابطہ ہی نہیں کہ ایک بندے کو سب کچھ دے دیا اور مجھے ٹال رکھا ہے، اب تک میرا مقصود پورا نہیں ہوتا۔ نیز اس میں حضراتِ انبیا علیہم السلام کی مساوات کا بھی دعویٰ ہے اور ان پر حسد بھی ہے، کیوں کہ اس میں تمام انبیائے مشہورین کا ذکر کیا گیا ہے کہ آدم علیہ السلام کو یہ دیا اور نوح علیہ السلام کو دی پیغمبری اور سلیمان (علیہم السلام) کو دی سروری۔ اور ہر ایک کے بعد یہ مصرعہ بھی ہے کہ

مری بار کیوں دیر اتنی کری

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ شاعر کو ان حضرات پر حسد ہے کہ ان کو تو سب کچھ مل گیا اور مجھے کچھ بھی نہ ملا، مری باری میں دیر ہو رہی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ناظم کی نیت بھی یہی تھی، مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ مطلب ان اشعار کا مدلول ضرور ہے اور قاعدہ ہے کہ جس بات میں ایہامِ خلاف بھی ہو اس سے بھی منع کیا جائے گا۔ آخر حق تعالیٰ نے صحابہ کو رَاعِنَا کہنے سے کیوں منع فرمایا؟ کیا معاذ اللہ! صحابۂ کرام کے ذہن میں اس کے معنی کچھ بُرے تھے؟ ہرگز نہیں بلکہ محض اس لیے کہ یہ لفظ مُوہم ہوتا ہے برے معنی کو۔ اور دشمنوں کو موقع ملتا ہے کہ اس کو بُرے معنیٰ کا قصد کر کے استعمال کریں۔ اس قاعدہ کے تحت میں یہ نظم بھی داخل ہے، گو قائل کا قصد برا نہ ہو۔ پس اس کا پڑھنا اور سننا اور پڑھوانا سب ناجائز ہے۔

ناول اور افسانے:

پس یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ عورتوں کے نصابِ تعلیم میں تمام فضول اور خرافات قصّے ہی رہ گئے۔ اور یہاں تک بھی بس تھی۔ اب تو غضب یہ ہے کہ عورتیں ناول پڑھتی ہیں جس سے اخلاق بہت ہی خراب ہو جاتے ہیں۔ ان ناولوں کی بدولت شُرفا کے گھروں میں بھی بڑے بڑے واقعات شرمناک وقوع میں آچکے ہیں، مگر اب بھی ان کی آنکھیں نہیں کھلتیں۔ میں کہتا ہوں کہ ان ناولوں سے تو وہ پرانی کتابیں قصّہ گل بکاؤلی و چہار درویش و طلسم ہوشربا ہی غنیمت ہیں، اگرچہ میں اُن کے دیکھنے سے بھی عورتوں کو سختی سے منع کرتا ہوں۔ مگر واللہ! ان ناولوں سے وہ ہزار درجہ بہتر ہیں۔ ان کے برابر وہ اخلاق کو خراب نہیں کرتیں۔ قصّے گو ان میں

بھی خرافات ہی ہیں، مگر تدابیر اختلاط وحیلہائے وصول الی المقصود (مقصود تک پہنچنے کے حیلے) ان میں ایسے بتلائے ہیں جو نہایت متعذر الحصول (جن کا حاصل ہونا دشوار ہے) اور دشوار ہیں۔ مثلاً شاہ زادے کا گل بکاؤلی کے باغ میں پہنچنا کیسے ہوا کہ راستہ میں ایک دیو ملا اس کو اس نے ماموں بنایا، اسے اس پر رحم آیا اور اس نے باغ میں پہنچا دیا۔ اسی طرح چہار درویش کے قصّے میں بھی تمام صورتیں حصولِ مقصود کی ایسی ہیں جو انسان کے قبضہ کی نہیں ہیں، خدا ہی چاہے تو ان طریقوں سے مقصود میسّر آ سکتا ہے۔ اور ان کم بخت ناولوں میں تو ایسی سہل سہل ترکیبیں لکھی ہیں جن سے ہر شخص کام لے سکتا ہے۔ مثلاً یہ کہ عاشق نے کسی نین کو یا جلاٗہی کو لالچ دیا کہ میں تجھ کو اتنے روپے دوں گا، تو فلاں لڑکی سے مجھ کو ملا دے۔

اب یہ ترکیب اتنی آسان ہے کہ جس کے پاس روپیہ ہو وہ اس سے بآسانی کام نکال سکتا ہے، کیوں کہ ایسی عورتیں بہت جلد لالچ میں آ جاتی ہیں، نہ ان میں دین ہے نہ حیا، نہ کسی کی آبرو کا ان کو خیال، ان کے ذریعہ سے گھروں میں کچھ سے کچھ واقعات ہو جانا بڑی بات نہیں۔ اس لیے میں ان ناولوں کو گل بکاؤلی وغیرہ سے بھی بدتر جانتا ہوں۔

گھر کے بڑوں کی ذمہ داری:

صاحبو! خدا کے واسطے اپنی عورتوں کو ان ناپاک کتابوں سے بچاؤ اور ناول کو ہرگز اپنے گھر میں نہ گھسنے دو۔ اگر کہیں نظر بھی پڑ جائے تو فوراً جلا دو۔ اور عورتوں کے پاس ایسی کتابیں پہنچاؤ جن میں دین کے پورے اجزا سے کافی بحث ہو، عقائد کا بھی مختصر بیان ہو، وضو اور پاکی ناپاکی کے بھی مسائل ہوں۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، نکاح، بیع وشرا کے بھی مسائل ہوں۔ اصلاحِ اخلاق کا طریقہ بھی مذکور ہو، آداب اور سلیقہ کی باتیں بھی بیان کی گئی ہوں۔ یہ بات مردوں کے ذمہ ہے۔ اگر وہ اس میں کوتاہی کریں گے تو ان سے بھی مواخذہ ہوگا، کیوں کہ حق تعالیٰ کا حکم ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِیْكُمْ نَارًا﴾ (التحریم:۶)

اے مسلمانو! اپنی جانوں کو بھی جہنّم سے بچاؤ اور اپنے گھر والوں کو بھی۔

اگر کوئی مرد خود متّقی بن جائے اور اپنے گھر والوں کے دین کی خبر نہ لے تو خدا تعالیٰ اس کی عورتوں کے ساتھ اس کو بھی جہنّم میں بھیج دیں گے۔ تنہا اس کا متّقی بن جانا قیامت میں عذاب سے نجات کے لیے کافی نہ ہوگا۔

تکمیلِ دین کا طریقہ:

پس مردوں کا کام یہ ہے کہ عورتوں کے پاس ایسی کتابیں پہنچائیں اور عورتوں کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے مردوں سے یہ کتابیں پڑھیں اور ان پر عمل کریں۔ خود بھی دیکھیں اور اپنی لڑکیوں کو بھی پڑھائیں اور جو اَن پڑھ عورتیں ہیں ان کو بھی احکام سنائیں اور ہمت کر کے ان پر عمل کا اہتمام کریں، ان شاء اللہ تعالیٰ دین بہت جلد مکمّل ہوجائے گا۔ اجمالاً میں نے دین کامل کرنے کا طریقہ بتلا دیا، اب مجھے تفصیل کی ضرورت نہیں رہی۔ لیکن جس طرح بعض ضروری فروع پر مردوں کے وعظ میں تنبیہ کی گئی تھی اسی طرح بعض فروع یہاں بھی بیان کرتا ہوں جن میں اکثر عورتیں کوتاہی کرتی ہیں، تاکہ ان پر قیاس کر کے وہ دوسرے اجزائے دین سے بھی غفلت نہ کریں، کیوں کہ اس وقت میں ان فروع کا ذکر کروں گا جو بہت ظاہر ہیں۔ جب ان میں بھی کوتاہیاں کی جاتی ہیں تو دوسرے فروع کا کیا حال ہوگا؟ اس کو خود سمجھ لینا چاہیے۔

نماز میں کوتاہیاں:

چناں چہ سب سے پہلے میں نماز کا بیان شروع کرتا ہوں جس کا فرض ہونا ہر مسلمان کو معلوم ہے، مگر افسوس ہے کہ عورتیں نمازی بہت کم ہیں، حالاں کہ قرآن کی ایک آیت میں نماز ترک کرنے کو شرک میں داخل کیا گیا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿مُنِيبِينَ إِلَيْهِ وَاتَّقُوهُ وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ۝﴾ (الروم: ۳۱)

اس کی طرف رجوع کرنے والے بنو اور اس سے ڈرو اور نماز قائم کرو اور مشرکین میں سے مت بنو۔

اس سے معلوم ہوا کہ نماز نہ پڑھنا مشرک بننا ہے۔ اور حدیث میں تو یہ مضمون بہت صاف ہے۔

مَنْ تَرَكَ الصَّلَاةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ.

جس نے نماز کو قصداً ترک کر دیا وہ کافر ہو گیا۔

گو جمہور علما نے ان آیات واحادیث میں تاویل کی ہے کہ مطلب یہ ہے کہ نماز کا چھوڑنا کافروں کا سا کام کرنا ہے۔

مگر صاحبو! اللہ تعالیٰ نے اور رسول اللہ ﷺ نے تو ظاہر الفاظ میں ایسے شخص کو کافر کہہ دیا ہے، گو علما تاویل کرتے ہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ یہ تاویل غلط ہے، لیکن ہم کو اس تاویل کے بھروسہ پر بے فکر نہ ہونا چاہیے، کیوں کہ خدا اور رسول ﷺ جس بات کو کفر فرما رہے ہیں اگر وہ واقع میں کفر بھی نہیں تو یقیناً کفر سے بہت قریب ہے۔ اور کفر کا انجام جو کچھ ہے سب کو معلوم ہے کہ ابد الآباد کے لیے جہنّم کی سزا ہے، تو جو کام اس سے قریب کرنے والا ہو مسلمان کو اس سے کوسوں دُور بھاگنا چاہیے۔

بعض عورتیں نماز پڑھتی ہیں، مگر افسوس یہ ہے کہ وہ رکوع وسجدے ٹھیک نہیں کرتیں، بڑی جلدی کرتی ہیں، حالاں کہ تعدیلِ ارکان واجب ہے، بلکہ بعض علما کے نزدیک فرض ہے۔ تعدیلِ ارکان کا مطلب یہ ہے کہ نماز کے ہر رکن کو اطمینان وسکون کے ساتھ ادا کیا جائے۔ مثلاً رکوع کے بعد سر اُٹھا کر تھوڑی دیر سیدھا کھڑا ہو جانا چاہیے اور **سمع اللہ لمن حمدہ ربنا لك الحمد** سیدھا کھڑا ہو کر کہے۔ اس کے بعد اطمینان سے سجدہ میں جائے، اس کو قومہ کہتے ہیں۔ عورتیں قومہ بالکل نہیں کرتیں اور بعض مرد بھی نہیں کرتے۔ بس رکوع سے فارغ ہو کر ذرا سر کا اشارہ کر کے فوراً سجدہ میں چلے جاتے ہیں، اس طرح نماز نہیں ہوتی۔ رکوع کے بعد سیدھا کھڑا ہو جانا ضروری ہے۔ اسی طرح اکثر عورتیں دونوں سجدوں کے بیچ میں جلسہ نہیں کرتیں، بس ایک سجدہ کر کے ذرا سا سر کا اشارہ کر کے فوراً دوسرا سجدہ کر دیتی ہیں، اس طرح بھی نماز نہیں ہوتی۔ اس کا خوب خیال رکھو اور قومہ وجلسہ اطمینان سے ادا کرو۔

بعض عورتیں قرآن غلط پڑھتی ہیں، اس کا اہتمام بھی ضروری ہے۔ بعض دفعہ ایسی غلطی ہو جاتی ہے جس سے نماز ٹوٹ جاتی ہے۔ چند سورتیں نماز کے لیے کم از کم ضرور صحیح کر لو۔ بعض عورتیں نماز وقت سے ٹال دیتی ہیں۔ نماز کا وقت آ گیا اور بیٹھی باتیں بنا رہی ہیں۔ جب وقت

قریب الختم ہوتا ہے اس وقت پیشاب پاخانہ کے لیے لوٹا ہاتھ میں لیا جاتا ہے، حتیٰ کہ ان مقدمات ہی میں وقت نکل جاتا ہے۔ یاد رکھو! بدون کسی عذر کے نماز کا وقت سے ٹالنا سخت گناہ ہے (عورتوں کو سب نمازیں اول وقت میں پڑھنی چاہییں، ان کے لیے یہی افضل ہے)۔

بعض دفعہ ایام سے پاک ہونے کے بعد جلدی نماز شروع نہیں کرتیں، دو تین وقت ٹال دیتی ہیں کہ کل کو سر دھو کر بال درست کر کے نہاویں گے، پھر نماز شروع کریں گے۔ اس کا حکم یہ ہے کہ اگر تین دن پورے ہونے سے پہلے پاک ہو جائے تب تو آخرِ وقتِ مستحب تک انتظار کرنا واجب ہے۔ اگر آخر وقت تک پاک ہی رہی تو غسل کر کے نماز پڑھنا واجب ہے۔ اور اگر تین دن کے بعد مگر عادت سے پہلے پاک ہوئی تو آخر وقت تک انتظار کرنا مستحب ہے، پھر غسل کر کے نماز پڑھنا واجب ہے۔ غرض پاکی نظر آنے کے بعد ایک وقت کی نماز قضا کرنا بھی جائز نہیں۔ اور یہی حکم روزہ کا ہے، خوب سمجھ لو۔

(عورتوں کو اپنے ایامِ عادت کا یاد رکھنا واجب ہے اس میں غفلت جائز نہیں۔ ایامِ عادت کے بھول جانے سے بڑی پریشانی ہوگی اور اس کے لیے مسئلہ بہت پیچ در پیچ ہو جائے گا۔ جب کوئی عورت کسی معمول سے پاک ہو فوراً اس کے دن لکھ لیوے یا اچھی طرح یاد کر لیوے۔ جامع) پاکی ناپاکی کے مسائل معلوم کرنا بھی عورتوں کے ذمہ لازم ہے۔ بقدرِ ضرورت ''بہشتی زیور'' میں اس کے مسائل موجود ہیں، کسی سمجھ دار عورت سے یا اپنے شوہروں سے سمجھ کر پڑھ لیں۔

بچوں کی تربیت اور نماز:

بعض عورتیں اگر خود نماز کی پابندی کرتی ہیں تو وہ اپنے بچوں اور ماماؤں کو نماز کے واسطے نہیں کہتیں۔ بچوں کی پرورش زیادہ تر ماؤں کی آغوش میں ہوتی ہے، لہٰذا ان کو اخلاقِ حسنہ سکھانا اور نماز وغیرہ کی تعلیم دینا عورتوں کے ذمہ ہے، اس میں ہرگز غفلت نہ کریں، جب بچہ سات برس کا ہو جاوے اس وقت سے نماز کی تاکید شروع کریں، اور جب دس سال کا ہو جاوے تو مار پیٹ کر اسے نماز پڑھاویں۔ اَطبّا نے لکھا ہے کہ اخلاقِ حسنہ واعمالِ صالحہ کا اثر صحت پر بھی اچھا ہوتا ہے۔ جس بچے کو نیک کاموں کی عادت ہوگی اس کی صحت بھی عمدہ ہوگی۔

عورتوں کو بچوں کی صحت کا بہت خیال ہوتا ہے، اس لیے میں نے یہ فائدہ بھی بتلا دیا کہ اگر کسی کو دین کا خیال نہ ہو تو صحت ہی کا خیال کر کے بچوں کو نماز وغیرہ کی تاکید کرتی رہے۔

اسی طرح ماماؤں کو بھی نماز کی تاکید کرنی چاہیے۔ چوں کہ وہ تمہاری ماتحت ہیں اگر تم ان کو دھمکاؤ گی تو ضرور اثر ہوگا اور اس میں سستی کرنے سے تم پر بھی مواخذہ رہے گا کہ تم نے قدرت ہوتے ہوئے کیوں سستی کی۔ بلکہ جس ماما کو مقرر کرو اس سے یہ شرط کرلیا کرو کہ تم کو پانچوں وقت کی نماز بھی پڑھنا ہوگی۔ جس گھر میں ایک شخص بھی بے نمازی ہوتا ہے اس گھر میں نحوست برستی ہے۔ عورتوں کو اس طرف تو بالکل ہی توجہ نہیں۔

عورتیں اور روزہ:

یہ تو عورتوں کی نماز کے متعلق چند کوتاہیاں ہیں۔ روزہ کو میں اس واسطے نہیں کہتا کہ عورتوں کو روزہ زیادہ دشوار نہیں، اس میں وہ ماشاء اللہ مردوں سے بھی زیادہ شیر ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ عورتیں روزے بہت رکھ لیتی ہیں، مگر نماز سے ان کی جان نکلتی ہے۔ اور روزہ رکھنا کچھ عورتوں کا زیادہ کمال بھی نہیں، بلکہ اس میں ایک طبی راز ہے۔ وہ یہ کہ ان میں رطوبت و برودت کا غلبہ ہے۔ سرد مزاج والے کو بھوک پیاس کم لگتی ہے اس لیے ان کو روزہ آسان ہے۔ دوسرے ان کو کھانے کے اندر مشغولی رہتی ہے، اپنے ہاتھ سے سب چیزیں پکاتی ہیں۔ خوش بو سونگھتی رہتی ہیں اس سے بھوک فوراً کم ہو جاتی ہے۔ صرف پیاس کی تکلیف رہ گئی، اس کی سہار بھی ان کو مشکل نہیں، کیوں کہ اول تو وہی برودت و رطوبت مانع عطش بھی ہے۔ دوسرے یہ دن بھر گھر ہی میں رہتی ہیں، کہیں دھوپ میں آنے جانے کا ان کو کام نہیں پڑتا۔ رہا یہ کہ کھانا پکانے میں آگ کے سامنے بیٹھنا پڑتا ہے، تو اکثر جو عورتیں روزہ دار ہیں وہ اپنے ہاتھ سے کم پکاتی ہیں، ان کے آگے خدمت کرنے کو مامائیں موجود ہوتی ہیں اور جن کو خود کام کرنا پڑے وہ یہ ترکیب کرتی ہیں کہ پہلے سالن کی ہانڈیاں تیار کرلیتی ہیں۔ سالن پکانے میں آگ کے سامنے جم کر نہیں بیٹھنا پڑتا۔ ایک دفعہ آگ جلادی، ہانڈی رکھ دی اور چلتے پھرتے پکالی۔ پھر جب عصر کا وقت ہو گیا، گرمی کم ہو گئی جلدی جلدی پندرہ بیس منٹ میں روٹی پکالی،

اس لیے ان کو کھانا پکانے میں بھی کچھ زیادہ دقّت نہیں ہوتی۔

تیسری وجہِ سہولت روزہ کی یہ ہے کہ عموماً عورتوں کو کھانے کی حرص کم ہوتی ہے، ان کو عمدہ کھانا مرغوب نہیں ہوتا۔ بس اُن کی ہانڈی محض مردوں کی خاطر سے پکتی ہے۔ اگر کبھی مرد گھر پر نہ ہو تو یہ چٹنی پیس کر ہی گزر کر لیتی ہیں۔ شریف عورتیں عمدہ غذائیں کھانے سے بہت بچتی ہیں۔ آپس میں کہا کرتی ہیں کہ اگر ہم اچھی غذائیں کھائیں گے تو لوگ یوں کہیں گے کہ بڑی چٹوری ہے۔ ہائے! یہ کیسی بری بات ہے۔ جب یہ اس طرح اپنے نفس کو مارتی ہیں تو رفتہ رفتہ ان کی بھوک بھی مرجاتی ہے۔ اس لیے روزہ میں ان کا کمال نہیں، بلکہ اس میں مردوں کا کمال ہے کہ ہاؤ ھپ ہیں اور پھر روزہ رکھتے ہیں۔ مگر افسوس! اب مردوں نے روزہ رکھنے میں ہمت بہت ہار دی ہے۔ آج کل مردوں میں روزہ دار بہت کم ہیں۔

روزہ اور غیبت:

پس میں عورتوں سے یہ تو نہیں کہتا کہ وہ روزہ نہیں رکھتیں، ہاں روزہ میں غیبت سے بچنے کو ضرور کہوں گا کیوں کہ ان کا روزہ غیبت سے بہت کم پاک ہوتا ہے۔ جب ان کو روزہ میں کھانے پکانے کا دھندا کم ہوتا ہے تو آپس میں محفل جما کر بیٹھتی ہیں اور تیری میری غیبت، شکایت میں روزہ برباد کرتی ہیں۔ یوں تو غیبت ہر حال میں حرام ہے، مگر روزہ کی حالت میں اس کا گناہ زیادہ ہے۔ جیسے زنا کرنا ہر جگہ حرام ہے اور مکّہ معظّمہ میں کرنا سخت گناہ ہے، کیوں کہ شرفِ مکان و شرفِ زمان سے بھی جس طرح طاعات کا ثواب بڑھتا ہے اسی طرح معاصی کا گناہ بھی بڑھ جاتا ہے۔ نیز روزہ میں پان کھانے والیاں یہ بھی کوتاہی کرتی ہیں کہ سحری میں منہ کے اندر پان دبا کر سو رہتی ہیں۔ اگر صبح تک منہ میں پان رہا تو روزہ نہیں ہوتا، اس کی احتیاط بہت ضروری ہے۔

زکوٰۃ کی کوتاہیاں:

زکوٰۃ میں بھی عورتیں بہت سستی کرتی ہیں کہ اپنے زیوروں، لچکوں کی زکوٰۃ نہیں دیتیں۔ یاد رکھو! جتنا زیور عورت کو جہیز میں ملتا ہے وہ اس کی مِلک ہے، اس کی زکوٰۃ دینا اس پر واجب

ہے۔ اور جو زیور شوہر کے گھر سے ملتا ہے اگر وہ اس نے ان کی مِلک کر دیا ہے تو اس کی زکوٰۃ بھی ان پر واجب ہے، اور اگر ملک نہیں کیا محض پہننے کے واسطے دیا ہے تو اس کی زکوٰۃ مردوں کے ذمہ واجب ہے۔ ہر سال اپنے زیور کا حساب کر کے جتنی زکوٰۃ اپنے ذمہ ہو فوراً ادا کر دینی چاہیے۔ اس میں سستی کرنے سے گناہ ہوتا ہے۔

دیکھو! خدا تعالیٰ نے بہت سے غریبوں کو مال نہیں دیا، حالاں کہ تم ان سے کچھ زیادہ نہیں ہو۔ اکثر غُرَبا کمالات میں تم سے بڑھے ہوئے ہیں کہ وہ نمازی بھی ہیں، دین دار بھی ہیں، پھر بھی جواُن کو خدا نے مال نہیں دیا اور تم کو دیا ہے تو اس کی کیا وجہ؟ خدا نے امیروں کو اسی واسطے مال دیا ہے کہ وہ غریبوں کو دیا کریں۔ کیوں کہ ہر شخص اتنے ہی مال کا حق دار ہے جتنے کی اس کو ضرورت ہے۔ پھر جس کو خدا نے حاجت سے زیادہ مال دیا ہے وہ جمع کرنے کے واسطے نہیں ہے، بلکہ ان لوگوں کو دینے کے واسطے ہے جن کو حاجت کے موافق بھی نہیں ملا۔ اور اس میں خدا تعالیٰ کی بہت سی حکمتیں ہیں کہ وہ غریبوں کو امیروں کے ہاتھ سے دلوانا چاہتے ہیں۔ اس قاعدہ کا تو یہ مقتضیٰ تھا کہ امیروں کو یہ حکم دیا جاتا کہ جتنا مال ان کی ضرورت سے زیادہ ہو سب غریبوں کو دے دیا کریں کیوں کہ عقلاً وہ اُن ہی کا حق ہے، لیکن یہ خدا کی کتنی بڑی رحمت ہے کہ اس نے سارا مال دینے کا حکم نہیں کیا، بلکہ صرف چالیسواں حصّہ واجب کیا ہے۔ پھر اس میں بھی کوتاہی کرنا بڑا ظلم ہے۔

پردہ میں کوتاہی:

ایک کوتاہی عورتوں میں یہ ہے کہ ان میں پردہ کا اہتمام کم ہے۔ اپنے عزیزوں میں جو نامحرم ہیں ان کے سامنے بے تکلّف آتی ہیں۔ ماموں زاد، چچا زاد، خالہ زاد بھائیوں سے بالکل پردہ نہیں کرتی ہیں اور غضب یہ کہ ان کے سامنے بناؤ سنگھار کر کے بھی آتی ہیں۔ پھر بدن چھپانے کا ذرا اہتمام نہیں کرتیں، گلا اور سر کھلا ہوا ہے اور ان کے سامنے آجاتی ہیں۔ اور اگر کسی کا سارا بدن ڈھکا ہوا بھی ہے تو کپڑے ایسے باریک ہوتے ہیں کہ جن میں سارا بدن جھلکتا ہے، حالاں کہ باریک کپڑے پہن کر محارم کے سامنے آنا بھی جائز نہیں، کیوں کہ محارم سے علاوہ ماتحت الاِزار کے پیٹ اور کمر اور پہلو اور پسلیوں کا چھپانا بھی فرض ہے۔

پس ایسا باریک کُرتا پہن کر محارم کے سامنے آنا بھی جائز نہیں جس سے پیٹ یا کمر یا پہلو یا پسلیاں ظاہر ہوں یا ان کا کوئی حصّہ نظر آتا ہو۔ شریعت نے تو محارم کے سامنے آنے میں بھی اتنی قیدیں لگائی ہیں، اور آج کل کی عورتیں نامحرموں کے سامنے بھی بے باکانہ آتی ہیں گویا شریعت کا پورا مقابلہ ہے۔ بیبیو! پردہ کا اہتمام کرو اور نامحرم عزیزوں کے سامنے قطعاً نہ آؤ اور محارم کے سامنے احتیاط سے آؤ۔

اس جگہ مجھ کو ایک بات یاد آئی جس پر اہلِ علم کو تنبیہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ یہ کہ متون میں صرف یہ مسئلہ لکھا ہوا ہے کہ محارم کے سامنے ماتحت الازار کے علاوہ ظہر و بطن کا چھپانا ضروری ہے اور شروح میں اس پر اتنی زیادت اور مذکور ہے: مَعَ الْجَنْبَیْنِ یعنی پہلوؤں کا چھپانا بھی ضروری ہے۔ اس کو ایک بہت بڑے عالم نے مَعَ الْجَبِیْنِ پڑھ کر ترجمہ یہ کر دیا کہ محارم سے پیشانی کا بھی چھپانا فرض ہے۔ یہ بہت بڑی غلطی ہے اور حیرت ناک غلطی ہے، کیوں کہ جبین داخلِ وجہ ہے اور سترِ وجہ فرض نہیں، کیوں کہ وجہ و کفّین وقدمین عورت نہیں ہیں، گو بوجہ خوف فتنہ کے غیرِ محارم کے سامنے کشفِ وجہ سے وجوباً منع کیا جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے، اس سے وجہ کا داخلِ عورت ہونا لازم نہیں آتا۔ اس لیے یہ مسئلہ اگر کسی کی نظر سے گزرے تو دھوکہ نہ کھاوے۔ اس میں ان عالم سے غلطی ہوگئی ہے، مگر اس سے ان کے عالم فاضل ہونے میں کچھ نقص نہیں آگیا۔ کیوں کہ عالم سے کسی مقام پر لغزش بھی ہو جاتی ہے اور اس سے کوئی بھی بچا ہوا نہیں ہے بجز انبیا علیہم السلام کے۔ (گو لغزش ان سے بھی ہو جاتی ہے، مگر وہ خطا پر مستمر نہیں رہ سکتے، وحی سے فوراً ان کو متنبہ کر دیا جاتا ہے۔ جامع)

الغرض عورتوں کو نامحرم عزیزوں سے گہرا پردہ کرنا چاہیے۔ ہاں جس گھر میں بہت سے آدمی رہتے ہوں جن میں بعض نامحرم ہوں اور بعضے محرم اور گھر تنگ ہو اور پردہ کرنے کی حالت میں گزر مشکل ہو، ایسی حالت میں نامحرم عزیزوں سے گہرا پردہ کرنے کی ضرورت نہیں اور نہ ایک گھر میں اس طرح نباہ ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں نامحرموں کے سامنے بقدرِ ضرورت چہرہ کا کھولنا جائز ہے مگر باقی تمام بدن سر سے پیر تک لپٹا ہوا ہونا چاہیے۔ کفوں کے چاک سے ہاتھ نہ جھلکیں۔ گریبان کھلا ہوا نہ رہے، بٹن اچھی طرح لگے ہوئے ہوں تاکہ گلا اور سینہ نہ

جھلکے۔ دوپٹے سے تمام سر لپٹا ہوا ہو کہ ایک بال بھی باہر نہ رہے۔ اس طرح بدن کو چھپا کر ان کے سامنے منہ کھول کر گھر کا کام کاج کر سکتی ہیں (اور بہتر یہ ہے کہ ایسی حالت میں بھی گھونگھٹ کی عادت رکھیں، کھلّم کھلا ان کے سامنے چہرہ ظاہر نہ کریں۔ جامع) اور یہ حکم کافر عورتوں کا ہے کہ ان کے سامنے صرف چہرہ اور ہاتھ اور پیر کھولنا جائز ہے باقی تمام بدن کا ان سے چھپانا واجب ہے کہ سر کا بال بھی اُن کے سامنے نہ کھلے۔ عورتیں بھنگنوں اور چماریوں سے بالکل احتیاط نہیں کرتیں حالاں کہ ان سے بھی بجز وجہ اور کفین اور قدمین کے باقی بدن کا شرعاً ویسا ہی پردہ ہے جیسے نامحرم مردوں سے، لیکن گھبراؤ نہیں کہ اتنی احتیاط ہم سے کسی طرح ہو سکتی ہے۔ تم احتیاط کرنا تو شروع کرو۔ ان شاء اللہ تعالیٰ ذرا دقّت نہ ہوگی۔

نفس کی مثال:

یاد رکھو! اس نفس کی مثال بچہ جیسی ہے کہ بچہ اگر دودھ نہ چھڑایا جاوے تو وہ بارہ برس تک بھی دودھ ہی پیتا رہے گا اور خود کبھی نہ چھوڑے گا۔ اور اگر دو برس کے بعد دودھ چھڑا دیا جائے تو دو چار روز کے لیے تو دقّت ہوتی ہے مگر پھر بچہ کو روٹی کی ایسی عادت ہو جاتی ہے کہ اس کو ماں کے دودھ سے نفرت ہو جاتی ہے۔ اور اب اگر کوئی اس سے دودھ پینے کو کہے تو وہ ہرگز راضی نہ ہوگا۔ یہی حال نفس کا ہے۔ اگر گناہوں کے کام اس سے نہ چھڑائے جائیں تب تو یہ کبھی اپنے آپ اُن سے نہیں رُک سکتا، اور اگر ہمت کر کے قصد کر لیا جائے کہ بس آج سے پیچھے یہ گناہ نہ کریں گے تو اوّل اوّل دو چار روز تک تو تکلیف ہوتی ہے پھر آسانی ہو جاتی ہے، بلکہ کچھ دنوں کے بعد اس سے نفرت ہو جاتی ہے۔ پھر جیسے بچہ کا اگر دودھ نہ چھڑایا جاوے تو اس کا معدہ کمزور رہتا ہے کہ عمدہ اور نفیس غذائیں ہضم نہیں کر سکتا اور دودھ چھڑانے کے بعد وہ دنیا بھر کی نعمتیں کھانے لگتا ہے۔ ان کا مزہ چکھ کر باپ ماں کو دعا دیتا ہے کہ خدا ان کا بھلا کرے کہ انہوں نے میرا دودھ چھڑا کر ان نعمتوں کے قابل مجھے بنا دیا۔ اسی طرح گناہوں کو چھوڑ کر آپ کا دل انوارِ طاعت کے قابل ہو جائے گا۔ پھر جب طاعات کے انوار قلب پر فائز ہوں گے تو آپ بھی دعا دیں گے کہ خدا اس شخص کا بھلا کرے جس نے گناہوں کو ہم سے چھڑا کر ہم کو ان انوار کے قابل بنا دیا۔ پھر آپ کو ان گناہوں کی طرف التفات بھی نہ ہوگا البتہ

چندروز ہمت کرنا پڑے گی:

چند روزے جہد کن باقی بخند

چندروز کوشش کرو پھر خوش رہو گے۔

اور چندروز کے لیے ہمت کرنا کچھ مشکل بھی نہیں۔ کیا آپ بچے سے بھی گئے گزرے ہیں کہ وہ تو دودھ چھڑانے کی کلفت برداشت کرلیتا ہے اور آپ سے ایک ذرا سی کلفت برداشت نہ ہو۔

شوہر کا ادب واحترام:

ایک کوتاہی عورتوں کی یہ ہے کہ وہ شوہروں کی تعظیم اوران کا ادب نہیں کرتیں اور یہ سخت بے حیائی ہے۔ بعضی عورتیں مردوں سے ایسا برابری کا برتاؤ کرتی ہیں کہ گویا شوہران کا برابر کا بھائی ہے، اور یہ بھی غنیمت ہیں۔ بعض جگہ تو عورتیں مردوں پر حکومت کرتی ہیں حالاں کہ شریعت میں شوہروں کی تعظیم کے متعلق سخت تاکید ہے۔ حدیث میں صاف آیا ہے کہ اگر میں خدا کے سوا کسی کے لیے سجدہ کو جائز کرتا تو عورتوں کو حکم دیتا کہ اپنے شوہروں کو سجدہ کیا کریں، لیکن سجدہ تو خدا کے سوا کسی کو جائز نہیں۔ مگر اس سے یہ بات تو معلوم ہوگئی کہ شوہر کی کس درجہ تعظیم عورتوں کے ذمہ واجب ہے (کہ جو چیز خدا کے لیے مخصوص ہے اگر اس کا مستحق کوئی غیر ہوسکتا تو شوہر اس کا مستحق ہوتا)۔ بعض جگہ تو عورتیں مردوں کو ذلیل کرتی ہیں۔ اور بعض جگہ مرد بھی ظالم ہوتے ہیں کہ وہ عورتوں کو بہت ذلیل رکھتے ہیں۔ اور بعض جگہ دونوں طرف سے یہ برتاؤ ہوتا ہے۔ قیامت میں ان سب کا حساب ہوگا اور جس نے جس کی حق تلفی کی ہوگی اس سے انتقام لیا جائے گا۔ پس مردوں کو چاہیے کہ وہ عورتوں کے حقوق کی رعایت رکھیں اور عورتوں کو مردوں کی تعظیم کرنی چاہیے، ان کی اطاعت وفرماں برداری کا خیال کرنا چاہیے۔

فضول خرچی کی عادت:

ایک کوتاہی عورتوں کی یہ ہے کہ یہ اسراف بہت زیادہ کرتی ہیں۔ روپیہ کو احتیاط سے خرچ نہیں کرتیں۔ بس یہ سمجھ لیا ہے کہ ہم کو تو کمانا پڑتا نہیں، ہم جس طرح چاہیں خرچ کریں۔ مرد اپنے آپ کما کر لائے گا۔ بعض جگہ مامائیں خوب گھر لوٹتی ہیں اور یہ ذرا خبر نہیں لیتیں۔

یاد رکھو! شوہر کے مال کی نگہبانی عورتوں کے ذمہ واجب ہے، اس کو اس طرح رائیگاں کرنا ان کو جائز نہیں۔ قیامت میں عورتوں سے اس کا بھی حساب ہوگا۔ خصوصاً شادیوں میں تو بہت ہی فضول خرچی کرتی ہیں، ان میں تو عورتیں ہی مفتیِ اعظم ہوتی ہیں۔ سارے کام ان ہی سے پوچھ پوچھ کر کیے جاتے ہیں۔ مرد جانتے ہی نہیں کہ شادیوں میں کہاں خرچ کی ضرورت ہے، کہاں نہیں۔ بس جس جگہ عورتیں خرچ کرنے کا حکم دیتی ہیں وہاں بلا چوں وچرا خرچ کیا جاتا ہے۔ اور ان عورتوں نے ایسے بے ڈھنگے خرچ نکال رکھے ہیں جن میں فضول روپیہ برباد ہوتا ہے۔

ان شادیوں کی بدولت بہت سے بڑے بڑے گھر تباہ وبرباد ہو گئے ہیں، لیکن اب بھی لوگوں کو عقل نہیں آتی اور وہ ان رسوم وغیرہ میں عورتوں کا اتباع نہیں چھوڑتے۔ حتی کہ ایک صاحب یہ کہتے تھے کہ خدا بھلا کرے ''اصلاح الرسوم'' کے مصنّف کا کہ ہم کو رسموں کی تفصیل یاد نہ رہی تھی، اس میں ہم عورتوں کے محتاج تھے۔ ''اصلاح الرسوم'' میں بہت تفصیل کے ساتھ تمام رسموں کو لکھ دیا ہے۔ بس اب ہم اسی کو دیکھ دیکھ کر سب کام کرتے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ. اس بندۂ خدا نے ''اصلاح الرسوم'' سے یہ کام لیا حالاں کہ اس میں تو رسموں کی خرابیاں ظاہر کی گئی ہیں اور ہر رسم کا گناہ ہونا بتلایا گیا ہے، مگر اس ظالم نے اس مضمون کو تو چھوڑ دیا اور صرف رسموں کا بیان دیکھ لیا کہ فلاں وقت یوں ہوتا ہے، اس کے بعد یہ ہوتا ہے۔ تو اب بھی لوگوں کی آنکھیں نہیں کھلیں۔ جب سارا گھر باہر نیلام ہو جائے گا اس وقت شریعت کے موافق شادی کرنے کی سوجھے گی۔

بچت کرنا اور رقم جمع رکھنا:

صاحبو! شادیوں میں بہت اختصار کرنا چاہیے تاکہ بعد میں افسوس نہ ہو کہ ہائے! ہم نے یہ کیا کیا۔ اگر کسی کے پاس بہت زیادہ ہی رقم ہو تو اس کو اس طرح برباد کرنا مناسب نہیں، بلکہ دنیا دار کو کچھ رقم جمع کرنا بھی چاہیے اس سے دل کو اطمینان رہتا ہے۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ صاحبِ اسباب کو کچھ رقم اپنے پاس نفس کے بہلاوے کے لیے جمع رکھنی

چاہیے، اس سے دل مطمئن رہتا ہے اور طاعات میں یکسوئی نصیب ہوتی ہے۔ صاحبِ اسباب کے پاس اگر رقم جمع نہ ہو تو اس کا دل پریشان رہتا ہے، جس سے دین کے کاموں میں خلل پڑتا ہے۔ ہاں جس کو توکل کی دولت نصیب ہو وہ جمع نہ کرے، بلکہ خوب اللہ کے نام پر لٹائے تاکہ ثواب بھی ملے، مگر فضول روپیہ برباد نہ کرو۔

موت اور غمی کی رسمیں:

ایک کوتاہی عورتوں میں یہ ہے کہ یہ غمی میں بھی بہت اسراف کرتی ہیں۔ بھلا وہاں خرچ کا کیا موقع ؟ وہ تو کوئی افتخار کا وقت نہیں بلکہ عبرت کا موقع ہے، مگر ان کے یہاں غمی میں بھی خاصی بارات کا اہتمام ہوتا ہے۔ پھر حیرت تو ان جانے والیوں پر ہے کہ جہاں کسی کے گھر موت ہوئی اور یہ گاڑیاں لے کر اس کے گھر پہنچ گئیں۔ اب اس غریب پر ایک تو موت کا صدمہ تھا، دوسرا یہ وبال سر پر آ کھڑا ہوا کہ آنے والیوں کے کھانے کی فکر کرے۔ پان چھالیہ کا انتظام کرے، گاڑی کے گھاس دانہ کا اہتمام کرے۔ پھر اگر ذرا بھی کسی بات میں کوتاہی ہوگئی تو آنے والیاں طعنے دیتی ہیں کہ ہم گئے تھے، پان بھی نصیب نہ ہوا۔ بھلا کوئی ان سے پوچھے کہ یہ وقت تمہارے ناز نخرے پورے کرنے کا تھا یا اس بے چاری پر مصیبت کا وقت تھا؟ مگر ان کی بلا سے ان کے ناز نخرے کسی وقت کم نہیں ہوتے۔ حالاں کہ اس وقت تو یہ مناسب تھا کہ آنے والیاں اپنا دال آٹا ساتھ باندھ کر لاتیں اور گھر والوں سے کہہ دیتیں کہ اس وقت تم ہماری فکر نہ کرو تم خود مبتلائے رنج ہو، جب بھی خوشی کا موقع ہوگا ہماری خاطر مدارت کر لینا۔ باقی اس وقت تو ہم اپنا انتظام خود ہی کریں گے۔ اور یہ تو بہت ہی سخت بے حیائی ہے کہ وہاں جا کر بھی اپنے سارے معمولات پورے کریں کہ نہ پان میں فرق آوے نہ چائے میں۔

بلند شہر میں ایک رئیس زادے کے باپ کا انتقال ہوگیا تھا۔ ان کے اعزہ چاروں طرف سے جمع ہوگئے اور ایک بارات سی ان کے گھر پر آگئی۔ رئیس زادے نے سب کے لیے عمدہ عمدہ کھانے پکوائے۔ جب کھانا چنا گیا تو اس نے مہمانوں سے کہا کہ مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔ پہلے میری بات سن لیجیے، پھر کھانا شروع کیجیے گا۔ سب لوگ ہاتھ روک کر بیٹھ گئے۔ اس نے

سب کو مخاطب کر کے کہا کہ آپ حضرات کو معلوم ہے کہ اس وقت مجھ پر کیسا سانحہ گزرا ہے۔ اس وقت میرے والد ماجد کا سایہ میرے سر پر سے اُٹھ گیا ہے اور سب جانتے ہیں کہ باپ کا سایہ اٹھ جانے سے کیسا صدمہ ہوتا ہے؟ تو کیا یہی انصاف ہے کہ مجھ پر تو یہ مصیبت گزرے اور تم آستین چڑھائے مرغن کھانا کھانے کو تیار ہو گئے؟ کیوں صاحب! یہی ہمدردی ہے؟ بس مجھ کو جو کہنا تھا کہہ چکا، اب کھانا شروع کیجیے۔ بھلا اب کون کھاتا، جب سر پر جوتیاں پہلے ہی پڑ گئیں۔ سب لوگ دستر خوان سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور رئیس زادے نے غُربا کو بلا بھیجا کہ بیٹھو، کھاؤ، تمہارے کھانے سے میرے باپ کی روح کو ثواب بھی پہنچے گا۔ اور یہ برادری کے کھاتے پیتے لوگ جو آستین چڑھا کر بیٹھ گئے، ان کے کھانے سے ان کو کیا ثواب ملتا اور میری رقم برباد ہو جاتی۔

غرض غریبوں نے خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور دعا دیتے ہوئے چلے گئے۔ اس کے بعد برادری کے چند معزز لوگ اس طرف جا کر بیٹھے اور غمی کی رسوم میں مشورہ کرنے لگے۔ سب نے بالاتفاق یہ طے کیا کہ واقعی یہ رسمیں بالکل عقل کے خلاف ہیں اور شریعت کے خلاف تو ہیں ہی، ان سب کو یک لخت موقوف کر دینا چاہیے۔

کسی نے ان رئیس زادے سے کہا کہ میاں! جب تم کو کھلانا منظور نہ تھا تو پہلے ہی سے یہ بات کہہ دی ہوتی، اتنا انتظام ہی تم نے کیوں کیا تھا؟ اس نے جواب دیا کہ اگر میں یہ انتظام نہ کرتا اور کھانا تیار کرنے سے پہلے یہ بات کہتا، تو لوگ یوں کہتے کہ اپنی بچت کے لیے یہ بات نکالی ہے۔ اب کسی کا یہ منہ نہیں رہا کہ مجھے یہ الزام دے سکے، کیوں کہ میں نے کھانے عمدہ سے عمدہ تیار کرا دیے تھے جس سے معلوم ہو گیا کہ مجھے اپنی بچت منظور نہ تھی، بلکہ محض اس بے ہودہ رسم کا بے ہودہ ہونا ظاہر کرنا تھا۔

واقعی اس شخص نے خوب کیا۔ اگر دو چار آدمی اسی طرح کریں تو یہ سب رسمیں موقوف ہو جاویں۔ مگر ایسا کرنے کے لیے ہمت کی ضرورت ہے، ہر ایک کی ایسی ہمت نہیں ہوتی۔ جب کسی کے گھر پر آدمی پہنچ جاتے ہیں تو وہ شرما شرمی ان کا انتظام کرتا ہی ہے، مگر جانے والوں کو خود اس کا خیال کرنا چاہیے۔

خلاصہ:

یہ تو نمونہ ہے عورتوں کی کوتاہیوں کا، ان سے بچنے کا ان کو اہتمام کرنا چاہیے۔ یہاں تک تو گویا ﴿وَاتَّقُوا اللّٰہَ﴾ (اللہ تعالیٰ سے ڈرو) کا بیان ہوا۔ کیوں کہ تقویٰ کے معنیٰ معاصی سے بچنے ہی کے ہیں۔ نمونہ کے طور پر میں نے چند معاصی کی فہرست گنا دی ہے۔ اور یہ تو وہ باتیں ہیں جو اس وقت میرے ذہن میں بے تکلّف آ گئیں، اسی پر دوسرے اعمال کو قیاس کر لیں کیوں کہ ہمارے اکثر اعمال کوتاہی سے خالی نہیں۔ اگر کوئی عورت یہ خیال کرے کہ اس آیت میں تو تقویٰ کا امر اول مردوں کو ہے اور ان کے واسطہ سے ہم کو ہے، مگر کہیں خاص ہم کو بھی حکم ہوا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں خاص عورتوں کو بھی اس کا حکم ہوا ہے۔ حق تعالیٰ سورۂ احزاب میں فرماتے ہیں: ﴿وَاتَّقِیْنَ اللّٰہَ﴾ جو کہ صیغہ جمع مؤنث حاضر کا ہے، اس میں خاص عورتوں ہی کو خطاب ہے، اب تو سوال نہیں رہا۔

نیک لوگوں کی صحبت اور عورتوں کے لیے اس کا طریقہ:

اب میں دوسرے جزو ﴿کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ﴾ کے متعلق کچھ مختصر بیان کرتا ہوں (کیوں کہ وقت کم رہ گیا ہے، نمازِ عصر قریب ہے)۔ اس جزو کا حاصل تو یہی ہے کہ اس میں کمالِ دین حاصل کرنے کا طریقہ بتلایا گیا ہے کہ تم کاملین اور راسخین فی الدین کے ساتھ ہو جاؤ۔ مردوں کو تو اس طریقہ پر عمل کرنا آسان ہے۔ اب قابلِ غور یہ ہے کہ عورتوں کے لیے اس کا طریقہ کیا ہے؟ اور یہ سوال واقعی بہت ضروری ہے۔ سو جواب یہ ہے کہ اس کے دو طریقے ہیں: ایک یہ کہ عورتیں بھی ان ہی بزرگوں سے فیض حاصل کریں جن سے مرد فیض حاصل کرتے ہیں، مگر یہ ذرا دشوار ہے، کیوں کہ اول تو مردوں اور عورتوں کا ساتھ کیا؟ دوسرے پردہ کی وجہ سے شیخ کو ان سے مناسبت کامل نہیں ہو سکتی اور بدون مناسبت کے نفع کامل نہیں ہوتا اور بزرگوں کے سامنے آنا اور ان سے پردہ نہ کرنا جائز نہیں، ہاں جن عورتوں کا باپ یا خاوند قابل ہو وہ ان سے فیض حاصل کر سکتی ہیں، مگر سب کے تو باپ اور شوہر کامل نہیں اس لیے یہ طریقہ کافی نہیں۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مرد کامل مردوں سے فیض لیں اور عورتیں کامل عورتوں سے۔ اور اصل قیاس کا مقتضی بھی یہی ہے کہ جس طرح مردوں کو حکم ہے: ﴿کُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِیْنَ﴾ (اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ) اسی طرح عورتوں کو حکم دیا جاوے: کُنَّ مَعَ الصَّادِقَاتِ (اے عورتو! تم سچّی عورتوں کے ساتھ ہو جاؤ)، مگر اس پر سوال یہ ہوتا ہے کہ کیا عورتیں بھی کامل ہو سکتی ہیں؟ جواب یہ ہے کہ ہاں! قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں بھی کامل ہو سکتی ہیں، کیوں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے مردوں کو صادقین فرمایا ہے اسی طرح عورتوں کو صادقات فرمایا ہے۔

چناں چہ سورۂ احزاب کی ایک آیت ﴿إِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ﴾ (مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں) میں نے ذرا دیر ہوئی پڑھی تھی۔ اس میں یہ بھی ہے ﴿وَالصَّادِقِیْنَ وَالصَّادِقَاتِ﴾ (سچّے مرد اور سچّی عورتیں)۔ اور صادقین کے معنی کاملین کے ہیں تو صادقات بمعنی کاملات ہوا، اس سے عورتوں کے بھی کامل ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ اور واقعی عورتوں کی اصلاح کا سب سے اچھا طریق یہی ہے کہ جو عورتیں کامل ہوں یہ ان کی صحبت میں رہیں، مگر افسوس ہے ہمارے طبقۂ اناث پر کہ آج کل ان میں کامل بہت کم ہیں۔

جب میں نے ''جزاءُ الاعمال'' لکھی ہے تو اس میں میں نے چند بزرگوں کے نام کی فہرست لکھی تھی کہ عام لوگ ان میں سے کسی کے ساتھ وابستہ ہو جاویں۔ اس وقت میرا جی چاہا کہ چند عورتوں کے نام بھی لکھوں تاکہ عورتیں ان سے فیض حاصل کریں۔ مگر عورتوں میں کوئی ایسی نظر ہی نہ پڑی جس کا نام میں اطمینان کے ساتھ لکھ دیتا۔ اور بعضے ایسی بھی تھیں جن کے کمال کی خبریں میں سنتا تھا اور اس وقت تک ان کے متعلق کوئی بات بے اطمینانی کی نہ تھی، مگر ان کا نام لکھنے سے چند وجوہ سے رکا:

۱۔ یہ کہ ان کے کمالات عورتوں ہی کی زبانی سنے تھے، خود مجھ کو ان کے کمال کی تحقیق نہ تھی اور نہ تحقیق کی کوئی صورت تھی، بخلاف ان بزرگوں کے جن کے نام شایع کیے گئے تھے کہ ان سب سے میں خود مل چکا تھا۔ اور عورتوں کے بیانات پر مجھے وثوق نہ ہوا کہ نہ معلوم یہ اپنے ذہن میں کمال کسے سمجھتی ہوں گی اور کس کو کامل کہتی ہوں گی۔ ان سے یہ بھی بعید نہیں کہ ناقص کو کامل سمجھتی ہوں۔

۲۔ اگر عورتوں کا نام کاملات کی فہرست میں شایع ہوا تو ایسا نہ ہو کہ مردوں کو بھی ان سے اعتقاد ہو جاوے اور بعض مرد اُن سے فیض حاصل کرنے جاویں۔

۳۔ ممکن ہے کہ عورتیں دور دراز سے ان کی ملاقات وزیارت کے لیے سفر کریں اور ایسا ضرور ہوتا اور میں عورتوں کے لیے سفر کو پسند نہیں کرتا۔ اور جب عورتیں سفر کر کے ان کے پاس آتیں تو ان بے چاری کاملات کو آنے والیوں کی خاطر مدارات اور مہمانی کرنی پڑتی جس سے اُن پر بار ہوتا۔

۴۔ پھر آنے والیوں کی خاطر مدارات کے متعلق ان کاملات میں اور ان کے شوہروں میں نزاع ہوتا۔ شوہر جھلاّتا کہ میرے گھر یہ روز روز گاڑیاں کیسی آنے لگیں۔ مردوں کو روز روز عورتوں کے آنے سے پردہ وغیرہ کی تکلیف ہوتی، اُن کی آزادی میں خلل پڑتا۔

۵۔ اس قدر رجوعات سے کہیں ان کاملات کا دماغ نہ بڑھ جاتا، کیوں کہ یہ تعظیم وتکریم وہ بلا ہے کہ اس کے ساتھ کامل سے کامل مرد کو بھی سنبھلنا دشوار ہوتا ہے۔ عورتوں کا دماغ تو بہت ہی بڑھ جاتا کہ ہاں ہم بھی کچھ ہیں۔ تو اِن بے چاریوں کا تھوڑا بہت جو کچھ کمال تھا وہ بھی اس تکبّر کے بدولت زائل ہو جاتا۔

خیر! وجوہ تو میرے ذہن میں بہت سی آئیں، مگر سب سے زیادہ مانع پہلی وجہ تھی کہ ان کے کمالات عورتوں ہی کی زبانی سنے ہوئے تھے اس لیے پوری طرح وثوق نہ ہوا۔ اور حقیقت میں میرا خیال صحیح نکلا۔ کیوں کہ میں نے جن مردوں کو کاملین میں شمار کیا تھا الحمدللہ! اس وقت تک قریب قریب میں ان سب کے کمال کا معتقد ہوں، اور بجز ایک دو کے باقی سب ایسے ہیں کہ ان کی بابت کوئی بات خلافِ کمال مجھے معلوم نہیں ہوئی۔ اور جن عورتوں کے متعلق میں نے کامل ہونے کی خبریں سنی تھیں قریب قریب اس وقت میں ان میں سے کسی کا معتقد نہیں رہا، کیوں کہ ہر اِک میں کچھ نہ کچھ بات بعد میں معلوم ہوئی۔ اس لیے میں خدا کا شکر کرتا ہوں کہ اس وقت میں نے ان کے نام شایع نہ کیے، ورنہ شایع ہو جانے کے بعد اب بڑی دقت ہوتی۔ چناں چہ ان ہی میں سے ایک مسماۃ ایک قصبہ کی رہنے والی بھی تھیں، جن کو میں نے کاملات میں شمار کرنے کا قصد کیا تھا۔ ان کا نام جنّت تھا، شاید اب تو وہ مرگئی ہیں۔ اس وقت ان کی

حالت بہت اچھی سننے میں آ رہی تھی کہ بہت نیک ہیں، سوائے نماز روزہ اور تسبیح کے ان کو اور کوئی کام نہیں تھا، لڑکیوں کو پڑھایا بھی کرتی تھیں مگر اخیر میں وہ بجائے جنّت کے دوزخ بن گئیں۔

اسی قصبہ میں کچھ زمانہ سے ایک بے نکاحی عورت نے فتنہ برپا کر رکھا ہے، اپنے آپ کو ولی اور بزرگ ظاہر کرتی ہے۔ مردوں عورتوں کو مرید کرتی ہے اور کسی سے شادی نہیں کرتی۔ اس کم بخت کے ایک بچہ بھی بدون خاوند کے ہوا۔ جب اس سے پوچھا گیا تو اس نے جواب دیا کہ جس طرح مریم علیہا السلام کے عیسیٰ علیہ السلام بدون باپ کے ہوئے تھے، اسی طرح میرے بھی بدون باپ کے بچہ ہوگیا۔ نعوذ باللہ! مگر عورتوں کی جہالت دیکھیے کہ باوجود ایسی بے حیائی اور بدکاری کے پھر بھی اس کی معتقد ہیں اور اس کو ''پیرانی'' کا لقب دے رکھا ہے۔ حیرت یہ ہے کہ بعضے مردوں کی عقل پر بھی پتھر پڑ گئے کہ پڑھ لکھ کر ڈوب گئے اور اس کے معتقد بن گئے اور ان تمام بدکاریوں اور بے حیائیوں کی تاویل کرنے لگے۔ (خدا غارت کرے! **قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ أَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ** ۔ (اللہ تعالیٰ ان کو ہلاک کرے کہاں جا رہے ہیں۔ جامع)

وہ بی بی جنّت بھی اخیر عمر میں ایسی بے حیا عورت کی معتقد ہوگئی تھیں اور اس کی مرید بن گئی تھیں۔ اور ان کے سامنے جو کوئی اس کی برائی کرتا اور ان کو بے وقوف بتاتا کہ تم ان کی مرید کیوں ہوگئیں؟ تو وہ الٹا کہنے والے کو بے وقوف بتاتیں اور اسے کوسنے دیا کرتیں۔

غرض اخیر میں وہ بالکل مسخ ہوگئی تھیں (خدا مغفرت کرے!) تو جن عورتوں کو میں نے کامل سنا تھا، کچھ دنوں کے بعد اکثروں کا ناقص ہونا معلوم ہوگیا۔ تو اب یہ صورت تو عورتوں کی اصلاح کی ہو نہیں سکتی کہ وہ آپس میں اپنی ہم جنس عورت سے فیض حاصل کریں۔ اب دو ہی صورتیں ہیں:

عورتوں کی اصلاح کی پہلی صورت:

ایک یہ کہ جن کے محارم میں سے کوئی کامل ہو وہ اس سے مستفیض ہوں، جس کا خاوند کامل ہو وہ اپنے خاوند سے فیض حاصل کرے، مگر اس میں یہ مشکل ہے کہ شوہر تو بعض جگہ غلام ہے، ورنہ برابر کا دوست تو ہے ہی۔ شوہر کی تعظیم وتکریم عورتیں اس درجہ نہیں کرتیں جتنی مربی

کی تعظیم ہونی چاہیے اور بدون اس کے فائدہ نہیں ہوسکتا۔

دوسرے بیوی کو شوہر سے ویسا اعتقاد بھی نہیں ہوتا جیسا دوسروں سے اعتقاد ہوتا ہے، گو اپنا شوہر کتنا ہی بڑا کامل ہو۔ ہمارے حضرت حاجی صاحب قدس سرہ کے گھر میں جو پہلی بیوی تھیں باوجودیکہ حضرت کی بہت فرمانبردار تھیں، مگر بیعت ہونے کو وہ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ سے کہتی تھیں۔ مولانا گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ حضرت حاجی صاحب سے کیوں بیعت نہیں ہوجاتیں؟ انہوں نے فرمایا کہ حاجی صاحب کے کمال میں شبہ نہیں، مگر میں ان سے بیعت نہیں ہوتی۔ میں تو آپ سے ہی بیعت ہونا چاہتی ہوں (پھر معلوم نہیں کہ حضرت مولانا گنگوہی نے ان کو بیعت کیا یا نہیں، مگر دیکھ لیجیے کہ ان کو حاجی صاحب سے بیعت ہونا منظور نہ تھا، بلکہ ان کے خُلفا سے بیعت کی درخواست کرتی تھیں۔)

اور حضرت حاجی صاحب کی دوسری بیوی تو سنا ہے کہ بہت ہی نیک تھیں۔ جن عورتوں نے ان کو دیکھا ہے وہ کہتی ہیں کہ حاجی صاحب میں اور ان میں صرف اتنا فرق تھا کہ حضرت مرد تھے اور وہ عورت تھیں اور کچھ فرق نہ تھا۔ سنا ہے کہ وہ مثنوی کو بھی خوب سمجھتی تھیں اور یہ دوسری بیوی حضرت حاجی صاحب کی منگیتر تھیں، پہلے ان سے حضرت کی منگنی ہوئی تھی، مگر حضرت کے انکار کی وجہ سے نکاح نہ ہوا تھا۔ کسی دوسرے سے نکاح ہوگیا تھا۔ پھر شوہرِ اول کے بعد حضرت حاجی صاحب نے ان سے دوسرا نکاح کرلیا تھا۔

اصلاح نسواں کی دوسری صورت:

تو اگر خاوند سے بھی فیض حاصل نہ کرسکیں اور اپنے محارم میں بھی کوئی کامل نہ ہو تو اب دوسری صورت یہ ہے کہ بزرگوں کی کتابوں اور ان کے ملفوظات و مواعظ کا مطالعہ کیا جائے۔ بزرگوں کی تصانیف اور ان کے ملفوظات سے بھی وہی اثر ہوتا ہے جو اُن کی صحبت میں ہوتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

چوں کہ گل رفت وگلستاں شد خراب
بوئے گل را از کہ جوئیم از گلاب

چوں کہ خورشید وما را کرد داغ
چارہ نبود در مقامش از چراغ

یعنی جب پھول کا موسم چلا جائے تو اب اس کی خوشبو گلاب سے حاصل کرنی چاہیے۔ گلاب میں بھی پھول کی خوشبو مل سکتی ہے، اسی طرح آفتاب بھی چھپ جائے تو اب چراغ سے روشنی حاصل کرنی چاہیے۔

یہ مشاہدہ ہے کہ اہل اللہ کے کلام میں نور ہوتا ہے اور ملحدوں کے کلام میں ظلمت ہوتی ہے۔ گو بزرگوں کی کتابوں کی عبارت سادہ ہوتی ہے۔ ان میں عبارت آرائی نہیں ہوتی، مگر ان کے مطالعہ سے نور قلب میں پیدا ہوتا ہے اور جو لوگ مُتّبع شریعت نہیں ہیں ان کی کتابوں کی عبارت گو کیسی ہی شستہ ہو، مگر باطن میں اس سے ظلمت پیدا ہوتی ہے، گو ان میں تمام باتیں دین ہی کی ہوں، مگر الفاظ چوں کہ ان کے اپنے ہیں اس لیے وہ ظلمت سے خالی نہیں ہوتے۔ جس کے دل میں کچھ بھی ادراک ہے وہ اس فرق کو ضرور محسوس کرے گا۔ اسی طرح اہل اللہ کی تقریر میں بھی ایک نور ہوتا ہے جو غیر اللہ کے کلام میں نہیں ہوتا۔

ایک بزرگ کے صاحب زادے تحصیلِ علم کے لیے کہیں باہر گئے تھے۔ جب وہ فارغ ہوکر واپس ہوئے اور پورے عالم ہو گئے تو اپنے والد صاحب کے پاس آئے، انہوں نے ان سے فرمایا کہ تم وعظ کہو۔ چناں چہ صاحب زادے نے وعظ کہا اور بڑے بڑے عالی مضامین بیان کیے، مگر کسی پر کچھ بھی اثر نہ ہوا۔

جب وہ وعظ کہہ چکے تو اُن کے والد صاحب ممبر پر تشریف لائے اور وعظ سے پہلے انہوں نے اپنا واقعہ اسی رات کا بیان فرمایا کہ رات ہم نے روزہ کی نیت کی تھی، سحری کے لیے کچھ دودھ رکھ دیا تھا۔ مگر بلی آئی اور سارا دودھ پی گئی۔ بس اتنا ہی بیان فرمایا تھا کہ ساری مجلس تڑپنے لگی۔ اس کے بعد اُن بزرگ نے اپنے صاحب زادے سے فرمایا کہ صاحب زادے! سننے والے پر قلب کا اثر پڑا کرتا ہے، الفاظ کا اثر نہیں ہوتا۔ تم نے اب تک علمِ الفاظ حاصل کیا ہے، اب قلب کے اندر بھی اس علم کو پہنچانا چاہیے۔ اہل اللہ کے کلام سے یہ ضرور نہیں کہ آنکھوں سے آنسو نکلنے لگیں، بلکہ اہلِ دل کے کلام سے سامعین کے دل آنسوؤں سے بھر جاتے ہیں۔

غرض تجربہ اور مشاہدہ سے یہ بات ثابت ہے کہ بزرگوں کی تصانیف سے بھی قریب

قریب وہی فائدہ ہوتا ہے جو اُن کے پاس رہنے سے ہوتا ہے، گو بالکل اس کے برابر نہ ہوگا مگر اس کے قریب ضرور ہوگا۔ تو اگر عورتوں کو بزرگوں کی صحبت میسّر نہ آسکے تو ان کے ملفوظات اور احوال موجود ہیں، ان کو دیکھتی رہا کریں اِن شاء اللہ تعالیٰ کمال ضرور حاصل ہوگا اور مردوں کو بھی بزرگوں کی تصانیف اور اُن کے ملفوظات واحوال کا مطالعہ کرتے رہنا چاہیے کیوں کہ ہر شخص کو اتنی مہلت نہیں ملتی جو اُن کے پاس جا کر رہے۔ عارف شیرازی رحمہ اللہ گویا اسی زمانہ کے واسطے یہ فرما گئے ہیں:

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است

صراحی مئے ناب وسفینۂ غزل است

اس زمانہ میں جو رفیق خلل سے خالی ہے وہ کتاب، ذکر وشغل، طاعت وعبادت اور بزرگوں کے ملفوظات ہیں۔

صراحی مئے ناب سے مراد ذکر وشغل اور طاعات وعبادات ہیں اور سفینۂ غزل سے مراد اہلِ عشق کے ملفوظات ہیں۔ اس میں حضرت حافظ رحمہ اللہ نے کتاب کو رفیق بتلایا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو فائدہ رفیق سے ہوتا ہے وہ اس سے بھی ہوتا ہے۔ اور شیخ بھی رفیقِ طریق ہوتا ہے، تو جس کو شیخ میسّر نہ ہو وہ کتابوں کو رفیق بنائے۔

پس الحمد للہ کہ اس سوال کا جواب ہر پہلو سے مکمّل ہوگیا کہ عورتوں کے لیے معیتِ صادقین کی کیا صورت ہوگی؟ حاصل جواب کا یہ ہوا کہ جن کے محارم میں کوئی کامل نہ ہو وہ اس کی تلاش کریں کہ کوئی عورت کامل فی الحال ملے تو اس کی صحبت سے فائدہ اٹھائیں، اور جس کو دونوں باتیں میسّر نہ ہوں تو وہ بزرگوں کے کلام اور ملفوظات اور قصص واحوال کا مطالعہ کریں۔ پس اب عورتوں کے لیے بھی اس آیت کا بیان مکمّل ہوگیا اور میں نے ان کو بھی کمالِ دین حاصل کرنے کا آسان طریق بتلا دیا۔ اب آگے اُن کی ہمت ہے کہ عمل کریں یا نہ کریں۔

ایک علمی اشکال اور اس کا جواب:

پس مضمون تو ختم ہوگیا اب اُس کا ایک ذُنابہ رہ گیا، اس کو بیان کرکے میں اپنی تقریر ختم کردوں گا۔ وہ ذُنابہ ایک طالبِ علمانہ اشکال وجواب ہے جس کو طلبا واہلِ علم خوب سمجھ لیں

گے۔ اشکال یہ ہے کہ قرآن سے تو معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں کامل ہوسکتی ہیں چناں چہ ﴿الصَّادِقِیْنَ وَالصَّادِقَاتِ﴾ اس پر دلالت کررہا ہے۔ اور ایک حدیث میں بھی ہے: کَمُلَ مِنَ الرِّجَالِ کَثِیْرٌ وَّلَمْ یَکْمُلْ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَرْیَمُ بِنْتُ عِمْرَانَ وآسِیَةُ امْرَأَةُ فِرْعَوْنَ، وَفَضْلُ عَائِشَةَ عَلَی النِّسَاءِ کَفَضْلِ الثَّرِیْدِ عَلَی سَائِرِ الطَّعَامِ. جس کا حاصل یہ ہے کہ مردوں میں تو بہت لوگ کامل ہوئے لیکن عورتوں میں بجز مریم رضی اللہ عنہا اور آسیہ فرعون کی بیوی کے اور کوئی کامل نہیں ہوئی، اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت تمام عورتوں پر ایسی ہے جیسے ثرید کی فضیلت ہے تمام کھانوں پر۔ اس سے علما نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا کمال بھی سمجھا ہے کہ وہ بھی کامل ہیں۔

بہر حال اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عورتیں کامل ہو بھی سکتی ہیں اور اس کا وقوع بھی ہوا ہے گو ان میں کامل افراد بہ نسبت مردوں کے کم ہیں۔ مگر ایک حدیث سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ عورتیں کامل ہو ہی نہیں سکتیں۔ وہ حدیث یہ ہے کہ آپ نے ایک بار عورتوں کو خطاب کر کے فرمایا:

مَارَأَیْتُ مِنْ نَاقِصَاتِ عَقْلٍ وَدِیْنٍ أَذْهَبَ لِلُبِّ الرَّجُلِ الْحَازِمِ مِنْ إِحْدَاکُنَّ.

میں نے عورتوں سے بڑھ کوئی کو ناقص العقل اور ناقص الدین ایسا نہیں دیکھا جو ہوشیار مرد کی عقل کو جلدی زائل کر دیتا ہو۔

اس پر عورتوں نے سوال کیا: یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وسلم) ہماری عقل اور دین میں کیا نقصان ہے؟ آپ نے فرمایا: کیا عورتوں کی گواہی مردوں کی آدھی گواہی کے برابر نہیں ہے؟ انہوں نے کہا: بے شک۔ آپ نے فرمایا کہ یہ تو ان کی عقل کا نقصان ہے کہ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر شمار کی گئی ہے۔ اور کیا جب تم کو حیض آتا ہے تو تم نماز، روزہ چھوڑ کر نہیں بیٹھ جاتیں؟ انہوں نے کہا: بے شک۔ فرمایا کہ یہ تمہارے دین کا نقصان ہے۔

اس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے ناقص ہونے کا جو سبب بیان فرمایا ہے وہ ایسا سبب ہے جس سے کوئی عورت بھی خالی نہیں۔ لہٰذا لازم آتا ہے کہ عورتوں میں کوئی بھی کامل

نہ ہوسکے، حالاں کہ قرآن اور دیگر احادیث سے ان میں بھی کاملات کا وجود معلوم ہوتا ہے۔ یہ اشکال عرصہ سے میرے ذہن میں تھا، مگر اس کا کوئی شافی جواب اب تک ذہن میں نہ آیا تھا اس لیے اس اشکال کو اب تک میں نے کہیں بیان نہ کیا کہ خواہ مخواہ دوسروں کو بھی کیوں پریشانی میں ڈالوں۔ الحمدللہ! اس وقت جواب ذہن میں آگیا، اس لیے میں نے اشکال کو بھی بیان کردیا او جواب بھی عرض کرتا ہوں۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ کمال کی دو قسمیں ہیں: ایک کمالِ اختیاری، ایک کمالِ غیراختیاری۔ اسی طرح نقصان کی بھی دو قسمیں ہیں: ایک اختیاری، ایک غیر اختیاری۔ اور انسان مکلّف ہے تحصیلِ کمالِ اختیاری کا جو کہ امر مُکتسب ہے، اور انسان مکلّف ہے ازالہَ نقصان اختیاری کا جو اس کی قدرت میں داخل ہے۔ اور کمالِ غیر اختیاری کی تحصیل اور نقصانِ غیر اختیاری سے اجتناب کا انسان مکلّف نہیں۔ لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا. اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے)۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ کمال غیر اختیاری کے حاصل نہ ہونے سے عورتوں کو گناہ نہ ہوگا، لیکن گناہ نہ ہونے سے اس کا مُوجِبِ نقصان نہ ہونا لازم نہیں۔ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کے نہ ہونے سے گناہ نہیں ہوتا، لیکن نقصان ضرور ہے (مثلاً ایک آدمی میں طبعا بزدلی اور خوف بہت زیادہ ہے جس کی وجہ سے وہ جہاد نہیں کرسکتا، اس صورت میں اس کو گناہ تو نہیں ہوگا، لیکن یہ نقصان ضرور ہے اور مجاہدین کے برابر وہ شخص نہیں ہوسکتا)۔

پس قرآن میں جو عورتوں کو کامل کہا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ کمالِ مُکتسب کا درجہ ان کو حاصل ہوسکتا ہے۔ اور حدیث میں جو ان کو ناقصات الدین کہا گیا ہے اس میں نقصانِ غیر اختیاری کو بیان کیا گیا ہے۔ اور کمالِ مُکتسب ونقصانِ غیر اختیاری کے جمع ہونے میں کوئی اشکال نہیں۔ اب یہ سوال رہا کہ دوسری حدیث میں جو منع فرمایا گیا ہے کہ مردوں میں تو بہت لوگ کامل ہوئے اور عورتوں میں بجز مریم علیہا السلام وحضرت آسیہ رضی اللہ عنہا کے اور کوئی کامل نہیں ہوا۔ اس سے متبادر یہ ہوتا ہے کہ ان دونوں میں کمال کا وہی درجہ تھا جو مردوں میں تھا (کیوں کہ جس کمال کو مردوں کے لیے ثابت کرکے عورتوں سے اس کی نفی کی گئی ہے،

حدیث میں صیغۂ استثنا کے ساتھ اسی کمال کو ان دونوں کے لیے ثابت کیا گیا ہے۔ اگر یہ مطلب نہ ہو تو ان کے استثنا کرنے کے کچھ معنی نہ ہوں گے)، اور جب یہ مطلب ہوا کہ ان دونوں کو کامل مردوں کے برابر کمال حاصل تھا تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان میں نقصانِ عقل ونقصانِ دین کا وہ سببِ غیر اختیاری موجود نہ تھا جو دوسری عورتوں میں موجود ہے؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ ممکن ہے کہ ان میں وہ نقصانِ غیر اختیاری موجود نہ ہو اور خدا تعالیٰ کی قدرت سے یہ کچھ بعید نہیں۔ دوسرے ممکن ہے کہ ان میں بھی نقصانِ غیر اختیاری موجود ہو، لیکن ان میں کوئی کمال ایسا ہو جس سے اس نقصانِ غیر اختیاری کی تلافی ہوگئی ہو۔

اب میں اس مضمون کی زیادہ تفصیل نہیں کرتا۔ بعض لوگ سمجھ گئے ہیں، بس اتنا ہی کافی ہے، جن کی سمجھ میں نہ آیا ہو وہ ان سے سمجھ لیں۔ حضرت حاجی صاحب بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے کہ کسی دقیق مضمون کی تقریر ایک بار فرما دیا کرتے، اس کے بعد اگر کوئی اس کے متعلق سوال کرتا تو آپ فرما دیتے کہ فلاں شخص اس کو خوب سمجھ گیا ہے اس سے سمجھ لو۔

البتہ یہاں ایک سوال اور رہ گیا، میں اس کو بھی حل کر دینا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ اس تقریر سے تو یہ معلوم ہوا کہ نقصانِ غیر اختیاری بھی موجِبِ نقص ہے، حالانکہ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نقصانِ غیر اختیاری مُوجِبِ نقص نہیں۔ چناں چہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ جب کسی شخص کا کوئی ورد ہو اور وہ سفر کرے یا بیمار ہو جائے اور سفر یا بیماری کی وجہ سے ورد میں ناغہ ہو جائے تو حق تعالیٰ ملائکہ سے فرماتے ہیں کہ اس کا ثواب پورا ہی لکھو۔ یعنی سفر اور بیماری میں گو وِرد میں ناغہ ہو جاتا ہے مگر ثواب ان دنوں کے برابر ہی ملتا ہے جن میں ورد کا ناغہ نہیں ہوتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ غیر اختیاری عذر کی وجہ سے اگر اعمال میں کمی آوے تو ثواب کم نہیں ہوتا۔ پھر اس کی کیا وجہ کہ حیض وغیرہ میں عورتوں کی نماز ناغہ ہوتی ہے تو اس کو نقصان کا سبب شمار کیا گیا، وہ بھی تو اعذارِ غیر اختیاری ہیں؟ بلکہ بظاہر ان کا غیر اختیاری ہونا سفر سے زیادہ ہے، کیوں کہ سفر من وجہٍ اختیاری ہے اور من وجہٍ غیر اختیاری، یعنی سفر شروع کرنے کے بعد تو اوقات پر قبضہ نہیں رہتا اور مجبوراً اوراد ناغہ ہو جاتے ہیں، لیکن سفر کا شروع کرنا تو اختیاری امر ہے۔ اگر ہم سفر ہی نہ کرتے تو اس کی نوبت نہ آتی۔ پس سفر انتہاء غیر اختیاری ہے اور ابتداء

اختیاری ہے۔

یہ سوال میرے ذہن میں ابھی آیا ہے اور جواب بھی اسی وقت ذہن میں آ گیا ہے۔ وہ یہ کہ عذر کی دو قسمیں ہیں: ایک عذرِ اتفاقی، دوسرے عذرِ مُستمِر۔ قانونِ شریعت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عذر اتفاقی وعذرِ مُستمِر میں فرق ہے۔ عذرِ اتفاقی سے ثواب کم نہیں ہوتا، اور عذرِ مُستمِر موجِبِ نقصانِ اجر ہوتا ہے۔ چناں چہ موت سے بڑھ کر عذرِ غیر اختیاری کون سا ہوگا لیکن نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ موت سے اجر وثواب منقطع ہوجاتا ہے۔ چناں چہ ایک حدیث میں ہے کہ دو شخص ایک ساتھ اسلام لائے تھے اور دونوں کے اعمال بھی برابر تھے۔ ان میں سے ایک صاحب تو کسی غزوہ میں شہید ہوگئے اور دوسرے ان کے بعد ایک ہفتہ کے فاصلہ سے انتقال کر گئے۔ صحابہ کو یہ خیال ہوا کہ پہلا شخص شہید ہو کر مرا ہے اور یہ بستر پر مرا ہے، اس لیے شاید اس کا درجہ اس سے کم رہے تو انہوں نے دوسرے کے حق میں یہ دعا کی: اَللّٰهُمَّ أَلْحِقْهُ صَاحِبَهُ کہ اے اللہ! اس کو بھی اس کے ساتھی کے درجہ میں پہنچا دیجیے، تو حضور ﷺ نے فرمایا: وَأَيْنَ صَلَاتُهُ وَصِيَامُهُ وَقِيَامُهُ بَعْدَهُ، أَوْ كَمَا قَالَ کہ اس نے جو اس کے بعد ہفتہ بھر نمازیں پڑھی ہیں اور روزے رکھے ہیں اور تہجّد کی نماز پڑھی ہے، یہ اعمال کہاں چلے گئے؟ یعنی تم نے اس کے لیے پہلے شخص کے برابر ہونے کی کیوں دعا کی۔ اس نے جو اس کے بعد اعمال کیے ہیں ان کا ثواب بھی تو اس کے نامۂ اعمال میں لکھا گیا ہے تو یہ اس سے بڑھا ہوا ہے۔ چناں چہ آپ نے اس شخص کے بارے میں تصریحاً فرمایا کہ واللہ! دونوں کے درجہ میں ایسا تفاوت ہے جیسا آسمان وزمین کے درمیان میں۔

رہی یہ بات کہ پہلا شہید تھا اور یہ شہید نہیں ہوا، تو اس سے اس کا درجہ کم ہونا لازم نہیں آتا۔ کیوں کہ شہادت کے لیے یہ بھی تیار تھا۔ جہاد میں دونوں شریک ہوئے تھے، اب یہ اور بات ہے کہ اس کا وقت آگیا تھا وہ شہید ہوگیا، اس کا وقت نہ آیا تھا یہ قتل نہ ہوا، مگر نیت دونوں کی برابر تھی، اس لیے شہادت کا اجر اس کے لیے بھی ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ موت سے اجر منقطع ہوجاتا ہے۔ اور ایک حدیث میں اس سے بھی زیادہ تصریح ہے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں:

یَنْقَطِعُ أَجْرُ الْمُؤْمِنِ بِمَوْتِہٖ إِلَّا مِنْ ثَلَاثٍ.

مومن کا اجر موت سے منقطع ہو جاتا ہے بجز تین (چیزوں) کے۔

پس مرض اور سفر اتفاقی عذر ہیں ان سے اجر کم نہیں ہوتا، اور حیض ونفاس وغیرہ عذرِ مستمر ہیں اور عذرِ مستمر سے اجر کم ہو جاتا ہے۔ اور راز اس میں یہ ہے کہ عذرِ اتفاقی ابتدائے عمل کے وقت ذہن میں نہیں ہوتا۔ جب آدمی کوئی عمل بہ نیت مداومت شروع کرتا ہے تو اس کے ذہن میں یہ بات ہرگز نہیں ہوتی کہ اگر میں سفر میں جاؤں گا یا بیمار ہو جاؤں گا تو یہ عمل نہ کروں گا، کیوں کہ سفر اور مرض عارضی امور ہیں۔ اصل حالت یہی ہے کہ انسان تندرست رہے اور اپنے گھر میں رہے، اس لیے نیت دوام کی باقی رہتی ہے۔ پھر جب اتفاقاً عذر پیش آتا ہے تو اس کو ثواب پورا ملتا ہے۔ دوسرے یہ کہ سفر اور مرض کا کوئی خاص وقت نہیں ہوتا۔ ممکن ہے کہ آدمی برسوں بھی سفر نہ کرے، نہ بیمار ہو۔ اس لیے ایامِ سفر ومرض کو عمل سے مستثنیٰ کرنے کی طرف التفات نہیں ہو سکتا۔

پس وہ دن بھی اس کے ذہن میں عمل ہی کے لیے مقرر تھے مگر اتفاق سے ناغہ ہو گیا، بخلاف حیض ونفاس وغیرہ کے، کہ یہ اعذارِ مستمرہ ہیں۔ نیز اکثر ان کے اوقات بھی معیّن ہوتے ہیں۔ پس عورتیں جب نماز پڑھنا شروع کریں گی ان کے ذہن میں یہ بات ہوتی ہے کہ حیض ونفاس کے وقت نماز کو چھوڑ دیں گے، تو ان کی نیت دوام کی نہیں ہوتی۔ یہ نیت کسی عورت کی نہیں ہوتی کہ میں ان دنوں میں بھی نماز پڑھوں گی۔

ایسے ہی موت کا آنا یقینی ہے گو وقت معلوم نہیں، مگر ہر شخص جس کام کو شروع کرتا ہے اس کی نیت یہی ہوتی ہے کہ جب تک زندہ ہوں یہ کام کرتا رہوں گا۔ یہ نیت کوئی نہیں کرتا کہ موت کے بعد بھی عمل کرتا رہوں گا۔ اور اگر کوئی ایسی نیت کرے تو وہ معتبر نہیں، کیوں کہ وہ محض الفاظ ہی الفاظ ہیں، نیت اور عزم کا درجہ اس میں کبھی نہیں ہو سکتا۔ اور اس نیت کی ایسی مثال ہوگی جیسے امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے اپنے ایک شاگرد سے فرمایا تھا کہ مجلسِ اِملا میں سب لوگ سوال کرتے ہیں، تم کچھ سوال نہیں کرتے؟ اس نے کہا: اِن شاء اللہ تعالیٰ اب سے سوال کیا کروں گا۔ چناں چہ ایک دن حضرت امام رحمہ اللہ نے یہ مسئلہ بیان فرمایا کہ روزہ غروب کے

ساتھ فوراً افطار کرنا چاہیے، تو وہ طالب علم صاحب پوچھتے ہیں کہ حضرت! اگر کسی دن غروب ہی نہ ہو تو؟ امام ابو یوسف نے فرمایا کہ بس آپ خاموش ہی رہیں، آپ کو بولنے کی ضرورت نہیں۔

جیسے کسی کے یہاں بہو آئی تھی، وہ بولتی نہ تھی، ساس کو بہت رنج تھا کہ ہائے بہو گونگی آئی، بولتی ہی نہیں۔

جب ساس نے اس کو بہت سمجھایا بجھایا کہ لڑکیاں تو بولتی ہوئی اچھی لگا کرتی ہیں، تو بولتی کیوں نہیں؟ تو ایک دن آپ یہ بولیں کہ ساس سے کہنے لگیں کہ میں تم سے یوں پوچھوں ہوں کہ اگر تمہارا بیٹا مرگیا تو تم میرا دوسرا نکاح بھی کر دو گی یا یوں ہی ساری عمر بٹھائے رکھو گی؟ ساس نے کہا کہ بس بی بی، تو چپ ہی رہا کر، مہینوں میں بولی تھی، تو یہ پھول جھڑے، آگے کو نہ معلوم کیا ستم ڈھائے گی؟ ایسے ہی وہ طالب علم صاحب تھے کہ یا تو سوال ہی نہ کرتے تھے اور سوال کیا تو یہ کہ حضرت بھلا اگر آفتاب غروب ہی نہ ہو؟ جیسے یہ قضیہ شرطیہ مہمل ہے جس میں مقدم کا وجود ہی نہیں ہو سکتا جب تک کہ عالم کا بقا ہے، اسی طرح اگر کوئی مرد یہ نیت کرے کہ اگر میں نہ مرا تو ساری عمر نماز پڑھتا رہوں گا۔ یہ قضیہ بھی مہمل ہے جس کا شریعت میں اعتبار نہیں۔ شرط وہی معتبر ہو سکتی ہے جس کا وقوع بھی عادۃً ہوتا ہو۔

پس یہ عذر نیتِ دوام کو مانع ہے اور سفر و مرض نیتِ دوام کو مانع نہیں، اس لیے جب وہاں دوام کی نیت ہو سکتی ہے تو ثواب بھی مرض و سفر میں اس نیت کی وجہ سے ملے گا اور عذرِ نسوانی اور موت قاطعِ نیتِ دوام ہیں، اس لیے وہاں ان اعذار کے وجود سے ثواب منقطع ہو جائے گا۔ یہ وجہ ہے حیض و نفاس کے سبب نقصان ہونے کی اور سفر و مرض کے سبب نقصان نہ ہونے کی۔ خوب سمجھ لو۔

خلاصۂ کلام

بحمد اللہ اب یہ مبحث مکمّل ہو گیا اور تمام شبہات زائل ہو گئے۔ اور دلائل سے معلوم ہو گیا کہ عورتیں بھی کامل ہو سکتی ہیں، یعنی کمالِ مُکتسَب ان کو حاصل ہو سکتا ہے، گو اس کے ساتھ ایک نقصانِ غیر اختیاری بھی رہے اور ان کے لیے کمال کا طریقہ یہ ہے کہ اول تو وہ کتابیں دیکھیں

جن میں مسائل واحکام شرعیہ کا ذکر ہے، ان کو دیکھ کر ہر عمل کے کامل کرنے کا طریقہ معلوم کریں اور جن اعمال میں کوتاہی ہورہی ہے اس کی اصلاح کریں۔

یہ تو اصل طریق ہے اور اس میں آسانی پیدا کرنے کے لیے یہ طریق ہے کہ اگر کوئی کامل مرد اپنے محارم میں مل جائے تو اس کی صحبت سے فائدہ اٹھائیں، اس سے اپنے اخلاق وعادات کی اصلاح کا طریقہ پوچھ کر دل کی اصلاح کریں۔ اور اگر کوئی مرد ایسا نہ ملے تو کسی کاملہ کی صحبت میں رہیں۔ اگر کوئی کاملہ بھی نہ ملے تو اپنے گھر کے مردوں کی اطلاع اور اجازت سے کسی دوسرے بزرگ سے بذریعہ خط وکتابت کے اپنی اصلاح کا تعلّق رکھیں اور اس کو اپنے حالات سے اطلاع دیتی رہیں۔ جو کچھ وہ لکھے اس پر عمل کریں اور اپنے گھر ہی میں رہیں اور اس کے پاس جانے کی زحمت نہ اٹھائیں۔ ہاں اپنے گھر پر بزرگوں کے قصّے، ان کے حالات اور ملفوظات اور ان کی تصانیف کا مطالعہ جاری رکھیں۔ اس سے بھی وہی نفع ہوگا جو پاس رہنے سے ہوا کرتا ہے اور اگر مردوں میں سے بھی کسی کو بزرگوں کے پاس جانے کی فرصت نہ ہو وہ بھی اسی طریقہ پر عمل کریں جو میں نے عورتوں کو بتلایا ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ اس طرح ان کا بھی دین کامل ہوجائے گا۔

پس اصل طریقہ کمال فی الدین کا تحصیلِ تقوی ہے اور اس کی تیسیر وتسہیل کا طریقہ معیّت کاملین ہے۔ یہ خلاصہ ہے تمام بیان کا، اب میں ختم کرتا ہوں کیوں کہ عصر کی نماز قریب ہے۔ گو بعض مضامین اب بھی ذہن میں باقی ہیں، مگر اول تو وقت نہیں، دوسرے ضروری باتیں بیان ہی ہوچکی ہیں اس لیے ان مضامین کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں، پھر کسی موقع پر دیکھا جائے گا۔ اب دعا کیجیے کہ حق تعالیٰ ہم کو فہمِ سلیم اور عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین.

وصلی اللہ تعالیٰ علی سیدنا ومولانا محمد

وعلیٰ آلہ وأصحابہ أجمعین.

قال النبي ﷺ: كُلُّكُمْ رَاعٍ وكُلُّكُم مَسْؤُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ. (الحديث)

وعظ

مُلقب بہ

حقوق البیت

(یعنی حقوقِ خانہ داری)

مستورات کی اصلاح وتعلیم کی ضرورت، مردوں عورتوں کے باہمی حقوق،
نیز امورِ خانہ داری کی اصلاح سے متعلق خواتین سے
ایک اہم خطاب

منجملہ ارشاداتِ
حکیم الامت مجدّد الملت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

تمہید

حضرت حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کی یہ ایک نہایت مفید اصلاحی تقریر ہے، جو بماہ محرم الحرام ۱۳۳۱ھ بمقام غازی پور تقریباً دو گھنٹہ ہوئی۔ اس میں حضرت رحمہ اللہ نے مستورات کی اصلاح و تعلیم کی ضرورت اور اس کا طریقہ، مردوں اور عورتوں کے باہمی حقوق، نیز امورِ خانہ داری کی اصلاح و طرزِ معاشرت کا بیان فرمایا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ اگر اس کو غور و توجہ سے پڑھ کر اس میں بتائے ہوئے طریقوں پر عمل کیا جائے تو یقیناً گھریلو زندگی کی اکثر و بیشتر پریشانیاں اور کلفتیں رفع ہو کر راحت و سکون والی زندگی میسّر آ سکتی ہے اور صرف دنیا ہی نہیں، بلکہ اس کی برکت سے آخرت میں بھی حیاتِ طیّبہ حاصل ہو سکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ حق پر استقامت اور توفیقِ خیر عطا فرمائے۔ آمین

واللہ الموفق والمعین

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰہ نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه. ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيآت أعمالنا. من يهده الله فلا مضل له، ومن يضلله فلا هادي له. ونشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له، ونشهد أن سيدنا ومولانا محمدا عبده ورسوله. صلى الله تعالىٰ عليه وعلى اٰله وأصحابه وبارك وسلم.

أما بعد، فقد قال النبي ﷺ: كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُم مَسْؤُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، الحديث.

یہ ایک حدیث ہے یعنی ارشاد ہے حضور ﷺ کا۔ اس میں ایک ضروری مضمون ہے جو اس وقت کی ضرورت و مصلحت کے مناسب ہے۔ یعنی اس وقت زیادہ ضرورت مستورات کو سنانے کی ہے، اس لیے میں نے ایک ایسا مضمون اختیار کیا ہے جس میں اُن کے متعلق بعض ذمہ داریوں کا ذکر ہے یعنی حقوق خانہ داری کا۔ کیوں کہ مرد کا گھر عموماً اُن کے سپرد ہوتا ہے اس لیے ضرورت ہے کہ اُس کے متعلق ان کو احکام شرعی معلوم ہوں۔

ہر چند کہ اس میں بعض مضامین مردوں کے متعلق بھی بیان ہوں گے، مگر زیادہ مقصود اس وقت عورتوں کو سنانا ہے کیوں کہ اُن کو خود بھی علم کم ہوتا ہے اور علمی مجلس بھی میسّر نہیں ہوتی، مواعظ کے سننے کا بھی ان کو اتفاق کم ہوتا ہے۔ اور مرد تو اکثر اپنے متعلق احکام سنتے رہتے ہیں اور جس بات کو چاہیں اہلِ علم سے دریافت بھی کر سکتے ہیں۔

تلاوتِ حدیث:

اس وقت جو حدیث میں نے تلاوت کی ہے، یہ ایک طویل حدیث ہے جس کا ایک ٹکڑا میں نے اس وقت پڑھا ہے۔ تمام حدیث کو احتیاط کی وجہ سے نقل نہیں کیا، کیوں کہ پورے الفاظ یاد نہ تھے۔ اسی لیے میں نے الحدیث کہہ دیا تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ پوری حدیث نہیں بلکہ اس کے اور بھی اجزا ہیں جو یاد نہیں رہے، مگر مضامین قریب قریب سب محفوظ ہیں۔

بعض یقیناً، بعض ظنًّا۔

دراصل وہ سب مضامین اسی جملہ کی تفاصیل ہیں جو میں نے اس وقت پڑھا ہے، کیوں کہ اس حدیث میں حضور ﷺ نے اول ایک قاعدہ کلیہ اجمالاً بیان فرمایا ہے، پھر اس کے چند جزئیات بطور تفصیل کے بیان فرمائے ہیں۔ اس وقت میں نے اجمالی مضمون کے الفاظ تو نقل کردیے، تفصیلی مضمون کے الفاظ نہیں پڑھے کیوں کہ وہ بلفظہا یاد نہ تھے اور ضرورت بھی نہ تھی، کیوں کہ اس اجمال میں وہ سب تفصیل مندرج ہے۔

اجمال و تفصیل:

بہر حال وہ اجمالی مضمون جو بطور قاعدہ کلیہ کے ارشاد ہوا ہے: كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْؤُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ کہ ہر ایک تم میں سے بااختیار ہے (اور ہر ایک کسی چیز کا نگہبان اور ذمہ دار ہے) اور ہر ایک سے پوچھا جائے گا کہ تمہارے سپرد جو چیزیں تھیں اُن میں تم نے کیا کیا؟ یہ ہے اجمالی مضمون کا حاصل۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے اس کی کچھ تفصیل بیان فرمائی ہے جس کے دو جزو تو یقیناً یاد ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے: وَالْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ عَلٰى بَيْتِ زَوْجِهَا وَوَلَدِهٖ، وَهِيَ مَسْؤُوْلَةٌ عَنْهُ کہ عورت کے متعلق شوہر کا گھر ہوتا ہے اور اس کے بال بچے، ان میں اس کو اختیار دیا گیا ہے اور ان کے متعلق اس سے دریافت کیا جاوے گا کہ تم نے شوہر کے گھر اور اولاد کے ساتھ کیا برتاؤ کیا۔ اس کے بعد ایک جزو یہ ہے: وَعَبْدُ الرَّجُلِ رَاعٍ عَلٰى مَالِ سَيِّدِهٖ، وَهُوَ مَسْؤُوْلٌ عَنْهُ، یعنی غلام خادم اپنے آقا کے مال کا نگہبان اور ذمہ دار ہے، وہ بھی مفوّض الیہ ہے، اس لیے اس سے بھی پوچھا جائے گا کہ تُو نے اپنے آقا کے مال میں کس طرح تصرّف کیا۔

یہ دو جزو تو یقیناً ہیں۔ تیسرا جزو[1] شاید یہی ہے کہ ہر شخص اپنے گھر میں بااختیار ہے اور

---

[1] قلت: ونص الحديث هذا: "فالإمام الذي على الناس راع، وهو مسؤول عن رعيته"، وذكر بعده المرأة والعبد، ثم قال: "ألا كلكم راع وكلكم مسؤول عن رعيته". متفق عليه، كذا في "المشكاة": (ص: ۲۷۰). وفي "الترغيب" عن أنس بن مالك رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: "إن الله سائل كل راع عما استرعاه حفظ أم ضيّع". رواه ابن حبان في صحيحه (ص: ۳۰۱).

اس کے گھر والوں کے متعلق سوال ہوگا کہ تُو نے ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا اور ان کے حقوق ادا کیے یا نہیں۔

حدیثِ نبوی ﷺ کی قرآن کریم سے تائید:

اور تیسرا جزو (اَلرَّجُلُ رَاعٍ إلخ) قرآن مجید میں بھی ہے۔حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا﴾ (التحریم:٦)

اس میں ایمان والوں کو صاف حکم ہے کہ جہنّم کی آگ سے اپنے آپ کو بھی بچاؤ اور اپنے گھر والوں کو بھی، تو اس کا وہی مطلب ہوگیا جو اَلرَّجُلُ رَاعٍ عَلَی أَھْلِ بَیْتِہٖ کا تھا کہ مرد اپنے گھر والوں کی اصلاح کا ذمہ دار ہے۔

عورتوں کو بھی یہ حکم شامل ہے:

بلکہ قرآن میں جن لفظوں سے اس مضمون کو بیان فرمایا ہے اس میں رجال کی بھی تخصیص نہیں، بلکہ ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ میں تغلیبا عورتیں بھی داخل ہیں، جیسا کہ قرآن میں تمام جگہ یہی طرز ہے کہ عورتوں کو مستقلاً خطاب نہیں کیا جاتا، بلکہ مردوں کے ساتھ تبعاً ان کو بھی خطاب ہوتا ہے۔تو یہاں بھی اس قاعدہ کے موافق یہ خطاب مردوں اور عورتوں سب کو شامل ہے۔تو عورتوں کے لیے بھی یہ بات ضروری ہوئی کہ وہ اپنے خاوند اور اولاد کو جہنّم کی آگ سے بچاویں اور ان کو خلافِ شرع اُمور سے روکنے میں کوشش کریں۔قرآن میں تو یہ مضمون عورتوں کے متعلق اجمالاً ہے اور حدیث میں اجمالاً بھی ہے اور تفصیلاً بھی۔

مردوں اور عورتوں کے متعلق کچھ حقوق:

بہرحال خواہ اجمالاً ہو خواہ تفصیلاً قرآن وحدیث دونوں بتلا رہے ہیں کہ مردوں اور عورتوں کے متعلق کچھ حقوق ہیں جن کے متعلق ان سے باز پُرس ہوگی۔اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ہم اپنی حالت میں غور کریں کہ ہم لوگ ان احکام کے ساتھ کیا برتاؤ کررہے ہیں؟ آیا ان کا امتثال کرتے ہیں یا نہیں؟ تو غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ تو مرد اُن حقوق کو ادا کرتے ہیں جو اُن کے ذمہ ہیں اور نہ عورتیں۔اور اسی وجہ سے میں نے اس مضمون کو اختیار کیا

ہے کہ عورتیں بالخصوص اور مرد بھی متنبہ ہوں کہ ان کے ذمہ کیا کیا حقوق ہیں، اور ان کے ادا کرنے کی طرف متوجہ ہوں۔

حقوق کا علم:

اب یہ سمجھیے کہ وہ حقوق کیا ہیں؟ کیوں کہ اپنی کوتاہی کا علم بھی اسی سے ہوگا۔ اور اب تک کوتاہی کا علم نہ ہونا بھی اسی وجہ سے ہے کہ ہم ان حقوق سے واقف نہیں۔ مردوں نے تو اپنے ذمہ عورتوں کے یہ حقوق سمجھ رکھے ہیں کہ کھانے کو دے دیا، کپڑا دے دیا، زیور دے دیا، گھر دے دیا اور کبھی بیمار ہوئیں تو علاج کر دیا، کبھی کوئی فرمائش کی تو اُس کو پورا کر دیا۔

اور عورتیں اپنے ذمہ مردوں کے یہ حقوق سمجھتی ہیں کہ کھانا پکا کے دے دیا، رات کو بستر کر دیا اور دھوبن کو مردوں کے کپڑے شمار کر کے دے دیے اور جب لائی تو شمار کر کے لے لیے اور حفاظت سے بکس میں بند کر کے رکھ دیے۔

بدنظمی کی ایک مثال:

اور شمار کر کے لینا دینا بھی بعض گھروں میں ہے، ورنہ اکثر تو یہ کہتی ہیں کہ ہماری دھوبن بڑی ایمان دار ہے، یہ خود گِن کر لے جاتی ہے اور پورے کپڑے دے جاتی ہے۔ پھر دیتے ہوئے کپڑوں کی شمار ہوتی ہے نہ لیتے ہوئے۔ دھوبن کی ایمان داری پر اعتماد ہے اور وہی مختارِ کُل ہے جو چاہے کرے۔ اسی طرح پسنہاری کو بھی خود وزن کر کے غلّہ نہیں دیا جاتا، اسی سے کہہ دیتی ہیں کہ اپنے آپ وزن کر کے اتنی دھڑی لے جائے، چاہے وہ چار دھڑی کی جگہ پانچ لے جائے اور اُن سے چار ظاہر کرے۔ پھر جب وہ آٹا پیس کر لاتی ہے اُس وقت بھی وزن نہیں کیا جاتا، وہی پسنہاری خود تول کر برتنوں میں بھر دیتی ہے اور آیندہ کے لیے دوبارہ اناج لے جاتی ہے۔ گھر والوں کو یہ یاد نہیں رہتا کہ پہلی پسائی کتنی تھی اور اگلی کتنی؟ پس مہینہ ختم ہونے پر جتنی رقم پسنہاری نے بتلادی وہی اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔

بدنظمی کی خرابی:

میں نے ایک گھر میں دیکھا ہے کہ ایک پسنہاری کی بہت سی پسائیاں چڑھی ہوئی تھیں

اور گھر میں نہ کوئی حساب تھا، نہ کوئی ضابطہ تھا۔ بعض دفعہ گھر والوں اور پسنہاری میں اختلاف ہوتا، وہ کچھ کہتی، پسنہاری کچھ کہتی، مگر حجّت کسی کے پاس نہ تھی۔ بالآخر جھک مار کر وہی دینا پڑتا تھا جو پسنہاری نے بتلا دیا۔ اور جن گھروں میں حساب کا خیال بھی ہوتا ہے تو وہاں یہ طریقہ ہے کہ دیوار پر کوئلہ سے لکیر کھینچ دی۔ میں نے دیکھا کہ ایک مکان میں تمام دیوار سیاہ تھی۔ حالانکہ دیوار کی لکیر کوئی معتبر چیز نہیں، ذرا سا ہاتھ لگنے سے مِٹ سکتی ہے اور پسنہاری ایک آدھ لکیر بڑھا بھی سکتی ہے۔ پھر اس صورت میں وہی دینا پڑے گا جو پسنہاری بتلا دے (اس سے تو آسان صورت یہ ہے کہ قلم اور دوات سے کسی تختی یا کاغذ ہی پر جو اپنے قبضہ میں رہے لکیر کھینچ دیا کریں تاکہ کمی بیشی کے احتمال سے تو محفوظ رہے، مگر گھروں میں اس کا مطلق اہتمام نہیں ہے)۔

عورتوں کی کوتاہی:

وجہ یہ کہ عورتیں ان کاموں کو اپنے ذمہ سمجھتی ہی نہیں ہیں، بلکہ وہ اپنے ذمہ صرف اتنا سمجھتی ہیں کہ مردوں کو کھلا دیا پلا دیا، اور اگر کوئی بچہ ہوا تو اس کو ہگا موتا دیا۔ اور یہ بھی اُس وقت کہ گھر میں بچے کے لینے کو کوئی آدمی نوکر نہ ہو اور یہ کام انہیں خود کرنا پڑے، ورنہ ان کو اس کی بھی خبر نہیں ہوتی کہ بچے کہاں ہیں اور کس طرح ہیں۔ اور اگر گھر میں کھانا پکانے والی بھی نوکر ہوئی تو ان کو چُولہے کی بھی خبر نہیں ہوتی۔ اب نوکرانی سیاہ وسفید جو چاہے کرے۔ غرض شوہر کے مال کی حفاظت کا عورتوں کو مطلقاً خیال نہیں ہوتا۔

مردوں کی کوتاہی:

اسی طرح مردوں کو عورتوں کے حقوق میں سے صرف بعضے دنیوی امور کا تو اہتمام ہے، یعنی زیور کپڑے کا یا کھانے پینے کا، باقی ان کے دین کی اصلاح کا کچھ بھی اہتمام نہیں۔ تو دونوں نے دو دو قسم کی کوتاہیاں کر رکھی ہیں۔ دو قسم کی مردوں نے اور دو قسم کی عورتوں نے۔ مجموعہ چار قسم کی کوتاہیاں ہوئیں۔ مردوں سے ایک کوتاہی تو یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے ذمہ صرف دنیوی حقوق سمجھتے ہیں، دینی حقوق اپنے ذمہ سمجھتے ہی نہیں کہ ہمارے ذمہ ان کے دین کا بھی

کوئی حق ہے۔ مثلاً گھر میں آ کر یہ تو پوچھتے ہیں کہ کھانا تیار ہوا یا نہیں؟ مگر یہ کبھی نہیں پوچھتے کہ تم نے نماز بھی پڑھی یا نہیں۔ اگر کھانا کھانے گھر میں آئے اور معلوم ہوا کہ ابھی تیار نہیں ہے تو خفا ہوتے ہیں یا تیار تو ہو گیا مگر مرضی کے موافق تیار نہیں ہوا تب بھی خفا ہوتے ہیں۔ اور اگر کبھی یہ معلوم ہوا ہو کہ بیوی نے اس وقت کی نماز اب تک نہیں پڑھی تو ان کو ذرا بھی ناگواری نہیں ہوتی، نہ بی بی پر خفا ہوتے ہیں۔ بلکہ اگر کسی کی بیوی عمر بھر بھی نماز نہ پڑھے تو بہت مردوں کو اس کی بھی پرواہ نہیں ہوتی۔

اور جو کبھی کسی کو کچھ خیال بھی ہوتا ہے اور یہ وہ ہیں جو دین دار کہلاتے ہیں تو وہ بھی یوں ہی چلتی سی بات کہہ دیتے ہیں کہ ''بی! نماز پڑھا کرو، نماز کا ترک کرنا بڑا گناہ ہے''۔ بس اتنا کہہ کر اپنے نزدیک یہ سبک دوش ہو گئے۔ اور جب کسی نے اُن سے کہا کہ تم اپنی بی بی کو نماز کے لیے تنبیہ کیوں نہیں کرتے؟ تو یہ جواب دیتے ہیں کہ کہہ تو دیا تھا، اب وہ نہیں پڑھتی تو میں کیا کروں؟ لیکن میں کہتا ہوں کہ انصاف سے بتایئے! کیا آپ نے نماز کے لیے اسی طرح کہا تھا جیسے نمک تیز ہونے پر کہا تھا۔ اور اگر ایک دو دفعہ کے کہنے سے اُس نے نمک کی درستی کا اہتمام نہ کیا تو وہاں بھی آپ ایسے ہی خاموش ہو جاتے ہیں جیسے نماز کے لیے ایک دو دفعہ کہہ کر خاموش ہو گئے؟ ہرگز نہیں۔ نمک تیز ہونے پر تو آپ سر توڑنے کو آمادہ ہو جاتے ہیں اور ایسی بری طرح خفگی ظاہر کرتے ہیں کہ بی بی سمجھ جاتی ہے کہ میاں بہت ناراض ہو گئے ہیں، اس لیے وہ بہت جلد نمک کی اصلاح کا اہتمام کرتی ہے۔

بیوی کو نماز پر کبھی تنبیہ نہیں کی:

صاحبو! نماز کے لیے آپ نے اس طرح کبھی نہیں کہا جس سے بی بی سمجھ جائے کہ میاں بہت ناراض ہو گئے ہیں۔ اگر یہاں بھی اسی طرح خفگی ظاہر کرتے تو وہ اس کا بھی ضرور اہتمام کرتی۔ اور اگر ایک دفعہ کے کہنے سے نہ پڑھتی تو دوسرے وقت پھر خفا ہوتے، پھر نہ پڑھتی تو تیسرے وقت پھر کہتے، اور جب تک وہ نماز نہ پڑھتی برابر کہتے رہتے اور مختلف طریقوں سے اپنی خفگی ظاہر کرتے۔ مثلاً پاس لیٹنا ترک کر دیتے یا اُس کے ہاتھ کا پکا ہوا نہ کھاتے، جیسا کہ

نمک کی تیزی پر اگر ایک بار خفا ہونے سے اثر نہ ہوا تو آپ خاموش نہیں ہو جاتے، بلکہ برابر کہتے رہتے ہیں۔ اور وہاں کبھی یہ خیال نہیں ہوتا کہ اتنی دفعہ تو کہہ دیا ہے، اب بھی وہ نہیں مانتی تو میں کیا کروں؟

صاحبو! انصاف سے بتلایئے کہ ہم نے کبھی کھانے پینے کے باب میں بھی اپنے جی کو اس طرح سمجھا لیا ہے جیسا نماز کے باب میں سمجھا لیا جاتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ یہ تو سراسر کوتاہی ہے۔ اگر آپ بی بی کو نمازی بنانا چاہیں تو کچھ دشوار بات نہیں، کیوں کہ عورت حاکم نہیں بلکہ محکوم ہے۔ چناں چہ اپنی اغراض کے لیے ان پر حکومت بھی کی جاتی ہے، مگر دین کے لیے اس حکومت سے ذرا کام نہیں لیا جاتا۔ ایک تو یہ کوتاہی ہے۔

مردوں کی دوسری کوتاہی:

دوسری کوتاہی یہ ہے کہ ان کے حقوقِ دنیویہ کو بھی پوری طرح اپنے ذمہ نہیں سمجھتے۔ پس دنیوی حقوق میں ان ہی باتوں کو اپنے ذمہ سمجھتے ہیں جو عرفاً مردوں کے ذمہ سمجھتی جاتی ہیں، اور جو حقوق معاشرت کے شریعت نے ہمارے ذمہ کیے ہیں ان کو عموماً مرد اپنے ذمہ نہیں سمجھتے۔ مثلاً بعضے گھروں میں دیکھا ہے کہ مرد بیوی سے بالکل لاپرواہ رہتا ہے۔ سال بھر باہر بیٹھک میں سوتے ہیں، گھر میں نہیں سوتے۔ اب یا تو کہیں اور تعلّق پیدا کیا جاتا ہے یا ویسے ہی باہر سوتے رہتے ہیں اور بیوی کے اس حق سے غافل ہیں، حالاں کہ رات کو اس کے پاس سونا بھی شرعاً اس کا حق ہے۔

بعض جگہ دیکھا ہے کہ مرد عورتوں سے بولتے بھی نہیں۔ ان میں بعض ایسے بھی ہیں جو بزرگ کہلاتے ہیں یا کسی بزرگ کے مرید ہیں۔ نماز، روزہ اور ذکر و شغل کے پابند ہیں، اپنے نزدیک جنّت خرید رہے ہیں، مگر بیوی کے حقوق سے غفلت۔ یاد رکھو! بیوی کا یہ بھی حق ہے کہ ایک وقت میں اس سے بات چیت بھی کی جائے اور اس کی تکلیف و راحت کی باتیں سنی جائیں اور دل جوئی کی باتوں سے اس کو خوش کیا جائے۔ مگر اس حق سے دنیا دار اور دین دار سب ہی غافل ہیں، جس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو اپنے ذمہ سمجھتے ہی نہیں، بس کھانا کپڑا ہی اپنے

ذمہ سمجھ لیا ہے۔

مردوں کی عورتوں پر بے جا سختی:

بعض جگہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ بات بات میں عورتوں کی خطائیں نکالی جاتی ہیں اور ان کی وجہ سے بات چیت ترک کی جاتی ہے یا گھر میں سونا چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اور وہ دو قسم کی خطائیں ہیں۔ بعض تو اختیاری ہیں جن میں عورتوں کے اختیار کو دخل ہے، مگر وہ اس درجہ کی نہیں ہوتیں کہ ان پر اتنی بڑی سزا دی جائے۔ چناں چہ عورتوں کی ایک خطا یہ بیان کی جاتی ہے کہ وہ گفتگو میں مرد کے آگے دبتی نہیں ہیں اور برابر جواب دیے چلی جاتی ہیں، حالاں کہ وہ محکوم ہیں ان کو محکوم بن کر رہنا چاہیے۔ سو میں کہتا ہوں کہ عورت بے شک محکوم ہے، لیکن وہ ایسی محکوم نہیں ہے جیسے ماما یا لونڈی محکوم ہوتی ہے، بلکہ اس کو مرد کے ساتھ دوستی کا تعلّق بھی ہے اور اس تعلّق کا خاصہ ہے کہ اس میں ایک قسم کا ناز بھی ہوتا ہے۔ اس تعلّق کے ساتھ مرد کا عورت پر وہ رعب نہیں ہوسکتا جو نوکروں پر ہوا کرتا ہے۔ مرد یہ چاہتے ہیں کہ بیوی پر بھی اسی طرح رُعب جمائیں جس طرح نوکر پر جمایا کرتے ہیں، یہ نہایت سنگ دلی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے اس تعلّق کی حقیقت کو سمجھا نہیں۔

بھلا! غور تو کیجیے کہ کیا آپ اپنے دوستوں پر ویسا رعب جما سکتے ہیں جیسا نوکروں پر جمایا جاتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اور اگر آپ ایسا کرنے لگیں تو سارے احباب آپ کو چھوڑ کر الگ ہوجائیں گے۔ دوستوں کے ساتھ نوکروں کا سا برتاؤ کوئی عاقل نہیں کرتا، پھر حیرت ہے کہ آپ بیوی کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنا چاہتے ہیں جس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی دوست نہیں ہوسکتا۔ تجربہ ہے کہ زمانۂ افلاس و مصیبت میں سب احباب الگ ہوجاتے ہیں اور ماں باپ تک انسان کو چھوڑ بیٹھتے ہیں، مگر بیوی ہر حالت میں مرد کا ساتھ دیتی ہے۔ اسی طرح بیماری میں جیسی راحت بیوی سے پہنچتی ہے کسی دوست سے بلکہ ماں باپ سے بھی نہیں پہنچتی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ بیوی کے برابر دنیا میں مرد کا کوئی دوست نہیں۔ پھر کیا یہ ستم نہیں ہے کہ مرد ان کو نوکروں کے برابر کرنا چاہتے ہیں؟ اور اگر وہ کسی وقت گفتگو میں اپنے اس تعلّق کی بنا پر بطورِ ناز کے برابری کرنے لگیں تو اس پر یہ سزا دی جاتی ہے کہ بولنا چالنا، پاس بیٹھنا اٹھنا یک

لخت بند کردیا جاتا ہے۔

ازواجِ مطہّرات رضی اللہ عنہن سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حسنِ سلوک:

صاحبو! یہ وہ تعلّق ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی بعض دفعہ ازواجِ مطہّرات (رضی اللہ عنہن) ناز میں آکر برابر کے دوستوں کا سا برتاؤ کرتی تھیں، حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر کون ہوگا؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر کمال میں بے نظیر تھے، کوئی آپ کے برابر نہ تھا۔ نیز اس کے ساتھ آپ صاحبِ سلطنت تھے۔ رعبِ سلطنت بھی آپ میں بہت زیادہ تھا (چناں چہ حدیث میں ہے کہ مہینہ بھر کی مسافت تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رعب کا اثر پہنچتا تھا کہ سلاطین آپ کا نام سن سن کر کانپتے تھے)، مگر بایں ہمہ بیبیوں پر آپ نے کبھی رعب سے اثر نہیں ڈالا، بلکہ اُن کے ساتھ آپ کا ایسا برتاؤ تھا جس میں حکومت اور دوستی کے دونوں پہلو ملحوظ رہتے تھے۔ تعلّق حکومت کا تو یہ اثر تھا کہ ازواجِ مطہّرات رضی اللہ عنہن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کبھی نہ کرتی تھیں۔ آپ کی تعظیم اور ادب اس درجہ کرتی تھیں کہ دنیا میں کسی کی عظمت[1] بھی ان کے دل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر نہ تھی۔ اور تعلّقِ دوستی کا یہ اثر تھا کہ بعض دفعہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ پر ناز کرتیں، مگر کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ناگوار نہ ہوتا تھا۔

قصۂ اِفک

مثلاً جس وقت قصۂ افک ہوا اور منافقین نے حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا پر بہتان باندھا تو

---

[1] چنانچہ حضرت ام المومنین ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے باپ ابوسفیان بن حرب ایک دفعہ اسلام لانے سے پہلے مدینہ منورہ میں آئے اور اپنی بیٹی کے پاس قیام کیا، تو گھر میں داخل ہوکر انہوں نے ایک بستر پر بیٹھنا چاہا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بسترِ مبارک تھا۔ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے نہایت سرعت سے اس بستر کو لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا اور اپنے باپ کو اس پر بیٹھنے نہ دیا۔ ابوسفیان نے کہا کہ بیٹی! یہ بستر تم نے اس لیے تہہ کردیا کہ میرے قابل نہ تھا، یا اس لیے لپیٹا ہے کہ میں اس کے قابل نہ تھا۔ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ یہ بستر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اور تم ناپاک مشرک ہو۔ ابوسفیان یہ جواب سن کر خاموش ہوگئے اور کچھ دیر خاموش رہ کر کہا: افسوس! میرے بعد تیری حالت بدل گئی۔

اول اول حضور ﷺ بہت دل گیر رہے، حتیٰ کہ ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے جب کہ وہ اپنے باپ کے گھر پر تھیں۔ یہ فرمایا کہ اے عائشہ! اگر تم بالکل بری ہو تو حق تعالیٰ تمہاری براءت ظاہر کر دیں گے؟ اور اگر واقعی تم سے غلطی ہوئی ہے تو حق تعالیٰ سے توبہ واستغفار کر لو۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس بات سے بہت رنج ہوا، کیوں کہ اس سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا تھا کہ حضور ﷺ کو بھی (نعوذ باللہ!) میری نسبت کچھ احتمال ہے، تو انہوں نے عرض کیا کہ میں نہیں جانتی کہ اس بات کا کیا جواب دوں؟ اگر میں یہ کہوں کہ میں بالکل بَری ہوں اور خدا جانتا ہے کہ میں بالکل بَری ہوں، تو اس کو آپ لوگوں کے دل قبول نہ کریں گے۔ اور اگر میں یہ کہہ دوں کہ ہاں! مجھ سے غلطی ہوئی ہے اور خدا جانتا ہے کہ میں اس سے بری ہوں، تو اس بات کو آپ فوراً تسلیم کر لیں گے۔ پس اس وقت میں وہی بات کہتی ہوں جو حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمائی تھی:

﴿فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَاتَصِفُوْنَ۝﴾ (یوسف:۱۸)

براءتِ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا

یہ کہہ کر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرطِ غم سے بستر پر لیٹ گئیں اور رونے لگیں۔ تو اسی وقت رسول اللہ ﷺ پر نزولِ وحی کے آثار نمایاں ہوئے اور مکان میں سناٹا ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب وحی ختم ہو چکی تو پہلی بات جو رسول اللہ ﷺ کے منہ سے نکلی وہ یہ تھی:

أَبْشِرِي، يَا عَائِشَةُ! فَقَدْ بَرَّأَكِ اللّٰهُ.

اے عائشہ! خوش خبری سن لو کہ حق تعالیٰ نے تمہاری براءت ظاہر کر دی۔

پھر آپ ﷺ نے وہ آیات پڑھ کر سنائیں جو اُس وقت نازل ہوئیں تھیں۔ اس بات کے سنتے ہی سب کو ایسی خوشی ہوئی کہ سارے گھر میں ہر شخص کا چہرہ خوشی سے کُھل گیا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی والدہ نے فرمایا:

قُوْمِي يَا عَائِشَةُ! إِلَيْهِ وَقَبِّلِي (أي إلى وجه رسول الله ﷺ)

اے عائشہ! اُٹھو، یعنی حضور ﷺ کو سلام کرو۔

تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

واللہ، لا أقوم إلیه، وإني لا أحمد إلا اللہ عز وجل.

بخدا! میں آپ کے پاس اٹھ کر نہ جاؤں گی، اور میں اپنے خدا کے سوا کسی کی حمد نہیں کرتی (کیوں کہ آپ نے تو مجھے آلودہ سمجھ ہی لیا تھا، خدا تعالیٰ نے مجھے بری کیا)۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے کلام کا منشا:

اب مردوں کو سمجھنا چاہیے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ بات کس بنا پر تھی؟ اس کا منشا وہی ناز تھا جو بی بی کو تعلقِ دوستی کی وجہ سے شوہر پر ہوتا ہے۔ اور شریعت نے عورتوں کی اس قسم کی باتوں پر جو وہ ناز میں کہہ ڈالیں کوئی مواخذہ نہیں فرمایا، اور اگر عورت کو ناز کا حق نہ ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ضرور تنبیہ فرماتے، کیوں کہ ظاہر میں یہ کلمہ نہایت سخت تھا۔

حضورِ پرنور صلی اللہ علیہ وسلم احکامِ شرعیہ میں کسی کی رعایت نہ فرماتے تھے:

اور یہ احتمال تو ہو ہی نہیں سکتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم احکامِ شرعیہ میں کسی کی رعایت فرمائیں۔ چناں چہ ایک عورت نے چوری کی تھی جن کا نام فاطمہ تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکمِ شرعی کے موافق ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ لوگوں نے سفارش کرنی چاہی اور حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو سفارش کے لیے تجویز کیا، کیوں کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب اور محبوب زادے تھے۔ چناں چہ وہ بھولے بھالے سفارش کرنے بیٹھ گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بہت برہم ہوئے اور فرمایا کہ حدود میں سفارش کرنا پہلی اُمتوں کو ہلاکت میں ڈال چکا ہے۔

اس کے بعد ایسی بات فرمائی کہ ہم تو اس کو نقل بھی نہیں کرسکتے، مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد سمجھ کر نقل کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ واللہ! اگر فاطمہ بنت محمد بھی ہوتی (نعوذ باللہ! نعوذ باللہ! نعوذ باللہ!) تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا (پھر فاطمہ مخزومیہ تو کیا چیز ہیں؟ چناں چہ ان کا ہاتھ کاٹا گیا۔ (کذا في أبو داود: ۲/۲۵۳)

اس سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم احکامِ شرعیہ میں کسی کی رعایت نہیں کرتے تھے اور نہ کرسکتے تھے۔ تو اگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ قول خلافِ شریعت ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اُن کی ہرگز

رعایت نہ فرماتے اور ضرور تنبیہ فرماتے۔

باوجود کمالِ محبّت کے حضور اکرم ﷺ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی احکامِ شرعیہ میں رعایت نہ فرما سکتے تھے

یہ بات بے شک ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے حضور ﷺ کو محبّت تھی، مگر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی ایسی خصوصیتیں ہیں کہ ان میں کوئی ان کا شریک نہ تھا اور برتاؤ میں اُن خصوصیتوں کا زیادہ ظہور ہوتا تھا۔ چناں چہ جب حضور ﷺ کہیں سفر میں تشریف لے جاتے تو جاتے ہوئے سب سے اخیر میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے ملتے تھے اور واپسی میں سب سے پہلے ان سے ملتے تھے تاکہ جدائی کا زمانہ کم ہو۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کس قدر محبّت تھی۔ نیز جب حضرت فاطمہ حضور ﷺ کے پاس تشریف لاتیں تو حضور ﷺ غایت محبّت سے ان کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے، تو ان کی محبّت کے ساتھ جب حضور ﷺ احکامِ شرعیہ میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی بھی رعایت نہ کر سکتے تھے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی تو کیا رعایت فرماتے؟

پس ثابت ہوا کہ اُن کا یہ کہنا کہ میں حضور ﷺ کی طرف اٹھ کر نہیں جاتی اور اپنے خدا کے سوا کسی کا شکریہ ادا نہیں کرتی، خدا و رسول کے خلاف نہ تھا۔ تو بی بی کا شوہر سے وہ تعلّق ہے جس میں اتنی بڑی بات کو خدا و رسول نے گوارا کر لیا، ورنہ یا تو حضور ﷺ گرفت فرماتے یا اس پر کوئی آیت ضرور نازل ہوتی۔

حضور ﷺ اپنی ذاتِ خاص اور اپنے گھر والوں کے لیے دنیوی وسعت کو پسند نہ فرماتے تھے

چناں چہ ایک مرتبہ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن نے حضور ﷺ سے خرچ زیادہ مانگا تھا تو اس پر آیت نازل ہوئی، حالانکہ ظاہر میں ان کی درخواست کی معقول وجہ بھی تھی، کیوں کہ اُس وقت حضور ﷺ کو فتوحات بہت ہونے لگی تھیں اور سب مسلمان فتوحات کی وجہ سے مال دار ہونے لگے تھے۔ مگر حضور ﷺ نے اس پر بھی اپنی ذاتِ خاص اور اپنے گھر والوں کے لیے دنیوی

وسعت کو گوارا نہ کیا تو ازواجِ مطہرات نے اس موقع پر زیادہ خرچ کی درخواست کی۔ تنگی کے وقت انہوں نے ایسی درخواست کبھی نہیں کی حتی کہ تنگی کے زمانے میں بعض وقت پانی بھی گھر میں نہیں ہوا تو حضور ﷺ سے کچھ شکایت نہیں کی۔ ہاں جب فتوحات سے سب مسلمان مالدار ہونے لگے اور تنگی رفع ہوگئی اُس وقت انہوں نے بھی اپنے لیے وسعت چاہی، مگر یہ بات حضور ﷺ کے مذاق کے خلاف تھی۔ آپ ﷺ بیبیوں کے لیے تو وسعت کو کیا پسند فرماتے اپنی بیٹی تک کے لیے بھی اس کو گوارا نہ فرمایا۔

سب سے بہترین وظیفہ جو حضور ﷺ نے اپنی صاحب زادی کو بتایا:

چناں چہ ایک مرتبہ کسی جہاد میں رسول اللہ ﷺ کے پاس بہت سے باندی غلام قید ہوکر آئے اور آپ مسلمانوں میں ان کو تقسیم فرمانے لگے۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ تم چکی پیسنے اور پانی بھرنے میں بہت تکلیف اٹھاتی ہو، اور اس وقت حضور ﷺ کے پاس باندی غلام بہت سے آئے ہوئے ہیں جن کو آپ مسلمانوں میں تقسیم فرما رہے ہیں۔ اگر تم بھی حضور ﷺ سے ایک باندی غلام مانگ لو تو اس محنت سے تم کو راحت ہو جائے گی۔

چناں چہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں تشریف لے گئیں تو اس وقت حضور ﷺ گھر میں نہ تھے۔ انہوں نے حضرت عائشہ سے اپنی درخواست کا مضمون بیان کردیا کہ حضور ﷺ تشریف لائیں تو میری طرف سے یہ عرض کردی جائے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب آپ ﷺ گھر تشریف لائے تو حضرت عائشہ نے حضور ﷺ سے عرض کردیا کہ صاحب زادی صاحبہ اس مقصد کے لیے تشریف لائی تھیں۔ آپ ﷺ اسی وقت حضرت فاطمہ کے گھر تشریف لائے اور فرمایا: اے فاطمہ! تم غلام اور باندی چاہتی ہو یا میں اس سے بھی اچھی ایک چیز تم کو بتلاؤں؟ انہوں نے عرض کیا کہ جو چیز اس سے بھی اچھی ہو وہی بتلا دیجیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ لیٹتے وقت ۳۳ بار سبحان اللہ اور ۳۳ بار الحمد للہ اور ۳۴ بار اللہ اکبر پڑھ لیا کرو، یہ تمہارے لیے لونڈی غلام سے بہتر ہے۔ وہ ایسی لائق صاحب زادی تھیں کہ اسی پر خوش

ہوگئیں اور اُخروی راحت کو دنیوی راحت پر ترجیح دی۔

مال کا زیادہ ہونا حضور ﷺ کے مذاق کے خلاف تھا:

جب حضور ﷺ نے اپنی اولاد کے لیے بھی باندی غلام رکھنا پسند نہیں فرمایا تو بیبیوں کے لیے ان باتوں کو کیسے پسند فرماتے؟ آپ ﷺ تو ہمیشہ یہ دُعا فرماتے تھے:

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ رِزْقَ اٰلِ مُحَمَّدٍ قُوْتًا.

اے اللہ! محمد (ﷺ) کے گھر والوں کا رزق بقدرِ ضرورت کر دیجیے، جس سے زندگی قائم رہ سکے۔

غرض مال کا زیادہ ہونا آپ کے مذاق کے خلاف تھا، اس لیے ازواج کی اس فرمائش سے آپ ﷺ تنگ دل ہوئے تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا وَزِیْنَتَھَا فَتَعَالَیْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَ اُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِیْلًا ۝ وَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللهَ وَرَسُوْلَهٗ وَ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِیْمًا ۝﴾

(الأحزاب: ۲۸، ۲۹)

یعنی ازواجِ مطہرات سے فرما دیجیے کہ اگر تم دنیا چاہتی ہو اس صورت میں تم میرے پاس نہیں رہ سکتیں۔ آؤ! میں تم کو متاعِ دنیا دے کر خوبی کے ساتھ رخصت کر دوں۔ اور اگر اللہ ورسول اور آخرت کی طالب ہو تو (پھر صبر وشکر کے ساتھ اس تنگی کی حالت میں گزر کرو اور نیک اعمال میں سعی کرتی رہو) اللہ تعالیٰ نے تمہارے میں سے نیک کام کرنے والیوں کے لیے بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔

حضورِ اکرم ﷺ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی کمالِ محبّت:

جب حضور ﷺ پر یہ آیات نازل ہوئیں تو آپ سب سے اوّل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لائے اور چوں کہ حضرت عائشہ نو عمر تھیں، کیوں کہ نو برس کی عمر میں وہ آپ ﷺ کے پاس آئی تھیں اور آپ ﷺ کی وفات کے وقت اُن کی عمر کل اٹھارہ سال کی تھی تو آپ نے یہ خیال کیا کہ اس عمر میں سمجھ کم ہوتی ہے، ایسا نہ ہو کہ اُن کے منہ سے یہ نکل جائے کہ ہم تو

دنیا چاہتے ہیں۔ اس لیے آپ نے آیات سنانے سے پہلے یوں فرمایا کہ اے عائشہ! میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں مگر اس کے جواب میں جلدی نہ کرنا، بلکہ اپنے والدین سے مشورہ کر کے جواب دینا (کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خوب جانتے تھے کہ اُن کے والدین حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے علیحدگی کی رائے کبھی نہیں دے سکتے)۔

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیات ان کو سنائیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو یہ مضمون سُن کر جوش ہوا اور عرض کیا:

أَفِي هٰذَا أَسْتَأْمِرُ أَبَوَيَّ؟

کیا میں اس بات کے لیے اپنے ماں باپ سے مشورہ کروں گی؟ میں نے اللہ کو اور اس کے رسول کو اور آخرت کو اختیار کیا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے جواب سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مسرت:

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے جواب سے بہت مسرور ہوئے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کسی اور بی بی سے یہ نہ کہیے کہ عائشہ نے یہ جواب دیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر مجھ سے کسی نے پوچھا تو میں چھپاؤں گا نہیں۔

اُلٹی گنگا:

غور کرنے کی بات ہے کہ حق تعالیٰ نے ازواجِ مطہرات کو زیادہ خرچ مانگنے سے تو منع فرمایا اور ان کو ناز کی بات سے منع نہیں فرمایا۔ تو معلوم ہوا کہ ناز کرنے میں اتنی برائی نہ تھی جتنی خرچ مانگنے میں تھی۔ مگر آج کل کتنی الٹ بات ہے کہ زیادہ خرچ مانگنے کو تو بُرا نہیں سمجھتے جو کسی درجہ میں مذموم بھی ہے، اور بی بی کے ناز اور بے تکلفی کو برا سمجھتے ہیں جو ذرا بھی بُری بات نہیں۔

ہمارے مذاق فاسد ہو چکے ہیں:

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے مذاق فاسد ہو چکے ہیں۔ ہمارے نفوس کی اصلاح نہیں ہوئی۔ ہمارے اندر مرض ہے جس کی وجہ سے ہر بات اُلٹی ہے کہ جو چیز ناگوار ہونا چاہیے تھی وہ

تو گوارا ہے اور جو گوارا ہونا چاہیے تھی وہ ناگوار ہے۔ جیسے صفراوی المزاج کو مٹھائی کڑوی معلوم ہوتی ہے، تو کیا وہ مٹھائی واقع میں کڑوی ہوتی ہے؟ ہرگز نہیں، بلکہ صفراویت کی وجہ سے اس کا مذاق بگڑ رہا ہے۔ اسی طرح باطنی مذاق بگڑ رہا ہے، اسی کا یہ اثر ہے کہ زیادہ خرچ مانگنے کو تو عورت کے لیے گوارا کرتے ہیں اور بے تکلفی اور ناز کی باتوں کو اس کے لیے گوارا نہیں کرتے۔ اور اسی وجہ سے حضور اقدس ﷺ کا اپنی بیبیوں کے ساتھ برتاؤ سن کر ہم کو تعجب ہوتا ہے، جیسا صفراوی المزاج کو مٹھائی کھانے والے کی حالت پر تعجب ہُوا کرتا ہے۔

مردوں کی غلطیاں:

یہ ہے ہماری غلطی جس کا حاصل یہ ہے کہ عورتوں کے دینی حقوق تو اپنے ذمہ سمجھتے ہی نہیں، ادا تو کیا کرتے اور دنیوی حقوق کو اپنے ذمہ سمجھتے ہیں، مگر ان کو بھی پوری طرح ادا نہیں کرتے۔ چناں چہ ایک حقِ دنیوی یہ ہے کہ ان کی بے تکلفی اور ناز کو گوارا کریں اور نیز ان کی بے تمیزی کو بھی گوارا کریں۔ ان حقوق کو مردوں نے عموماً نظر انداز کر رکھا ہے۔ یوں چاہتے ہیں کہ عورتیں باندیوں کی طرح محکوم اور تابع ہو کر رہا کریں اور کبھی ہماری بات کا اُلٹ کر جواب نہ دیا کریں۔ اور جو کسی نے ایسا کیا تو اس سے بولنا چالنا، پاس لیٹنا بیٹھنا سب موقوف کر دیتے ہیں۔ یہ بہت بے جا حرکت ہے۔ نیز بعضے مرد یوں چاہتے ہیں کہ عورتیں ہماری طرح تمیز دار اور سلیقہ شعار ہو کر رہیں، اسی لیے جب کسی عورت سے کوئی بات بے تمیزی کی ہو جاتی ہے تو اس پر سخت سزا دی جاتی ہے حالاں کہ عورتوں کا ایک حق یہ بھی ہے کہ اُن کی بے تمیزی کو گوارا کیا جائے۔

عورتیں ٹیڑھی پسلی سے پیدا ہوئی ہیں،
لہٰذا اُن میں تھوڑی سی بے تمیزی مناسب ہے

حدیث میں ہے کہ عورت ٹیڑھی پسلی سے پیدا ہوئی ہے، اس لیے اس کے اخلاق میں کجی ہے۔ اگر اس کو سیدھا کرنا چاہو گے تو ٹوٹ جائے گی، بس اس سے نفع اٹھانا ہے تو کجی کے ساتھ نفع اٹھاتے رہو۔ دوسرے کچھ عورتوں کے زیادہ مناسب حال یہی ہے کہ وہ تھوڑی سی

بے تمیز ہوں، کیوں کہ اکثر بے تمیز وہی ہوتی ہیں جو سیدھی سادی ہوتی ہیں۔ اور ایسی عورتیں نہایت عفیف اور تابع دار ہوتی ہیں، اور جو بہت سلیقہ دار ہیں وہ اکثر نہایت چالاک ہوتی ہیں، اگرچہ بعض ایسی بھی ہیں کہ سلیقہ دار ہونے کے ساتھ خاوند کی مطیع اور تابع دار بھی ہیں، مگر ایسی بہت کم ہیں۔ زیادہ تو یہی دیکھا گیا ہے کہ سلیقہ دار عورتیں تابع دار نہیں ہوتیں، نیز ان میں عفت وحیا بھی کم ہوتی ہے۔ اور جو سیدھی سادی ہیں وہ خاوند کی بہت تابع دار اور جاں نثار ہوتی ہیں۔ بعض عورتوں کو تو یہاں تک دیکھا ہے کہ وہ خود بیمار ہیں، اٹھنے کی بھی طاقت نہیں، مگر اسی حالت میں اگر کہیں خاوند بیمار ہوگیا تو وہ اپنی بیماری بھول جاتی ہیں۔ اب ان کو کسی پہلو قرار نہیں آتا، نہ آرام ہے نہ چین، ہر وقت خاوند کی تیمار داری میں مشغول رہتی ہیں۔

اور یہ تو روز مرہ کی بات ہے کہ عورتیں خود کھانا اخیر میں کھاتی ہیں اور سب سے پہلے مردوں کو کھلاتی ہیں۔ اور بعض دفعہ اخیر میں کوئی مہمان آیا تو خود بھوکی رہیں گی اور مہمان کے سامنے اپنے کھانے سے پہلے کھانا بھیج دیں گی۔ اگر اُس کے کھانے کے بعد کچھ بچ گیا تو خود بھی کھالیا، ورنہ فاقہ کرلیا۔ اگر کبھی خاوند آدھی رات کو سفر سے آگیا تو اسی وقت اپنا چین وآرام چھوڑ کر اس کے لیے کھانا پکاویں گی اور اس کی خدمت میں لگ جاویں گی۔ تو اس قسم کی عورتیں جو خاوند پر مرمٹیں اکثر وہی ہیں جو تھوڑی سی بے تمیز بھی ہوتی ہیں۔ سلیقہ داروں میں یہ باتیں نہیں ہوتیں۔

عورتوں کو دینی تعلیم کافی دینی چاہیے:

اور اسی وجہ سے میری رائے ہے کہ عورتوں کی دنیوی تعلیم مختصر سی ہونی چاہیے، ہاں دین کی تعلیم کافی ہونی چاہیے۔ میں نے کان پور میں ایک شخص کو دیکھا کہ اپنی عورت کو جغرافیہ پڑھا تا تھا۔ میں نے کہا کہ جغرافیہ کی عورت کو کیا ضرورت؟ کیا بھگانے کے لیے پڑھاتے ہو؟ کیوں کہ جب اس کو سب راستے بتلادیے گئے اور پھر مختلف شہروں کے عجائبات معلوم ہوگئے، تو اب وہ گھر کی چاردیواری میں کیوں رہے گی؟

عورت کا کمال یہ ہے کہ گھر میں رہے:

عورت کا کمال تو یہی ہے کہ اس کو اپنے گھر کے سوا کسی اور جگہ کا راستہ معلوم نہ ہو، نہ کسی

شہر کی اسے خبر ہو۔ اس جہالت ہی سے وہ گھر میں قید رہ سکتی ہے، کیوں کہ اس حالت میں وہ بھاگنا بھی چاہے تو کیوں کر بھاگے۔ اس کو یہ خبر ہی نہیں کہ ریل میں کس طرح بیٹھا کرتے ہیں۔ ٹکٹ کہاں سے ملتا ہے اور اسٹیشن کس طرف کو ہے؟ اور جغرافیہ پڑھ کر تو وہ دنیا بھر سے باخبر ہوجائے گی اور جہاں چاہے گی آسانی سے چلی جائے گی۔ واقعی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ عورتوں کو جغرافیہ پڑھانے میں کیا مصلحت ہے، بجز اس کے کہ ان کو بھاگنے کا راستہ بتلانا ہے۔

سمجھ دار نئے تعلیم یافتہ عورتوں کو صرف دینیات کی تعلیم دیتے ہیں:

اس لیے نو تعلیم یافتہ طبقہ میں جو لوگ عاقل ہیں وہ عورتوں کو اس قسم کے علوم نہیں پڑھاتے۔ ریل میں ایک جنٹ عربی داں مجھ سے ملے تھے، کہنے لگے کہ میں لڑکوں کو تو فلسفہ وجغرافیہ پڑھاتا ہوں، مگر لڑکیوں کو محض دینیات کی کتابیں پڑھاتا ہوں۔ اور دینیات کے سوا کچھ نہیں پڑھاتا، کیوں کہ دنیوی علوم سے ان کے اخلاق پر برا اثر پڑتا ہے۔ واقعی صحیح رائے ہے۔ پس عورتوں کو دین تو پڑھائیں، مگر جغرافیہ فلسفہ ہرگز نہ پڑھائیں۔

اخبار اور ناول عورتوں کے لیے زہرِ قاتل ہیں، اسی طرح زنانہ اسکول بھی سخت مضر ہیں

باقی اخبار اور ناول پڑھانا تو عورتوں کے لیے زہرِ قاتل ہے، یہ نہایت سخت مضر ہے، اس سے بعض دفعہ عورتوں کی آبرو برباد ہوجاتی ہے۔ اسی طرح مستورات کو باہر پھرنے والی عورتوں سے بھی بچانا چاہیے۔ خصوصاً شہروں میں جو یہ رواج ہے کہ لڑکیوں کو میمیں گھر پر آکر پڑھاتی ہیں، اس کو سختی سے بند کرنا چاہیے۔ میں کان پور میں سنا کرتا تھا کہ آج فلاں عورت بھاگ گئی اور کل فلاں کی بیٹی بھاگ گئی۔ یہ صرف اسی کا نتیجہ تھا کہ عورتوں کو پڑھانے کے لیے میم گھر پر آتی تھی، تو یہ ہرگز نہ چاہیے۔

اسی طرح شُرَفا نے کبھی اس کو بھی پسند نہیں کیا کہ لڑکیوں کے لیے زنانہ مدرسہ ہو۔ قصبات میں لڑکیاں عموماً لکھی پڑھی ہوتی ہیں، مگر سب اپنے گھروں پر تعلیم پاتی ہیں،

مدرسہ میں کسی نے بھی تعلیم نہیں پائی۔ گھروں پر تعلیم پانے سے لڑکیوں کا کسی طرح کا نقصان نہیں ہوتا، کیوں کہ پڑھانے والی بھی نیک اور پردہ نشین ہوتی ہے اور لڑکیاں بھی پردہ ہی میں رہ کر تعلیم پاتی ہیں۔ باقی یہ جو آج کل زنانے اسکول ہوئے ہیں، تجربہ سے معلوم ہوا کہ یہ بہت ہی مضر ہیں۔ رہا یہ کہ کیوں مضر ہیں؟ چناں چہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جب اسکول میں پردہ کا پورا اہتمام کیا جاتا ہے اور پردہ کے ساتھ لڑکیوں کو بند گاڑی میں پہنچایا جاتا ہے، تو پھر ان کے مضر ہونے کی کیا وجہ ہے؟ تو ہمیں اس کی علت[1] کی خبر نہیں، مگر تجربہ یہی ہے کہ اسکولوں کی تعلیم عورتوں کو بہت ہی مضر ہوتی ہے، اس سے ان میں آزادی اور بے حیائی اور پردہ سے نفرت کا مضمون پیدا ہو جاتا ہے۔ غرض عورتوں کو دین کی تعلیم تو دینی چاہیے، اتنی تعلیم تو ضروری ہے اس سے زیادہ مضر ہے۔

آج کل کی حالت:

اب تو یہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے کہ اخباروں میں عورتوں کے اشعار چھپتے ہیں اور اخیر میں اُن کا نام یا فلاں کی بیٹی یا فلاں کی بیوی بھی چھپتا ہے۔ میں نے یہاں تک دیکھا ہے کہ ایک شخص میرے سامنے اخبار پڑھ رہے تھے۔ اس میں ایک عورت کا پتا پورا لکھا ہوا تھا کہ فلاں کی بیٹی، فلاں شہر، فلاں محلّہ کی رہنے والی۔ وہ کہنے لگے: عورتوں کے نام اس طرح اخباروں میں چھاپنا گویا ان کو سرِ بازار بٹھلا دینا ہے، واقعی سچ ہے۔ اس طرح تو گویا ظاہر کر دینا ہے کہ جو کوئی ہم سے ملنا چاہے اس پتے پر چلا آوے، اور اگر کسی کی یہ نیت بھی نہ ہو تو بدمعاشوں کو پتا معلوم ہو جانے سے سہولت تو ہو ہی جائے گی۔

---

[1] اس کے اسباب کی کچھ مجمل تفصیل احقر کی ایک تحریر میں ہے جو اصلاحِ انقلاب جلد اول بزیرِ تحقیقِ تعلیمِ نسواں اور ''بہشتی زیور'' حصّہ اول کے ضمیمہ اول کے آخر کے قریب تحت عنوان ''اصلاح معاملہ متعلّقہ تعلیمِ نسواں'' میں شائع ہوئی ہے، جو نہایت مفید مضمون اور قابل ملاحظہ ہے۔ اس مقام پر ان میں سے صرف یہ جزو خاص جو زنانہ اسکول کے متعلق ہے مع نصابِ ضروری و بحثِ تعلیمِ کتابت نقل کر کے وعظ کے اخیر میں ملحق کیا جاتا ہے۔

عورت پردہ میں رہے، عورت کے معنی بھی یہی ہیں کہ چھپی ہوئی:

صاحبو! عورتوں کو اس طرح رکھنا چاہیے کہ محلّہ والوں کو بھی خبر نہ ہو کہ اس گھر میں کتنی عورتیں ہیں، اور ہیں بھی یا نہیں۔ اسی میں آبرو کی خیر ہے۔ ہمارے قصبات میں یہ حالت ہے کہ جب بعض لڑکیوں کی شادی ہوئی تو بستی والوں کو تعجب ہوا کہ میاں! کیا تمہارے بھی لڑکی تھی۔ حیرت ہے کہ ہم کو بستی میں رہ کر بھی اس کی خبر نہ ہوئی۔

عورت کے لیے یہی مناسب ہے کہ اس کی خبر اپنے گھر والوں کے سوا کسی کو بھی نہ ہو۔ ہمارے یہاں ایک رسم یہ بھی ہے اور مجھے پسند ہے کہ لڑکیوں کا مردوں سے تو پردہ ہوتا ہی ہے، غیر عورتوں سے بھی ان کا پردہ کرایا جاتا ہے۔ چناں چہ نائن یا دھوبن یا کنجڑن وغیرہ جہاں گھر میں آئی اور سیانی لڑکیاں فوراً پردہ میں ہوگئیں۔ اس طریقے سے ان میں حیاوشرم پوری طرح پیدا ہوجاتی ہے، بے باکی اور دیدہ چشمی نہیں ہونے پاتی۔ پہلے لوگوں نے اس قسم کی بعض حکمت کی باتیں ایجاد کی تھیں، سو واقعی ان میں بڑی مصلحت ہے۔ گو بعض فخر کی باتیں بھی ہیں، ان کو مٹانا چاہیے، لیکن یہ حکمت کی باتیں دستور العمل بنانے کے قابل ہیں۔ اور جہاں اُن پر عمل ہے وہاں کی لڑکیاں عموماً حیادار اور عفیف اور خاوند کی تابع دار ہوتی ہیں۔

شریعت کو چھوڑ دینے سے حیا اور غیرت رخصت ہو جاتی ہے:

مگر اب تو شہروں میں یہ حالت ہے کہ میں نے ایک عورت کی عاشقانہ غزل پیر کی شان میں چھپی ہوئی دیکھی تھی۔ خدا جانے وہ پیر بھی کیسے تھے کہ جنہوں نے اس کو گوارا کیا۔ واقعی شریعت کے چھوڑنے سے حیا اور غیرت بھی بالکل جاتی رہتی ہے۔ میں نے بعض جگہ یہ دستور دیکھا ہے کہ عورتیں پیروں سے پردہ نہیں کرتیں، اُن کے سامنے آتی ہیں اور غضب یہ کہ بعض دفعہ تنہائی میں بھی اُن کے پاس آتی جاتی ہیں کہ کوئی محرم بھی اس جگہ نہیں ہوتا۔ یہ کس قدر حیا سوز طریقہ ہے۔

پیر سے بھی شدید پردہ ہے:

بیبیو! پیر سے فقط دین کی تعلیم حاصل کرو۔ اس کے سوا خدمت وغیرہ کچھ نہ کرو، نہ اُس

کے سامنے آؤ۔ نہ خط وکتابت کرو، بلکہ جو کچھ لکھوانا ہو اپنے مرد سے کہہ دو کہ وہ خود لکھ دے۔ اور اگر کبھی مجبوری کی حالت میں تم کو خود ہی خط لکھنا پڑے تو اس میں اس بات کا ضرور لحاظ رکھو کہ خط لکھ کر اپنے شوہر یا بھائی یا بیٹے کو دکھلایا کرو اور پتا کا لفافہ مرد ہی سے لکھوایا کرو۔ اس میں کوئی زیادتی نہ ہوگی اور نہ مردوں کو اس طرح خط وکتابت گراں ہوگی۔ اور اگر اس میں بھی اُن کے دل پر کچھ گرانی دیکھو تو خود ہرگز خط نہ لکھو، بلکہ مرد ہی سے لکھوادیا کرو۔ مگر ان باتوں کی آج کل مطلق پرواہ نہیں۔ بلکہ یہاں تک بے حیائی ہے کہ ایک عورت نے پیر کی شان میں عاشقانہ غزل لکھی، جس میں خد وخال اور فراق ووصال تک کا حال لکھا تھا اور وہ ایک پرچہ میں شائع ہوئی۔ پرچہ میرے پاس آتا تھا۔ جب میں نے یہ دیکھا تو مجھے سخت غصّہ آیا اور اس پرچہ کا اپنے نام پر آنا بند کردیا۔

شریف آدمی عورت کی آزادی پر صبر نہیں کرسکتا:

تو صاحبو! جس کا نام سلیقہ رکھا گیا ہے وہ تو بدون ان باتوں کے آتا نہیں، مگر اس سلیقہ کے ساتھ عورتوں کی حیا اور عفت واطاعت سے ہاتھ دھولینا چاہیے۔ اور اگر حیا وعفت اور اطاعت چاہتے ہو تو یہ جواہر تو اُن ہی عورتوں میں پائے جاتے ہیں جن کو تم بدسلیقہ اور بدتمیز کہتے ہو اور قاعدہ ہے:

من ابتلي ببليتين فليختر أهونهما.

جو شخص دو بلاؤں میں پھنس جائے اسے اہون (آسان) صورت اختیار کرنا چاہیے۔

اب تم خود دیکھ لو کہ سلیقہ سکھا کر عورتوں کی آزادی اور بے حیائی اور دیدہ چشمی پر صبر آسان ہے یا سلیقہ رکھ کر تھوڑی سی بے تمیزی پر صبر آسان ہے۔ سو عُقلا اور شُرفا کے نزدیک تو بے تمیزی ہی پر صبر کرلینا آسان ہے۔ شریف آدمی عورت کی آزادی اور دیدہ چشمی پر ہرگز صبر نہیں کرسکتا۔ رہا یہ کہ عورتوں کی جہالت اور بدتمیزی سے دل تو دکھتا ہے اور کلفت تو بہت ہوتی ہے اور دل دکھنا اچھا نہیں۔

دین کی تعلیم سے عورتوں میں سلیقہ آئے گا:

سو اس کا علاج یہ بھی تو ممکن ہے کہ ان کو دین کی کتابیں پڑھاؤ اس سے ان کو سلیقہ اور

تمیز بھی بقدرِ ضرورت آجاتی ہے، بلکہ اسکول کی تعلیم پانے والیوں سے زیادہ ان میں تہذیب آجاتی ہے۔ کیوں کہ دین کی تعلیم سے اخلاق درست ہوجاتے ہیں اور خدا کا خوف دل میں پیدا ہوتا ہے۔ شوہر کے حقوق پر اطلاع ہوتی ہے۔ باقی یہ ہرگز امید نہ رکھو کہ وہ بالکل تم جیسی ہوجائیں، کیوں کہ ان میں جو خلقی کجی ہے وہ زائل نہیں ہوسکتی۔ کتے کی دُم کو چاہے برسوں نلکی میں رکھو، مگر جب نکالو گے ٹیڑھی ہوگی۔ تو مرد کو اتنا سخت مزاج نہ ہونا چاہیے کہ عورت کی ذرا ذرا سی بدتمیزی پر غصّہ کیا کرے۔ سو بعض دفعہ تو یہ وجہ ہوتی ہے مرد کی سختی اور تند مزاجی کی۔ یہ تو ایسی وجوہ ہیں جن میں کچھ عورت کے اختیار کو بھی دخل ہے۔

مردوں کا غیر اختیاری باتوں پر غصّہ کرنا سخت غلطی ہے:

اور کبھی غیر اختیاری باتوں پر غصّہ کیا جاتا ہے۔ یہ تو نہایت سخت غلطی ہے۔ مثلاً بعض لوگ بیوی سے کہتے ہیں کہ کم بخت! تیرے کبھی اولاد ہی نہیں ہوتی، تو اس میں وہ بے چاری کیا کرے؟ اولاد کا ہونا کسی کے اختیار میں تھوڑا ہی ہے۔ بعض دفعہ بادشاہوں کے اولاد نہیں ہوتی، حالانکہ وہ ہر قسم کی مقوی غذائیں اور محبل دوائیں بھی استعمال کرتے ہیں، مگر پھر بھی خاک نہیں ہوتا۔ یہ تو محض خدا تعالیٰ کے قبضہ و اختیار کی بات ہے اس میں عورتوں کا کیا قصور ہے۔ بعض مردوں کو ہم نے دیکھا ہے کہ وہ بیوی سے اس بات پر خفا ہوتے ہیں کہ کم بخت! تیرے تو لڑکیاں ہی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ سو اوّل تو اس میں اس کی کیا خطا ہے (بلکہ اطبّا سے پوچھو تو شاید وہ اس میں آپ کا ہی قصور بتلائیں) دوسرے یہ ناگواری کی بات بھی نہیں، کیوں کہ:

آں کس کہ تو نگرت نمے گرداند
او مصلحتِ تُو از تو بہتر داند

خضر علیہ السلام کا واقعہ:

حضرات! آپ کو خوب یاد ہوگا کہ حضرت خضر علیہ السلام نے جس لڑکے کو قتل کردیا تھا اس کے لیے اور اس کے والدین کے لیے مصلحت یہی تھی۔ مولانا فرماتے ہیں:

آں پسر را کش خضر بہ برید حلق

سرِ آں را در نیابد عام خلق

اسی طرح خضر علیہ السلام نے کشتی میں سوار ہو کر اس کا ایک تختہ توڑ دیا تھا۔ ظاہر میں یہ کشتی کو عیب دار کرنا تھا، مگر اس میں بڑی مصلحت تھی۔ مولانا فرماتے ہیں:

گر خضر در بحر کشتی را شکست
صد درستی در شکستِ خضر ہست

پھر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس لڑکے کے قتل ہونے کے بعد حق تعالیٰ نے اس کے والدین کو ایک لڑکی دی جس کی اولاد میں انبیا ہوئے۔ تو بتلایئے! اگر آپ کے لڑکا ہوتا اور ویسا ہی ہوتا جیسا وہ لڑکا تھا جسے خضر علیہ السلام نے مار ڈالا تھا تو آپ کیا کر لیتے؟ یہ خدا کی بڑی مصلحت ہے کہ اس نے آپ کو لڑکیاں دیں۔ کیوں کہ عموماً لڑکیاں خاندان کو بدنام نہیں کیا کرتیں اور والدین کی اطاعت بھی خوب کرتی ہیں، اور لڑکے تو آج کل ایسے خودسر ہوتے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ ان کے ہونے سے تو نہ ہونا ہی بھلا تھا۔

اب آج کل اگر خضر علیہ السلام ایسے لڑکوں کو نہیں مارتے تو اللہ میاں تو ذبح کر سکتے ہیں، اور لڑکا پیدا نہ کرنا یہ بھی ایک گونہ ذبح ہی کے مثل ہے۔ اور جس کو اللہ تعالیٰ نے کچھ بھی اولاد نہ دی، نہ لڑکا نہ لڑکی اس کے لیے یہی مصلحت ہے کہ وہ بندوں کے مصالح کو ان سے زیادہ جانتے ہیں۔

اولاد کے ہوتے ہوئے انسان بے فکر نہیں رہ سکتا:

دیکھیے! آج ایک شخص بے فکری سے دین کے کام میں لگا ہوا ہے، کیوں کہ اُس کے اولاد نہیں، اب اگر اُس کے اولاد ہو جائے تو کیا خبر ہے اُس وقت یہ بے فکری رہے یا نہ رہے؟ اولاد کے ساتھ ہزاروں افکار لگے ہوئے ہیں۔ آج کسی کے کان میں درد ہے، کسی کے پیٹ میں درد ہے۔ کوئی گر پڑا ہے، کوئی گم ہو گیا ہے اور ماں باپ پریشان ہیں۔ تو ممکن ہے خدا نے اس کو اسی لیے اولاد نہ دی ہو کہ وہ اس کو آزاد ہی رکھنا چاہتے ہیں۔

ایک مرتبہ جب میں حج کو حاضر ہوا تو میرے گھر میں کی خالہ نے حضرت حاجی صاحب

رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ دعا کر دیجیے کہ اس کے اولاد ہو۔ حضرت نے خلوت میں مجھ سے فرمایا کہ تمہاری خالہ اولاد کے لیے دعا کو کہتی تھیں۔ دعا سے کیا انکار ہے؟ بھائی! مجھے تو یہی بات پسند ہے کہ تم بھی مجھ جیسے ہو۔ پھر آپ نے اولاد کی مذمت بیان فرمائی کہ ان کی وجہ سے یوں افکار پڑ جاتے ہیں اور بڑے ہو کر یوں ستاتے ہیں۔ میں نے کہا: حضرت! میں بھی پسند وہی کرتا ہوں جس کو آپ پسند کریں۔ اس سے حضرت بہت خوش ہوئے اور واقعی جیسی بے فکری مجھے آج کل ہے اولاد کے ساتھ تھوڑا ہی ہو سکتی تھی۔

ظرافت کی کہانی:

میرے بھائی ایک ظرافت کی کہانی سناتے تھے۔ ایک شخص نے کسی صاحبِ عیال سے پوچھا کہ تمہارے گھر خیریت ہے؟ تو بڑا خفا ہوا کہ میاں! خیریت تمہارے یہاں ہوگی۔ مجھے بددعا دیتے ہو۔ ہمارے یہاں خیریت کہاں؟ ماشاء اللہ بیٹے ہیں، بیٹیاں ہیں، پھر ان کی اولاد ہے۔ سارا گھر بچوں سے بھرا ہوا ہے۔ آج کسی کے کان میں درد ہے، کسی کو دست آتے ہیں، کسی کی آنکھ دُکھ رہی ہے، کوئی کھیل کُود میں چوٹ کھا کر رو رہا ہے۔ خیریت ہوگی اس کے یہاں جو منحوس ہو، جس کے گھر میں کوئی بال بچہ نہ ہو۔ ہمارے یہاں خیریت کیوں ہوتی؟

اولاد نیک نہ ہو تو از حد پریشانی ہوتی ہے:

تو واقعی بچوں کے ساتھ خیریت کہاں؟ بچپن میں ان کے ساتھ اس قسم کے رنج وافکار ہوتے ہیں اور جب وہ سیانے ہوئے تو اگر صالح ہوئے تو خیر! اور آج کل اس کی بہت کمی ہے، ورنہ پھر جیسا وہ ناک میں دَم کرتے ہیں معلوم ہے۔ پھر ذرا اور بڑے ہوئے، جوان ہو گئے تو ان کے نکاح کی فکر ہے۔ بڑی مصیبتوں سے نکاح بھی کر دیا تو اب یہ غم ہے کہ اس کے اولاد نہیں ہوتی۔ اللہ اللہ کر کے تعویذ گنڈوں اور دواؤں سے اولاد ہوئی، تو بڑے میاں کی اتنی عمر ہو گئی کہ پوتے بھی جوان ہو گئے۔ اب بچہ بچہ ان کو بات بات میں بے وقوف بناتا اور ان کی خدمت سے اکتاتا ہے اور بیٹے پوتے منہ پر کوری کوری سناتے ہیں اور یہ بے چارے معذور ایک طرف پڑے ہیں۔ یہ اولاد کا پھل ہے، تو پھر خواہ مخواہ لوگ اُس کی تمنّائیں کرتے ہیں۔

ایک لطیفہ:

مجھے ایک لطیفہ یاد آیا کہ میرے استاد مولانا سید احمد صاحب دہلوی کے ماموں حضرت مولانا سید محبوب علی صاحب جعفری کے اولاد نہ ہوتی تھی۔ ایک دفعہ وہ غمزدہ بیٹھے تھے۔ میرے استاد نے پوچھا (اور یہ اُن کے لڑکپن کا زمانہ ہے) کہ آپ غمگین کیوں ہیں؟ کہا: مجھے اس کا رنج ہے کہ بڑھاپا آ گیا اور میرے اب تک اولاد نہیں ہوئی۔ استاد رحمہ اللہ نے فرمایا: سبحان اللہ! یہ خوشی کی بات ہے یا غم کی؟ انہوں نے کہا کہ یہ خوشی کی بات کیوں کر ہے؟ فرمایا: یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ کے سلسلۂ نسل میں آپ مقصود بالذات ہیں اور تمام آباء اجداد مقصود بالغیر۔ بخلاف اولاد والوں کے کہ وہ خود مقصود نہیں ہیں۔ ان کو تو تخم کے واسطے پیدا کیا گیا۔

دیکھیے! گیہوں دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک تو وہ جن کو کھانے کے لیے رکھا جاتا ہے۔ دوسرے وہ جو تخم کے لیے رکھے جاتے ہیں۔ تو ان دونوں میں مقصود وہ ہے جو کھانے کے لیے رکھا جاتا ہے۔ کھیت بونے سے مقصود یہی گیہوں تھے۔ اور جس کو تخم کے واسطے رکھتے ہیں وہ مقصود نہیں بلکہ وہ واسطہ ہیں مقصود کے۔ اسی طرح جس کے اولاد نہ ہو آدم علیہ السلام سے لے کر اس وقت تک ساری نسل میں مقصود وہی تھا اور سب اُس کے وسائط اور مقدمات تھے، اور جن کے اولاد ہوتی ہے وہ خود مقصود نہیں ہیں بلکہ تخم کے واسطے رکھے گئے ہیں۔

تو واقعی ہے یہ علمی مضمون۔ بے اولادوں کو اپنی حسرت اس مضمون کو سوچ کر مٹا لینی چاہیے۔ اور اگر اس سے بھی حسرت نہ جائے تو دنیا کی حالت کو دیکھ کر تسلّی کر لیا کریں کہ جن کے اولاد ہے وہ کس مصیبت میں گرفتار ہیں۔ اور اس سے بھی تسلّی نہ ہو تو یہ سمجھ لے کہ جو خدا کو منظور ہے وہی میرے واسطے خیر ہے، نہ معلوم اولاد ہوتی تو کیسی ہوتی۔ اور یہ بھی نہ کر سکے تو کم از کم یہ تو سمجھے کہ اولاد نہ ہونے میں بیوی کی کیا خطا ہے۔

بعض لوگ محض اتنی بات پر کہ اولاد نہیں ہوتی دوسرا نکاح کر لیتے ہیں، حالانکہ دوسرا نکاح کرنا اس زمانے میں اکثر حالات میں زیادتی ہے کیوں کہ قانونِ شرعی یہ ہے:

﴿فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ﴾ (النساء: ۳)

کہ اگر متعدد بیویوں میں عدل نہ ہوسکنے کا اندیشہ ہو تو صرف ایک عورت سے نکاح کرویا کچھ باندیاں خریدلو۔ اور ظاہر ہے کہ آج کل طبائع کی خصوصیات سے عدل نہیں ہوسکتا۔ ہم نے تو کسی مولوی کو بھی نہیں دیکھا جو دو بیویوں میں پورا پورا عدل کرتا ہو، دنیا دار تو کیا ہی کریں گے۔

بس یہ ہوتا ہے کہ دوسرا نکاح کرکے پہلی کو معلّق چھوڑ دیتے ہیں، جس کی وجہ یہ ہے کہ طبائع میں آج کل انصاف ورحم کا مادہ بہت کم ہے۔ تو آج کل کے اعتبار سے تو عدل قریب قریب قدرت سے خارج ہے۔ پھر جس غرض کے لیے دوسرا نکاح کیا جاتا ہے اس کا کیا بھروسہ ہے کہ دوسرے نکاح سے وہ حاصل ہو ہی جائے گی، ممکن ہے کہ اس سے بھی اولاد نہ ہو تو پھر کیا کرلوگے؟ بلکہ میں نے یہ دیکھا ہے کہ ایک شخص نے اپنی بی بی کو بانجھ سمجھ کر دوسرا نکاح کیا اور نکاح کے بعد پہلی ہی بیوی کے اولاد ہوئی، تو خواہ مخواہ ایک محتمل امر کے لیے اپنے کو عدل کی مصیبت میں گرفتار کرنا اچھا نہیں۔ اور جو عدل نہ ہو تو پھر دنیا وآخرت دونوں کی مصیبت سر پر رہی۔ لوگ زیادہ تر اولاد کے لیے ایسا کرتے ہیں اور اولاد کی تمنّا اس لیے ہوتی ہے کہ نام باقی رہے۔ تو نام کی حقیقت سن لیجیے کہ ایک مجمع میں جاکر ذرا لوگوں سے پوچھیے کہ پردادا کا نام بہت سوں کو معلوم نہ ہوگا۔ جب خود اولاد ہی کو اپنے پردادا کا نام معلوم نہیں تو دوسروں کو خاک معلوم ہوگا، تو بتلایئے نام کہاں رہا؟

اولاد سے نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کی فرماں برداری سے نام چلتا ہے:

صاحب! نام اس سے چلتا ہے: ﴿وَاجْعَلْ لِّیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْاٰخِرِیْنَ O﴾ (الشعراء: ۸۴) خدا کی فرماں برداری کرو، اس سے نام چلے گا۔ اولاد سے نام نہیں چلا کرتا، بلکہ اولاد نالائق ہوئی تو اُلٹی بدنامی ہوتی ہے۔ اور نام چلا بھی تو نام چلنا ہی کیا چیز ہے جس کی تمنّا کی جائے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو اس کی تمنّا کی ہے تو اس سے صرف نام کا چلنا مقصود نہ تھا، بلکہ ان کا مقصود یہ تھا کہ لوگ ہماری اقتدا کریں گے اور ہم کو ثواب ہوگا۔ اسی لیے اس کے ساتھ فرماتے ہیں:

﴿وَاجْعَلْنِیْ مِنْ وَّرَثَۃِ جَنَّۃِ النَّعِیْمِ O﴾ (الشعراء: ۸۵)

اے اللہ! مجھے جنّت کے وارثوں میں کر دیجیے۔

تو اصل نام چلنا تو یہ ہے کہ قیامت میں رسوائی نہ ہو اور وہاں اعمالِ صالحہ کی بدولت علی رؤوس الاشہاد تعریف ہو، اور یہ بات اولاد سے حاصل نہیں ہوتی، بلکہ نیک اعمال سے حاصل ہوتی ہے اس میں کوشش کرنی چاہیے۔ اور یوں کسی کو طبعی طور پر اولاد کی بھی تمنّا ہو تو میں اس کو بُرا نہیں کہتا، کیوں کہ اولاد کی محبّت انسان میں طبعی ہے۔ چناں چہ بعض لوگ جنّت میں بھی اولاد کی تمنّا کریں گے، حالاں کہ وہاں نام کا چلنا بھی مقصود نہ ہوگا، کیوں کہ جنّت کے رہنے والے کبھی فنا ہی نہ ہوں گے، بلکہ وہاں اس تمنّا کا منشا محض طبعی تقاضا ہوگا۔ تو میں اس سے منع نہیں کرتا، میرا مقصود یہ ہے کہ اس طبعی تقاضے کی وجہ سے عورت کی خطا نکالنا کہ تیری اولاد نہیں ہوتی یا لڑکیاں ہی ہوتی ہیں بڑی غلطی ہے۔ اور اس قسم کے غیر اختیاری جرائم نکال کر اُن سے خفا ہونا اور اُن پر زیادتی کرنا ممنوع ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّ يَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ۝﴾ (النساء: ۱۹)

یہ کیسے معاملہ کی بات ارشاد فرمائی ہے، مردوں کو اس میں غور کرنا چاہیے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر تم اپنی بیبیوں سے (کسی بنا پر) کراہت کرتے ہو تو یہ سمجھ لو کہ بہت قریب ممکن ہے کہ تم ایک چیز ناپسند کرتے ہو اور حق تعالیٰ نے اس میں بہت بڑی مصلحت رکھی ہو۔

ایک شبہ کا ازالہ:

شاید کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا ہو کہ اولاد کے ہونے نہ ہونے میں تو مصلحت ہوسکتی ہے (جیسا کہ اوپر کچھ اس کا بیان بھی ہوا ہے)، مگر عورتوں کی بدتمیزی اور زبان درازی کی وجہ سے جو نفرت ہوتی ہے تو اس میں کیا مصلحت ہوسکتی ہے؟ تو اس میں مرد کے لیے کئی مصلحتیں ہوتی ہیں: ایک تو یہ کہ اس کی ایذاؤں پر صبر کرنے سے اس کے درجے بلند ہوتے ہیں۔ دوسرے اس کے مزاج میں تحمّل پیدا ہو جاتا ہے اور بردباری اخلاقِ حمیدہ میں سے ایک اعلیٰ خلق ہے۔

ایک بزرگ کا واقعہ:

حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں رحمہ اللہ کی بی بی بڑی بدمزاج تھیں اور آپ ایسے نازک مزاج تھے کہ ایک دفعہ حضرت کی ایک مریدنی جو بڑھیا تھی ایک رضائی آپ کے لیے سی کر لائی۔ اس وقت آپ لیٹ رہے تھے۔ فرمایا کہ میرے اُوپر ڈال کر چلی جاؤ۔ چناں چہ اس نے آپ کے اوپر ڈال دی۔ صبح کو جو اُٹھے تو آنکھیں سرخ تھیں۔ خدام نے وجہ دریافت کی۔ فرمایا کہ رات نیند نہیں آئی۔ خدام نے کہا: کیا سردی معلوم ہوئی تھی؟ فرمایا: نہیں، سردی تو رضائی سے دفع ہوگئی تھی، مگر رضائی میں نگندے ٹیڑھے پڑے ہوئے تھے، ان کی وجہ سے طبیعت کو اُلجھن رہی اور نیند نہ آئی۔ تو خیال کیجیے کہ رات کو اندھیرے میں منہ لپیٹے ہوئے نگندے نظر نہ آتے تھے، مگر آپ کو اوڑھنے سے ہی اس کا احساس ہوا۔

تو یہ کس قدر لطافتِ مزاج تھی کہ محض کپڑے کے بدن پر پڑنے سے بدوں دیکھے نگندوں کا ٹیڑھا ہونا معلوم ہوگیا۔ پھر اس سے اتنی الجھن ہوئی کہ رات بھر نیند نہ آئی۔ اتنے تو آپ نازک مزاج تھے۔ مگر صبور ایسے کہ بیوی نہایت بدمزاج ملی تھی، جو آپ کو نہایت کوری کوری سناتی تھی اور آپ اس کی سب باتیں سہتے تھے، کبھی طلاق کا خیال نہ کیا۔ نہ اپنی طرف سے کچھ ایذا دی بلکہ اس قدر خاطر داری کرتے تھے کہ صبح کو روزانہ خادم کو بھیجا کرتے کہ بیگم صاحبہ کا مزاج پوچھ کر آئے۔ خادم جاتا اور مرزا صاحب کی طرف سے مزاج پُرسی کرتا اور وہ حضرت کو برملا بُرا بھلا کہتی تھیں۔ خادم یہاں آ کر کچھ عرض نہ کرتا بس اتنا کہہ دیتا کہ حضرت وہ اچھی طرح ہیں۔

ایک مرتبہ کوئی آغا سرحدی خادم تھے۔ ان کو بھی حسبِ معمول بی بی صاحبہ کی مزاج پرسی کے لیے بھیجا گیا۔ اس نے آغا کے سامنے بھی مرزا صاحب کو خوب برا بھلا کہا۔ یہ سرحدی پٹھان تھے، ان کو غصّہ آ گیا اور حضرت سے آ کر عرض کیا کہ وہ تو آپ کو برا بھلا کہتی ہیں۔ پھر آپ ہی اتنی خاطر کیوں کرتے ہیں؟ فرمایا: بھائی! ان کی باتوں کا برا نہ مانو، تمہاری تو وہ بزرگ ہیں۔ اور میں اس لیے اُن کی خاطر کرتا ہوں کہ میری وہ بڑی محسن ہیں۔ مجھ میں یہ سب کمالات

اسی کی بدولت ہیں۔ اللہ اکبر! اتنے نازک مزاج کو بیوی کی بدتمیزیوں سے کتنی ایذا ہوتی ہوگی مگر کمال یہ ہے کہ پھر بھی صبر کرتے ہیں:

شنیدم کہ مردانِ راہِ خدا
دلِ دشمنانِ ہم نہ کردند تنگ
ترا کے میسّر شود ایں مقام
کہ بادوستانت خلاف ست وجنگ

اہل اللہ نے تو دشمنوں کا دل بھی تنگ نہیں کیا۔ افسوس! ہم سے دوستوں کی ایذا بھی برداشت نہیں کی جاتی، جن میں بیوی سب سے زیادہ دوست ہے۔ اس کی ایذا کا بھی ہم سے تحمّل نہیں ہوتا۔ اگر ثواب حاصل کرنے کو تحمّل نہیں کرتے یہی سمجھ کر تحمّل کرلو کہ مجھ سے کوئی گناہ ہوا ہوگا، اس کا اس سے کفارہ ہورہا ہے۔

ایک حکایت:

جیسا لکھنؤ میں ایک مرد وعورت کی میں نے حکایت سنی کہ مرد تو بہت ہی بزرگ تھے اور بیوی بہت ہی بدمزاج تھی۔ ایک دن اُنہوں نے بیوی سے کہا کہ تُو بڑی کم بخت ہے کہ تجھے میرے پاس رہتے ہوئے اتنا زمانہ گزرگیا اور اب تک تیری اصلاح نہیں ہوئی۔ تو بیوی نے کہا: میں کم بخت کیوں ہوتی، مجھ سے زیادہ تو کوئی بھی سعادت مند نہ ہوگی کہ مجھے تم جیسا مرد ملا۔ کم بخت تو تم ہو کہ تم کو ایسی عورت ملی۔

دوسری حکایت:

اسی طرح کتابوں میں ایک مرد وعورت کی حکایت لکھی ہے کہ مرد تو نہایت حسین تھا اور عورت نہایت بدصورت، اور اس کے ساتھ وہ بدمزاج بھی تھی۔ آج کل ایسا ہو تو مرد ایک ہی دن میں طلاق دے کر الگ ہوجائے۔ مگر وہ اللہ کا بندہ اس کی سب باتوں پر صبر کرتا تھا۔ کسی نے اس سے کہا کہ تم اس بیوی کو طلاق کیوں نہیں دے دیتے؟ کہا: نہیں، میں طلاق کیوں کردے دوں؟ بات یہ ہے کہ مجھ سے کوئی گناہ ہوگیا تھا، خدا نے اس کی سزا میں مجھے ایسی بیوی

دے دی اور اس سے کوئی نیک کام ہو گیا ہو گا اس کے صلہ میں خدا نے اس کو مجھ جیسا حسین مرد دیا، تو میں اس کا ثواب ہوں اور وہ میرا عذاب ہے، پھر طلاق کی کیا وجہ؟

تو بزرگوں نے اپنے دلوں کو یوں سمجھا لیا ہے اور کبھی عورتوں کی بدعنوانیوں سے ان کو اپنے سے الگ نہیں کیا اور ہمیشہ تحمّل فرماتے رہے۔ تو اگر بیوی کی واقعی خطا بھی ہو جب بھی اس سے درگذر کرنا چاہیے۔ اس تحمّل سے دین کا بڑا بھاری نفع ہوتا ہے اور بہت اجر ملتا ہے۔

بعضے مرد اس طرح عورتوں کا حق ضایع کرتے ہیں کہ بے حمیّت بن کر اپنے آپ کو راحت دیتے ہیں۔ عمدہ کھاتے اور پہنتے ہیں اور بیوی بچوں کو تکلیف میں رکھتے ہیں۔ ان کے بارے میں شیخ سعدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ببیں آن بے حمیّت را ہرگز
نخواہد دید روئے نیک بختی
تن آسانی گزیند خویشتن را
زن وفرزند بگذارد بسختی

یہ بہت ہی بے غیرتی کی بات ہے کہ مرد تو خود بنا ٹھنا رہے اور بیوی کو بھنگنوں کی طرح رکھیکہ نہ اس کے کپڑے کا خیال ہے، نہ کھانے کا۔ حالانکہ زینت وآرایش کی مستحق زیادہ تر عورت ہے۔ مردوں کو زینت زیبا نہیں ہے۔ بعضے مرد ایسی گندی طبیعت کے ہوتے ہیں کہ فاحشہ عورتوں میں آوارہ پھرتے ہیں اور ان کے گھروں میں حور کی مانند بیویاں موجود ہوتی ہیں، مگر وہ بے کار پڑی رہتی ہیں ان کی طرف رُخ بھی نہیں کیا جاتا۔ اور ہندوستان کی عورتیں صابر وشاکر ہیں کہ وہ سوائے رونے دھونے کے اور کچھ نہیں کرتیں۔ کسی سے اپنے مرد کا بھید بھی نہیں کھولتیں۔

ایک تحصیل دار کا واقعہ:

اس پر ایک قصّہ یاد آیا کہ بھوپال میں ہمارے وطن کے ایک بزرگ تھے جو تحصیل دار بھی تھے، اور اُن کی بیوی بہت ہی مُسرِف [1] اور کم عقل تھی۔ مگر تحصیل دار صاحب کی یہ حالت تھی کہ

[1] یعنی فضول خرچ۔

جب اس کی باتیں بیان کرتے تو یوں کہا کرتے تھے کہ میری باولی کی یہ بات ہے، آج میری باولی نے یوں کہا۔ غرض میری باولی کہہ کر نام لیتے تھے۔ کسی نے کہا: حضرت! آپ تو اپنی بیوی سے بہت ہی محبّت کرتے ہیں، حالانکہ وہ بہت ہی بے تمیز اور تکلیف دہ ہے۔ فرمایا کہ بھائی! شریف عورتوں میں جہاں بہت سے نقائص ہیں وہاں ایک جوہر ایسا ہے کہ اگر ان کو ایک کونے میں بٹھلا کر کوئی سفر میں چلا جائے اور بیس برس کے بعد آوے تو اُسی کونے میں ساتھ آبرو وعزت کے بیٹھا پاوے گا۔ اس خوبی کی وجہ سے میں اس کی قدر کرتا ہوں۔

شرعی پردہ کی برکت سے ہی عورت پاک دامن رہ سکتی ہے:

واقعی ہمارے ملک کی تو بیبیاں اکثر ایسی ہی ہیں کہ ان کو اپنے کونے کے سِوا دنیا کی کچھ خبر نہیں ہوتی، چاہے اُن پر کچھ ہی گزر جائے مگر اپنے کونے سے الگ نہیں ہوتیں۔ بس ان کی وہ شان ہے جو حق تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے: ﴿الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ﴾ یعنی پاک دامن ہیں اور بھولی ہیں، چالاک نہیں ہیں۔ اس میں **غافلات** کا لفظ ایسا پیارا معلوم ہوتا ہے کہ واقعی نقشہ کھینچ دیا اور یہ صفت عورتوں کے اندر پردے کی وجہ سے ہوتی ہے کہ ان کو اپنی چار دیواری کے سِوا دنیا کی کچھ خبر نہیں ہوتی۔ جس کو آج کل کہا جاتا ہے کہ عورتوں کے پردے نے مسلمانوں کا تنزل کر دیا، کیوں کہ عورتوں کو قید میں رہنے کی وجہ سے دنیا کی کچھ خبر نہیں ہوتی، نہ صنعت وحرفت سیکھتی ہیں، نہ علوم وفنون سے آگاہ ہیں۔ بس کمانے کا سارا بوجھ مردوں پر رہتا ہے۔ دوسری قوموں کی عورتیں خود بھی صنعت وحرفت سے کماتی رہتی ہیں۔

تو صاحبو! میں کہتا ہوں کہ حق تعالیٰ نے عورتوں کو موقعِ مدح میں ''بے خبر'' فرمایا ہے، تو ہزار خبرداریاں اس بے خبری پر قربان ہیں۔ جب حق تعالیٰ عورتوں کے بھولے پن اور بے خبری کی تعریف فرماتے ہیں تو سمجھ لو، اس میں خیر ہے اور اس خبرداری میں خیر نہیں جس کو تم تجویز کرتے ہو۔ تجربہ خود بتلا دے گا۔ اور جو قرآن کو نہ مانے گا اسے زمانہ ہی خود بتلا دے گا۔ تمام دنیا کی قومیں اس پر متفق ہیں کہ قرآن کے برابر کسی کتاب کی تعلیم نہیں، تو قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ عورتوں کے لیے غافل و بے خبر ہونا ہی اچھا ہے۔ یہ صفت ہمارے ملک کی عورتوں میں بے

نظیر ہے کہ خاوند کے کونے سے الگ ہونا ان کو گوارا نہیں ہوتا۔

ایک واقعہ:

میری ایک تائی تھیں (یعنی بڑی چچی) وہ جوانی ہی میں بیوہ ہوگئی تھیں، مگر ساری عمر خاوند ہی کے کونے میں گزاردی۔ اخیر میں ان کی بہت عمر ہوگئی تھی، نگاہ بھی کم ہوگئی تھی، پاس کوئی رہنے والا بھی نہ تھا مگر اپنے کونے سے الگ نہ ہوتی تھیں۔ وہ مجھے بہت چاہتی تھیں۔ میں نے ہر چند اصرار کیا کہ تم میرے گھر میں آجاؤ، یہاں اکیلی پڑی ہوئی کیا لیتی ہو؟ تو یہ فرمایا کہ بچے! جہاں ڈولی آئی تھی وہیں سے کھٹولی نکلے گی۔ میں نے کہا کہ اگر تم یہی چاہتی ہو تو مرنے کے بعد تمہارا پلنگ اسی گھر میں لے آئیں گے، پھر یہاں سے نکال لیں گے۔ مگر صاحب! انہوں نے ایک نہ سنی اور تمام عمر وہیں رہیں اور اپنے حد اختیار تک وہاں سے جدا نہ ہوئیں۔ پھر جب سخت مریض ہوگئیں تو اس حالت میں ہم لوگ ان کو اپنے گھر اُٹھا لائے، کیوں کہ اُن کا مکان ذرا دُور تھا ہر وقت نگہداشت مشکل تھی، اور مکان اتنا وسیع نہ تھا جس میں اور مستورات جاکر رہ سکتیں۔

خوبیوں کا مقتضیٰ:

تو واقعی ہمارے ملک کی عورتوں میں جہاں بے تمیزی وغیرہ ہے، وہاں یہ خوبیاں بھی تو ہیں، ان کو بھی تو دیکھنا چاہیے:

عیبِ اُو جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو

(تعلیم یافتہ قوموں کی عورتوں میں جو خوبیاں سلیقہ وتمیز کی بیان کی جاتی ہیں وہ تو مکتسب امور ہیں، جو دوسری عورتیں بھی تعلیم سے حاصل کرسکتی ہیں۔ اور اس ملک کی عورتوں میں جو خاص خوبیاں ہیں وہ فطری ہیں کہ تعلیم وغیرہ سے حاصل نہیں ہوسکتیں) اور ان خوبیوں کا مقتضیٰ یہ ہے کہ بیبیوں پر رحم کرو اور ان سے بے پروائی اختیار نہ کرو۔ اور بڑی بات یہ ہے کہ وہ تمہاری خادم ہیں، طرح طرح سے تم کو آرام پہنچاتی ہیں اور:

آں را کہ بجائے تست ہردم کرمے
عذرش بنہ اگر کند بہ عمرے ستمے

جس نے سو دفعہ آرام پہنچایا ہو اس کے ہاتھ سے ایک دفعہ تکلیف بھی پہنچ جائے تو اُس کو زبان پر نہ لانا چاہیے۔

پیرانی صاحبہ کا واقعہ:

ہماری پیرانی صاحبہ اخیر میں بہت معذور ہوگئی تھیں۔ تو حضرت کی ایک خادمہ گھر کے کاروبار کے لیے یہاں سے مکّہ معظّمہ پہنچ گئیں اور سارا کام اپنے ذمہ لے لیا۔ مگر وہ خادمہ بڑی تند مزاج تھیں، پیرانی صاحبہ سے لڑا کرتی تھیں۔ ایک دفعہ میرے گھر میں پیرانی صاحبہ سے حضرت کہنے لگے کہ یہ آپ سے لڑتی ہیں اور آپ ان کو کچھ نہیں فرماتیں، نہ گھر سے الگ کرتی ہیں؟ تو فرمایا کہ یہ راحت بھی بہت دیتی ہیں۔ اور جو شخص راحت بہت دیتا ہو اس کی بے عنوانیوں پر صبر نہ کرنا بے مروتی ہے، اس لیے جب مجھ کو یہ ستاتی ہیں تو میں ان کی راحتوں کو یاد کر کے سب معاف کر دیتی ہوں۔ حضرت پیرانی صاحبہ نہایت خلیق اور بہت ہی عالی فہم تھیں۔

صاحبو! ایک بی بی اتنی فہیم تھیں تو ہم کو مرد ہو کر ضرور فہم سے کام لینا چاہیے۔ اور اپنی بیبیوں کی راحت رسانی پر نظر کر کے ان کی بے تمیزیوں کا تحمّل کرنا چاہیے۔

عورتوں کے دینی و دنیوی حقوق کی طرف توجہ دینی چاہیے:

یہ عورتوں کے حقوق دنیویہ ہیں۔ اور اس سے پہلے جو حقوق بیان ہوئے وہ دینی حقوق تھے۔ افسوس! ہم دینی حقوق تو کیا ادا کرتے دنیوی حقوق پر بھی ہم کو توجہ نہیں۔ چناں چہ نہ بیوی کی نماز پر توجہ ہے نہ روزہ پر۔ ان باتوں کو ہم ان کے کاموں میں ڈالتے ہی نہیں۔

یاد رکھو! قیامت میں تم سے اس کی باز پرس ہوگی کہ تم نے بیوی بچوں کو دین دار بنانے کی کتنی کوشش کی تھی۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ نماز کے لیے ان پر حد سے زیادہ سختی کرو اور ہر وقت ہاتھ میں لٹھ ہی لیے رہو۔ بلکہ اول نرمی سے سمجھاؤ، پھر برتاؤ میں ذرا ناراضی اور رنج ظاہر کرو اِن شاء اللہ اس کا اچھا اثر ہوگا۔ اور اُن کو اردو میں دینی رسالے پڑھاؤ لکھاؤ، اس سے ان کے اخلاق بھی درست ہو جائیں گے اور دین کا خیال خود بخود ہوگا۔ اور پڑھنے پر آمادہ نہ ہوں تو یوں کرو۔

عورتوں کو دِین سکھانے کا طریقہ:

اس صورت کے لیے میں نے بہت جگہ یہ طریقہ بتلایا ہے کہ تم ایک وقت مقرر کر کے اوّل سے اخیر تک بہشتی زیور سارا سنا دو۔ اور پہلے پہل بی بی سے یہ بھی نہ کہو کہ یہاں بیٹھ کر سنو، بلکہ خود بلند آواز سے پڑھنا شروع کرو گے اِن شاء اللہ وہ خود شوق سے آ کر سنے گی۔ چناں چہ اسی طرح عمل کرنے سے فوراً ساری شکایتیں جاتی رہیں گی۔ عورتوں کے دل پر اثر بہت جلدی ہوتا ہے، اگر ان کو دین کی کتابیں سنائی جائیں تو ان شاء اللہ بہت جلد اصلاح ہو جائے گی۔

مرد اپنی بیبیوں کی شکایتیں تو کرتے ہیں کہ ایسی بے تمیز اور ایسی جاہل ہیں، مگر وہ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر تو دیکھیں کہ انہوں نے ان کے ساتھ کیا برتاؤ کیا؟ بس یہ اپنی راحت ہی کے اُن سے طالب ہیں اور اُن کے دین کا ذرا بھی خیال نہیں کیا جاتا۔ ایک شخص نے کیا خوب کہا ہے کہ مقرب کی بے تمیزی اور بے وفائی بادشاہ کی بے تمیزی یا غفلت کی دلیل ہے۔ تو عورتوں کی خطا ہے ہی، مگر ان کی بے تمیزی میں مردوں کی بھی خطا ہے کہ یہ اُن کے دین کی درستی کا اہتمام نہیں کرتے اور اُن کے دینی حقوق کو تلف کرتے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجلاس میں ایک مقدمہ:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجلاس میں ایک باپ اور بیٹے کا مقدمہ پیش ہوا۔ باپ نے بیٹے پر دعویٰ کیا تھا کہ یہ میرے حقوق ادا نہیں کرتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لڑکے سے جواب طلب کیا۔ اس نے کہا: حضور! کیا باپ ہی کے حقوق بیٹے پر ہیں یا بیٹے کا بھی باپ پر کچھ حق ہے؟ آپ نے فرمایا کہ بیٹے کا حق بھی باپ پر ہے۔ ایک یہ کہ شریف عورت سے نکاح کرے کہ اولاد اچھی ہو اور نام اچھا رکھے کہ اس کی برکت ہو، اور اس کو علمِ دین سکھائے۔ وہ بولا کہ ان سے دریافت کیا جائے کہ انہوں نے باپ ہو کر میرے کیا حقوق ادا کیے ہیں؟ ایک حق تو انہوں نے یہ ادا کیا کہ میری ماں لونڈی تھی، جن کے اخلاق جیسے ہوتے ہیں معلوم ہے۔ دوسرا یہ حق ادا کیا کہ میرا نام جُعل رکھا جس کے معنی ہیں گُوہ کا کیڑا۔ تیسرا حق یہ کہ مجھ کو ایک بھی دین کی بات

نہیں سکھلائی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مقدمہ خارج کردیا اور باپ سے فرمایا: تُو نے اس سے زیادہ اس کی حق تلفی کی ہے۔ جاؤ اپنی اولاد کے ساتھ ایسا برتاؤ نہ کیا کرو۔

اسی طرح ہماری حالت ہے کہ ہم بیویوں کی شکایت تو کرتے ہیں، مگر یہ نہیں دیکھتے کہ ہم نے بیویوں کا کون سا حق ادا کیا ہے۔ چناں چہ ان کا ایک حق یہ تھا کہ ان کے دین کا خیال کرتے، ان کو احکامِ الٰہیہ بتلاتے۔ دوسرا حق یہ تھا کہ معاشرت میں ان کے ساتھ دوستانہ برتاؤ کرتے، باندیوں اور نوکروں کا سا برتاؤ نہ کرتے، مگر ہم نے سب حقوق ضایع کردیے۔

عورتوں کی کوتاہیاں اور غلطیاں:

اب رہ گئیں عورتیں، ان سے بھی دو قسم کی کوتاہیاں ہوتی ہیں: ایک کوتاہی تو وہ دنیوی حقوق میں کرتی ہیں۔ وہ یہ کہ بعض عورتیں خاوندوں کی اطاعت وخدمت میں کمی کرتی ہیں۔ بعض عورتیں مرد کی خدمت ماماؤں پر ڈال دیتی ہیں خود اس کے کاموں کا اہتمام نہیں کرتیں۔ بعض عورتیں مردوں سے خرچ بہت مانگتی ہیں۔ چناں چہ ایک بی بی کہتی ہے کہ ہماری حالت تو دوزخ کی سی ہے، جیسے اس کا پیٹ نہیں بھرتا ہر دم هَلْ مِنْ مَزِيدٍ؟ ہی کہتی رہتی ہے، اسی طرح روپے، کپڑے، زیور وغیرہ سے ہمارا پیٹ ہی نہیں بھرتا۔ کتنا ہی دو، مگر سب خرچ ہوجاتا ہے۔

ایک لطیفہ:

مولوی عبدالرب صاحب واعظ دہلوی کا ایک لطیفہ ہے کہ عورتوں کے پاس چاہے کتنے ہی کپڑے ہوں، مگر جب پوچھو یہی کہیں گی کہ کیا ہیں دو چیتھڑے۔ اور جوتوں کے دو چار جوڑے دھرے ہوں گے، مگر جب پوچھو یہی کہیں گی کہ کیا ہے دو لیتھڑے۔ اور برتنوں کے کتنے ہی صندوق بھرے ہوں گے، مگر یہی کہیں گی کہ کیا ہے دو ٹھیکرے۔ انہوں نے تو قافیہ بھی ملایا ہے۔ مگر حقیقت میں ہے یہی حالت۔ ان کا زیور، کپڑے اور برتنوں سے کبھی جی نہیں بھرتا۔ اور ہمیشہ اپنی چیز کو کم ہی بتلائیں گی کہ میرے پاس کیا ہے، کچھ بھی نہیں۔ ناشکری کا مادہ ان میں بہت زیادہ ہے۔

ایک حدیث:

حدیث میں بھی عورتوں کی اس صفت کا ذکر آیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار عورتوں کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا:

تَكْثُرْنَ اللَّعْنَ وَتَكْفُرْنَ الْعَشِيْرَ.

تم لعنت اور پھٹکار بہت کرتی ہو اور خاوند کی ناشکری کرتی ہو۔

دوسری حدیث:

ایک حدیث میں ہے: اگر تم عورت کے ساتھ عمر بھر احسان اور بھلائی کرتے رہو، پھر کبھی کوئی بات اس کے خلافِ مزاج ہو جائے تو صاف یوں کہے گی:

مَا رَأَيْتُ مِنْكَ خَيْرًا قَطُّ.

میں نے تجھ سے کبھی بھلائی نہیں دیکھی۔

ساری عمر کے احسان کو ایک منٹ میں بھلا دیتی ہیں۔ بعض عورتیں یہ کرتی ہیں کہ وہ خاوند کے گھر میں آتے ہی ماں باپ سے اس کو جدا کرنا چاہتی ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ اس زمانے میں مناسب یہی ہے کہ نکاح ہوتے ہی جوان اولاد ماں باپ سے علیحدہ علیحدہ رہیں، اس میں جانبین کو راحت ہوتی ہے۔

میرٹھ کا ایک گھرانہ:

میں نے میرٹھ کے ایک گھرانے کی حالت دیکھی کہ ان میں باہم ہمیشہ لڑائی رہتی تھی۔ اس گھر کے ایک مرد کو مجھ سے تعلّق تھا۔ اُن کا خط میرے پاس آیا جس میں دو شکایتیں لکھی تھیں: ایک یہ کہ میں اپنے گھر کے مردوں اور عورتوں کو دین کی باتیں بتلاتا ہوں، وہ مانتے نہیں ہیں۔ دوسری شکایت یہ لکھی تھی کہ گھر میں روزانہ لڑائی رہتی ہے۔ میں نے لکھا آپ کی دونوں شکایتوں کا علاج اس شعر میں ہے:

کارِ خود کن کارِ بے گانہ مکن

اپنا کام کرو (اور) غیروں کے کام میں (ایسے) نہ پڑو کہ اپنا کام بھی چھوٹ جائے۔

اس مصرعہ میں تو اس کا جواب ہے کہ وہ دین کی باتیں سن کر عمل نہیں کرتے۔ سو اس کے متعلق دستور العمل یہ رکھو کہ تم نصیحت کر کے اپنے کام میں لگو۔ آگے وہ جانیں اُن کا کام، تم کیوں فکر میں پڑے؟ اور دوسری شکایت کا جواب اس مصرعہ میں ہے ؂

در زمینِ دیگراں خانہ مکن

دوسرے کی جگہ میں گھر نہ بناؤ۔

کہ غیر کی زمین میں گھر نہ بساؤ۔ میں نے لکھا کہ تم اسی وقت کوئی مکان کرایہ پر لے کر الگ رہنے لگو۔ چناں چہ انہوں نے اس پر عمل کیا اور الگ مکان میں رہنے لگے، بس اُسی روز سے امن وامان ہو گیا۔ اُن کے والد صاحب بہت بھولے ہیں وہ کہتے تھے کہ آپس میں چھری کٹاری چلے، مگر سب ایک ہی جگہ رہیں۔ مگر آج کل میں اس رائے کے خلاف ہوں۔ میری رائے یہ ہے کہ نکاح کے بعد اولاد کی اور ماں باپ کی معاشرت الگ الگ ہونی چاہیے، تو ہر چند کہ مناسب یہی ہے، مگر جدا ہونے کا بھی تو طریقہ ہے۔ بے طریقہ عورت کو جدا کرنے کا کیا حق ہے۔

بعض عورتوں کی یہ عادت ہے کہ وہ خاوند کے ساتھ زبان درازی سے پیش آتی ہیں، اس کے سامنے خاموش ہی نہیں ہوتیں، حتیٰ کہ بعض خاوند مارتے بھی ہیں، مگر یہ چُپ نہیں ہوتیں۔

ایک حکایت:

مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک عورت ایسی ہی زبان دراز تھی اور اس کا خاوند اس کو بہت مارتا تھا۔ یہ عورت ایک بزرگ کے پاس گئی کہ مجھے ایسا تعویذ دے دیجئے جس کے اثر سے میرا خاوند مجھے مارا نہ کرے۔ وہ بزرگ تھے بہت عاقل، وہ سمجھ گئے کہ یہ زبان درازی کرتی ہوگی اس لیے پٹتی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اچھا! تم تھوڑا پانی لے آؤ، میں اسے پڑھ دوں گا۔ چناں چہ پڑھ دیا اور فرمایا کہ جب خاوند غصّہ ہُوا کرے تو اس میں سے ایک چُلّو منہ میں گھونٹ لے کر بیٹھ جایا کرو، ان شاء اللہ تعالیٰ پھر نہیں مارے گا۔ چناں چہ وہ ایسا ہی کرتی اور منہ میں

گھونٹ لے کر بیٹھ جایا کرتی۔ اب ساری زبان درازی جاتی رہی، بے چاری بولے کیوں کر، منہ کو تو تالا لگ گیا۔ آخر تھوڑے دنوں میں میاں راضی ہو گیا۔ حقیقت میں خوب علاج کیا۔ غرض عورتوں میں زبان درازی کا بڑا مرض ہے اور یہ ساری خرابی تکبّر کی ہے۔ عورتیں یہ چاہتی ہیں کہ ہم ہاریں نہیں تا کہ ہیٹی نہ ہو۔ چناں چہ شوہر سے لڑ کر اپنی ہمجولیوں میں بیٹھ کر فخر کرتی ہیں کہ دیکھا! ہم کیسا مرد کو بہکا کر آئے ہیں۔

مردوں اور عورتوں میں قُدرتی فرق:

حالانکہ مردوں اور عورتوں میں قدرتی فرق ہے۔ یہ کسی طرح مردوں کی برابری نہیں کر سکتیں۔ عقل ان میں کم، برداشت کی قوت ان میں کم، قویٰ ان کے کمزور، اس لیے یہ جلدی ضعیف بھی ہو جاتی ہیں۔ جب خدا نے تم کو ہر بات میں مردوں سے کم رکھا ہے تو آخر کس بات میں تم مساوات کی مدعی ہو۔ اور آج کل بعض قومیں مساوات کی بہت مدعی ہیں، وہ عورتوں کو مردوں کے برابر کرنا چاہتے ہیں، مگر کسی نے کر تو نہ لیا۔ چناں چہ آج کل اس دعوائے مساوات کی بنا پر عورتیں پارلیمنٹ کی ممبری کا دعوی کر رہی ہیں، مگر کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ اب وہ سارے دعوے جاتے رہے۔ بھلا کہیں قدرتی فرق بھی کسی کے مٹانے سے مٹ سکتا ہے؟ اور اگر ایسا کیا بھی گیا اور عورتوں کو مردوں کے برابر سب عہدے دے بھی دیے گئے۔ مگر ظاہر ہے کہ اس کے لیے عورتوں کو لیاقت بھی حاصل کرنی پڑے گی۔ علوم و فنون بھی حاصل کرنے ہوں گے اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اولاد کا سلسلہ بند ہو جائے گا۔ کیوں کہ میں نے ایک امریکن ڈاکٹر کا قول دیکھا ہے کہ عورت کو زیادہ تعلیم دینے کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اس کے اولاد نہیں ہوتی یا ہوتی ہے تو کمزور ہوتی ہے (جو جلد مر جاتی ہے) تو قدرتی طور پر عورتوں کے قوائے دماغیہ زیادہ تعلیم کے متحمل نہیں ہیں۔

عورتوں کا مردوں کے ساتھ برابری کا دعوی غلط ہے:

جب یہ بات ہے تو قدرتی طور پر مردوں اور عورتوں میں مساوات نہیں ہو سکتی۔ پھر نہ معلوم عورتوں کو برابری کا دعوی کیوں ہے؟ تم مردوں کے سامنے اتنی چھوٹی ہو کہ حدیث میں

سیدنا رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ اگر میں خدا کے سوا کسی کے لیے سجدہ کرنے کی اجازت دیتا تو عورت کو حکم کرتا کہ اپنے خاوند کو سجدہ کیا کرے۔ کچھ ٹھکانہ ہے مرد کی عظمت کا کہ اگر خدا کے بعد کسی کے لیے سجدہ جائز ہوتا تو عورت کو مرد کے سجدہ کا حکم ہوتا۔ مگر اب عورتیں مردوں کی یہ قدر کرتی ہیں کہ ان کے ساتھ زبان درازی اور مقابلہ سے پیش آتی ہیں۔ اگر تم یہ کہو کہ صاحب مرد کے غصّہ سے ہم کو بھی غصّہ آجاتا ہے، تو سمجھو کہ غصّہ ہمیشہ اپنے چھوٹے یا برابر پر آیا کرتا ہے۔ اور جس کو آدمی اپنے سے بڑا سمجھا کرتا ہے، اس پر کبھی نہیں آیا کرتا۔ چناں چہ نوکر کو آقا پر غصّہ نہیں آسکتا۔ اسی طرح رعیت کے آدمی کو حاکم پر غصّہ نہیں آتا۔ بیٹے کو باپ پر غصّہ نہیں آسکتا، چاہے وہ اس پر کتنا ہی غصّہ کرے، کیوں کہ یہ اس کو اپنے سے بڑا سمجھتا ہے۔ پس تمہارا یہ عذر ہی خود ایک جرم کو بتلا رہا ہے۔ ''عذرِ گناہ بدتر از گناہ'' اسی کو کہتے ہیں۔

بیبیو! تم کو مرد کے غصّہ سے غصّہ آنا یہ بتلاتا ہے کہ تم اپنے کو مرد سے بڑا یا برابر کے درجہ کا سمجھتی ہو اور یہ خیال ہی سرے سے غلط ہے۔ اگر تم اپنے کو مرد سے چھوٹا اور محکوم سمجھو تو چاہے وہ کتنا ہی غصّہ کرتا، تم کو ہرگز غصّہ نہ آسکتا۔ پس تم اس خیالِ فاسد کو اپنے دل سے نکال دو اور جیسا خدا نے تم کو بنایا ہے ویسا ہی اپنے کو مرد سے چھوٹا سمجھو اور اس کے غصّہ کے وقت زبان درازی کبھی نہ کرو، اُس وقت خاموش رہو۔ اور جب اُس کا غصّہ اتر جائے تو دوسرے وقت کہو کہ میں اُس وقت بولی نہ تھی اب بتلاتی ہوں کہ تمہاری فلاں بات بے جا تھی یا زیادتی کی تھی۔ اس طرح کرنے سے بات بھی نہ بڑھے گی اور مرد کے دل میں تمہاری قدر بھی ہوگی۔ تو عورتیں ایک کوتاہی تو یہ کرتی ہیں۔

عورتوں کی دوسری کوتاہی:

اور ایک کوتاہی یہ کرتی ہیں کہ خاوند کے مال کو بڑی بے دردی سے اڑاتی ہیں، خاص کر شادی بیاہ کی خرافات رسموں میں اور شیخی کے کاموں میں۔ بعضے جگہ تو مرد و عورت دونوں مل کر خرچ کرتے ہیں اور بعض جگہ صرف عورتیں ہی خرچ کی مالک ہوتی ہیں۔ پھر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مرد رشوت لیتا ہے یا مقروض ہوتا ہے۔ تو زیادہ تر مرد جو حرام آمدنی میں مشغول ہیں اس

کا بڑا سبب عورتوں کی فضول خرچی ہے۔ مثلاً گھر میں شادی ہوئی تو یہ فرمائش ہوتی ہے کہ قیمتی جوڑا ہونا چاہیے۔ اب وہ سو دو سو روپے میں تیار ہوتا ہے۔ مرد نے سمجھا تھا کہ خیر سو دو سو ہی میں پاپ کٹا۔ مگر بیوی نے کہا کہ یہ تو شاہانہ جوڑا ہے۔ چوتھی بھوڑے کا الگ ہونا چاہیے، وہ بھی اسی کے قریب لاگت میں تیار ہوا۔ پھر فرمائش ہوتی ہے کہ جہیز میں دینے کو بیس پچیس جوڑے اور ہونے چاہییں۔

غرض کپڑے ہی کپڑے میں سینکڑوں روپے لگ جاتے ہیں۔ جہیز میں اس قدر کپڑے دیے جاتے ہیں کہ ایک بار میں ضلع میرٹھ کے ایک گاؤں میں گیا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہاں ایک بہو صرف کپڑا پندرہ سو روپے کا لائی ہے۔ برتن اور زیور اور لچکے گوٹے اس سے الگ تھے۔ میں نے بعض گھروں میں دیکھا ہے کہ جہیز میں اتنے کپڑے دیے گئے تھے کہ لڑکی ساری عمر بھی پہنے تو ختم نہ ہوں۔ اب وہ کیا کرتی ہے، اگر سخی ہوئی تو منہ ملاقات کی جگہ بانٹنا شروع کر دیا۔ ایک جوڑا کسی کو دیا، ایک کسی کو۔ اور بخیل ہوئی تو صندوق میں بند کر کے رکھ لیے۔ پھر بہت سے جوڑوں کو تو پہننا بھی نصیب نہیں ہوتا، وہ یوں ہی رکھے رکھے گل جاتے ہیں۔

غرض اس فضول خرچی کے ساتھ عورتیں خاوند کا مال برباد کرتی ہیں۔ بھلا جہیز میں اتنے کپڑے دینے کی کیا ضرورت ہے؟ مگر کیوں کر نہ دیں۔ اس میں نام بھی ہوتا ہے کہ فلانی نے اپنی بیٹی کو ایسا جہیز دیا اور اتنا اتنا دیا، بس شیخی کے واسطے مرد کا گھر برباد کر دیا جاتا ہے۔

عُقلا کا طرز اور ایک حکایت:

میں نے ایک تعلّق دار کی حکایت سنی جو بہت بڑے مال دار ہیں کہ انہوں نے اپنی لڑکی کا نکاح کیا اور جہیز میں صرف ایک پالکی دی اور ایک قالین اور ایک لوٹا اور ایک قرآن مجید۔ اس کے سوا کچھ نہ دیا، نہ برتن، نہ کپڑے۔ بلکہ اس کے بجائے ایک لاکھ روپے کی جائیداد بیٹی کے نام کر دی اور کہا کہ میری نیت اس شادی میں ایک لاکھ روپیہ خرچ کرنے کی تھی اور یہ رقم اس کے واسطے پہلے ہی تجویز کر لی تھی۔ خیال تھا کہ خوب دھوم دھام سے شادی کروں گا، مگر پھر میں نے سوچا کہ اس دھوم دھام سے میری بیٹی کو کیا نفع ہوگا؟ بس لوگ کھا پی کر چل دیں گے،

میرا روپیہ برباد ہوگا اور بیٹی کو کچھ حاصل نہ حصول۔ اس لیے میں نے ایسی صورت اختیار کی جس سے بیٹی کو نفع پہنچے اور جائیداد سے بہتر اس کے لیے نفع کی کوئی چیز نہیں۔ اس سے وہ اور اس کی اولاد پشتہا پشت تک بے فکری سے عیش کرتے رہیں گے۔ اور اب کوئی مجھے بخیل اور کنجوس بھی نہیں کہہ سکتا، کیوں کہ میں نے دھوم دھام نہیں کی تو رقم اپنے گھر میں بھی نہیں رکھی۔

دیکھو! یہ ہوتا ہے عُقَلا کا طرز۔ اگر خدا کسی کو دے تو بیٹی کے جہیز میں بہت دینا برا نہیں، مگر طریقے سے ہونا چاہیے جو لڑکی کے کام بھی آوے، مگر عورتوں کو کچھ نہیں سوجھتا۔ یہ تو ایسی بے ہودہ ترکیبوں سے روپیہ برباد کرتی ہیں جن سے اُن کو کچھ وصول ہوتا ہے، نہ لڑکی کو۔ یہ وہ کوتاہیاں ہیں جو عورتیں دینوی حقوق میں کرتی ہیں۔ مگر یہ ظاہر میں دنیا ہے اور واقع میں سب دین ہے۔ کیوں کہ شریعت نے مرد کے مال کی حفاظت اور اس کی تعظیم وخدمت عورتوں کے ذمہ لازم سمجھی ہے، اگر وہ اس میں کوتاہی کریں گی تو ان سے باز پرس ہوگی۔

عورتیں مرد کو دِین دار بنا سکتی ہیں:

ایک کوتاہی دینی حقوق میں کرتی ہیں کہ مرد کو جہنّم کی آگ سے بچانے کا اہتمام نہیں کرتیں۔ یعنی اس کی کچھ پرواہ نہیں کرتیں کہ مرد ہمارے واسطے حلال وحرام میں مبتلا ہے اور کمانے میں رشوت وغیرہ سے باک نہیں کرتا، تو اس کو سمجھائیں کہ تم حرام آمدنی مت لیا کرو، ہم حلال ہی میں اپنا گذر کرلیں گے۔ علیٰ ہذا اگر مرد نماز نہ پڑھتا ہو تو اس کو مطلق نصیحت نہیں کرتیں، حالانکہ اپنی غرض کے لیے اس سے سب کچھ کرا لیتی ہیں۔ اگر عورت مرد کو دِین دار بنانا چاہے تو اس کو کچھ مشکل نہیں، مگر اس کے لیے ضرورت اس کی ہے کہ پہلے تم دِین دار بنو، نماز اور روزہ کی پابندی کرو، پھر مرد کو نصیحت کرو تو ان شاء اللہ اثر ہوگا۔

عورتوں کو اعتدال سے کام لینا چاہیے:

مگر بعضے عورتیں دین داری پر آتی ہیں تو یہ طریقہ اختیار کرلیتی ہیں کہ تسبیح اور مُصلّٰی لے کر بیٹھ گئیں اور گھر کو ماماؤں پر ڈال دیا۔ یہ طریقہ بھی اچھا نہیں۔ کیوں کہ گھر کی نگہبانی اور خاوند کے مال کی حفاظت عورت کے ذمہ فرض ہے، جس میں اس صورت سے بہت خلل واقع

ہوتا ہے۔ اور جب فرض میں خلل آ گیا تو یہ نفلیں اور تسبیحیں کیا نفع دیں گی؟ اس لیے دین داری میں اتنا غلو بھی نہ کرو کہ گھر کی خبر ہی نہ لو۔ نماز، روزہ اس طرح کرو کہ اس کے ساتھ گھر کا بھی پورا حق ادا کرو اور تمہارے واسطے یہ بھی دین ہی ہے کہ تم کو گھر کے کام کاج میں بھی ثواب ملتا ہے (اگر اس نیت سے کرو کہ میں حق تعالیٰ کے حکم کا امتثال کرتی ہوں، کیوں کہ حق تعالیٰ نے گھر کی حفاظت اور خبر گیری میرے ذمہ کی ہے)۔ ہاں! گھر کے کاموں میں ایسی منہمک نہ ہو کہ دین کو چھوڑ دو۔

بس اعتدال سے کام لو کہ دین کے ضروری کام بھی ادا ہوتے رہیں اور گھر کا کام بھی نگاہ کے سامنے نکلتا رہے۔ یہ سخت بے تمیزی ہے کہ تسبیح اور نفلوں میں مشغول ہو کر گھر کے کام کو بالکل چھوڑ دیا جائے۔ اور اللہ اللہ تو گھر کے کام کرتے ہوئے بھی ہو سکتا ہے۔ یہ کیا ضروری ہے کہ تسبیح اور مصلی کے ساتھ ساتھ اللہ اللہ کیا جائے۔ حدیث میں آتا ہے کہ لَا یَزَالُ لِسَانُكَ رَطْباً مِنْ ذِكْرِ اللهِ کہ زبان کو خدا کی یاد سے ہر وقت تر رکھنا چاہیے، اور ظاہر ہے کہ تسبیح اور مصلی ہر وقت نہیں رہ سکتا۔

تو معلوم ہوا کہ ذکر اللہ کے لیے کسی قید اور پابندی کی ضرورت نہیں بلکہ ہر وقت اور ہر حال میں ہو سکتا ہے۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ جن کو خدا نے نوکر اور مامائیں دیے ہوں وہ اپنے ہاتھ سے بھی کچھ کام کیا کریں، یہ نہ ہو کہ دن رات پلنگ ہی توڑتی رہیں اور کسی کام کو ہاتھ نہ لگائیں، کیوں کہ اس طرح کام کی عادت چھوٹ جاتی ہے اور آدمی ہمیشہ کے لیے محتاج بن جاتا ہے۔ اور کام کرتے رہنے میں عادت بھی رہتی ہے اور قوت وصحت بھی اچھی رہتی ہے۔

حدیث میں آیا ہے:

اَلْمُؤْمِنُ الْقَوِيُّ خَيْرٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِيفِ وَفِي كُلٍّ خَيْرٌ.

مسلمان قوی، مسلمان کمزور سے اچھا ہے اور یوں تو سب ہی اچھے ہیں۔

تو ہمت کی بات یہ ہے کہ گھر کے کام کو بھی دیکھو۔ نوکروں باندیوں سے اپنی نگرانی میں کام لو اور کبھی کسی کام کو اپنے ہاتھ سے بھی کر لیا کرو۔ اور اس کے ساتھ کچھ وقت نکال کر نفلیں اور تسبیحیں بھی پڑھو۔ اگر زیادہ وقت نہ ملے تو چلتے پھرتے ہی اللہ اللہ کرتی رہا کرو۔

عورتوں کی اولاد کے حقوق میں کوتاہیاں:

ایک کوتاہی عورتیں اولاد کے حقوق میں کرتی ہیں۔ بعضے تو اپنے بچوں کو کوستی ہیں اور کبھی وہ کوسنا لگ بھی جاتا ہے، پھر سر پکڑ کر روتی ہیں۔ اور بعضے اولاد کے حقوق میں دینی کوتاہی کرتی ہیں کہ ان کو دین کی تعلیم نہیں دیتیں، نہ نماز روزہ کی ترغیب دیتی ہیں۔ چاہیے کہ اپنی اولاد کو نماز سکھلاؤ اور نماز نہ پڑھنے پر تنبیہ اور تاکید کرو اور علم کی رغبت دلاؤ۔ یہ تو قول کی تعلیم ہوئی، مگر اس کے ساتھ فعل سے بھی تعلیم کرو کہ تم خود بھی اپنی حالت کو درست کرو۔ والدین کے افعال دیکھ دیکھ کر بچہ وہی کام کرنے لگتا ہے جو اُن کو کرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ بلکہ ایک بات تجربہ کی بتلاتا ہوں کہ اگر بچہ پیدا ہونے سے پہلے والدین اپنی حالت درست کرلیں تو بچہ نیک ہی پیدا ہوگا۔ بچہ کی پیدائش سے پہلے بھی جو افعال واحوال والدین پر گزرتے ہیں، اُن کا بھی اثر اس میں آتا ہے۔

ایک حکایت:

چناں چہ ایک بزرگ کا بڑا بچہ بڑا شریر تھا، کسی نے اُن سے کہا کہ یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ آپ تو ایسے بزرگ اور آپ کا بچہ شریر۔ فرمایا کہ ایک دن میں نے ایک امیر کے گھر کا کھانا کھالیا تھا، اس سے نفس میں ہیجان ہوا۔ اس وقت میں اس کی ماں کے پاس گیا اور حمل قرار پا گیا۔ تو یہ بچہ اس مشتبہ غذا کا ثمرہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حمل قرار پانے کے وقت والدین کی جو حالت ہوتی ہے اچھی یا بری اس کا بھی اثر بچہ میں آتا ہے۔

دوسری حکایت:

بعض کتابوں میں ایک حکایت لکھی ہے کہ دو میاں بیوی نے آپس میں یہ صلاح کی کہ آؤ! ہم دونوں سب گناہوں کی توبہ کرلیں اور آیندہ کوئی گناہ نہ کریں تاکہ بچہ نیک پیدا ہو۔ چناں چہ اس کا اہتمام کیا گیا۔ اسی حالت میں حمل قرار پایا اور بچہ پیدا ہوا تو وہ بہت صالح اور سعید ہوا۔ ایک روز اُس بچہ نے کسی دکان پر سے ایک بیر چرایا۔ مرد نے بیوی سے کہا: سچ بتلا، یہ اثر کہاں سے آیا؟ اس نے بیان کیا کہ پڑوسی کے گھر میں جو بیری کا درخت کھڑا ہے اُس کی

ایک شاخ ہمارے گھر میں ہے، اس میں ایک بیر لگ رہا تھا میں نے وہ توڑ لیا تھا۔ مرد نے کہا: بس اس کا اثر ہے، آج ظاہر ہوا۔

اولاد نیک ہونے کے طریقے:

بس اولاد نیک ہونے کے لیے اول درجہ تو یہ ہے کہ والدین خود نیک بنیں۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ پیدا ہونے کے بعد اس کے سامنے بھی کوئی حرکت بے جا نہ کریں، اگرچہ وہ بالکل ناسمجھ بچہ ہو۔ کیوں کہ حُکما نے کہا ہے کہ بچے کے دماغ کی مثال پریس جیسی ہے، کہ جو چیز اس کے سامنے آتی ہے وہ دماغ میں منقش ہو جاتی ہے۔ پھر جب اس کو ہوش آتا ہے تو وہی نقوش اُس کے سامنے آجاتے ہیں اور وہ ایسے ہی کام کرنے لگتا ہے جیسے اُس کے دماغ میں پہلے ہی منقش تھے۔

غرض یہ مت سمجھو کہ یہ تو ناسمجھ بچہ ہے، کیا سمجھے گا؟ یاد رکھو! جو افعال تم اُس کے سامنے کرو گے اُن کا اُس کے اخلاق پر ضرور اثر پڑے گا۔ تیسرا درجہ یہ ہے کہ جب بچہ بڑا ہو جائے تو اس کو علمِ دین سکھلاؤ اور خلافِ شریعت کاموں سے بچاؤ اور نیک لوگوں کی صحبت میں رکھو، بُرے لوگوں کی صحبت سے بچاؤ۔ غرض جس طرح بزرگوں نے لکھا ہے اسی طرح بچوں کی تعلیم کا اہتمام کرو۔ بعضے عورتیں اس میں بہت کوتاہی کرتی ہیں اور اولاد کے حقوق کو تلف کرتی ہیں۔ اور اولاد کے یہ حقوق صرف عورتوں ہی کے ذمہ نہیں، بلکہ مردوں کے بھی ذمہ ہیں۔ مگر بچوں کے اخلاق کی درستی زیادہ تر عورتوں ہی کے اہتمام کرنے سے ہو سکتی ہے کیوں کہ بچے ابتدا میں زیادہ تر ان ہی کے پاس رہتے ہیں۔

حقوق کی قسمیں:

یہ ہیں حقوق عورتوں کے مردوں کے ذمہ میں اور مردوں کے عورتوں کے ذمہ میں۔ مگر ان میں مرد تو عورت کی رعیّت نہیں ہے بلکہ حاکم ہے، تو اس کے حقوق جو عورت کے ذمہ ہیں وہ حاکمانہ حقوق ہیں اور عورتوں کے حقوق جو مردوں کے ذمہ ہیں وہ سب رعیت کے حقوق ہیں کیوں کہ عورتیں ان کی محکوم ہیں۔ اسی کو فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ: کُلُّکُمْ رَاعٍ وَکُلُّکُمْ

مَسْؤُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ.

آج کل نماز روزہ کی تعلیم تو سب کرتے ہیں، مگر جو باتیں میں نے بیان کی ہیں ان کو کوئی نہیں بتلاتا اسی لیے ان حقوق کو بہت لوگ نہیں جانتے۔ اس واسطے میں نے اس وقت مختصراً یہ مضمون بیان کیا ہے تاکہ یہ باتیں کان میں تو پڑ جائیں۔

آخری بات:

اب ایک بات اخیر میں یہ کہتا ہوں کہ اس وقت جتنے حقوق آپ نے سنے ہیں اُن کے بجالانے کے لیے آپ کو ایک تو علم کی ضرورت ہوگی، کیوں کہ بدون جانے کیوں کر ادا ہوں گے۔ اور اس وقت کا بیان یاد نہیں رہ سکتا اور نہ یہ کافی ہوسکتا ہے۔ کیوں کہ اس وقت میں نے تمام حقوق کو تفصیل کے ساتھ نہیں بیان کیا ہے، محض اجمالاً ومختصراً کچھ باتیں بیان کردی ہیں، اس لیے علم حاصل کرنے سے چارہ نہیں۔

دوسری ضرورت ہوگی ہمت کی، کیوں کہ جان لینے کے بعد بھی بدون ہمت کے عمل نہیں ہوسکتا۔ تو میں ان دونوں کا آسان طریقہ بتلاتا ہوں جس کی مستورات کے لیے زیادہ ضرورت ہے۔ کیوں کہ مردوں کو تو کسی قدر علم خود بھی ہوتا ہے اور ان میں ہمت بھی بہت کچھ ہے، مگر عورتوں کو نہ تو علم ہے، نہ ہمت۔

عِلم حاصل کرنے کا آسان طریقہ:

تو علم حاصل کرنے کا آسان طریقہ تو یہ ہے کہ جو کتابیں مسئلے مسائل کی اہلِ تحقیق نے لکھی ہیں ان کو پڑھو، اور اگر پڑھنے کی عمر نہ ہو تو کسی سے بالالتزام سن لو اور روزمرہ سنا کرو۔ جب کتاب ختم ہوجائے تو پھر اوّل سے دَور شروع کردو۔ اس سے تم ان شاء اللہ باخبر ہوجاؤ گی۔ حقوق کا اچھی طرح تم کو علم ہوجائے گا۔ اور ہمت کے لیے ایک آسان تدبیر تو یہ ہے کہ بزرگوں کے پاس جا کر بیٹھا کرو، مگر یہ صورت مردوں کے لیے ہے عورتوں کے لیے نہیں۔ وہ یہ کریں کہ بزرگوں کے حالات اور حکایات اور ملفوظات دیکھا کریں۔ اس سے ان شاء اللہ تعالیٰ ان میں عمل کی ہمت پیدا ہوگی۔ بس یہ طریقہ ہے ان حقوق کے ادا کرنے کا۔

اب دعا کرو کہ حق تعالیٰ ہم کو اس کی توفیق عطا فرمائیں۔

وصلّى الله تعالى وسلم على خير خلقه سيدنا ومولانا محمد وعلى آله وأصحابه أجمعين. وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين.

والحمد لله الذي بنعمته وجلاله تتم الصالحات.

قال رسول اللہ ﷺ: بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ آيَةً. (رواه البخاري)

اصلاح النساء

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اصلاح النساء

أین (کہاں ہوا):	کاندھلہ
متی (کب ہوا):	۱۳۲۹ھ ۲۰ جمادی الاخری
کم (کتنا ہوا):	
کیف (کھڑے ہوکر یا بیٹھ کر):	
ماذا (کیا مضمون تھا):	
من ضبط (کس نے لکھا):	مولوی عبداللہ صاحب گنگوہی
المستمعون (سامعین کی تخمینی تعداد):	
الأشتات (متفرقات):	

اصلاح النساء

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

خُطبۂ مسنُونہ:

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه. ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيآت أعمالنا . من يهده الله فلا مضل له، ومن يضلله فلا هادي له . ونشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له، ونشهد أن سيدنا ومولانا محمدا عبده ورسوله، صلى الله تعالى عليه وعلى آله وأصحابه وبارك وسلم.

أما بعد ، فقد قال النبي ﷺ: ”يا معشر النساء! تصدقن، فإني أريتكن أكثر أهل النار“ . فقلن: وبم يا رسول الله؟ قال: ”تكثرن اللعن وتكفرن العشير، مارأيت من ناقصات عقل ودين أذهب للب الرجل الحازم من إحدا كن“. قلن: وما نقصان ديننا وعقلنا يارسول الله؟ قال: ”أليس شهادة المرأة مثل نصف شهادة الرجل ؟“ قلن: بلى! قال: ”فذلك من نقصان عقلها“، قال: ”أليس إذا حاضت لم تصل، ولم تصم؟“ قلن: بلى، قال: ”فذلك من نقصان دينها“. (متفق عليه)

ترجمہ حدیث شریف:

حدیث شریف کا ترجمہ یہ ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے (عورتوں کو خطاب کرکے) فرمایا کہ اے عورتوں کے گروہ! تم صدقہ دو۔ اس لیے کہ دکھلایا گیا ہوں کہ تم اہلِ نار میں سب سے زیادہ ہو۔ عورتوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! اس کی کیا وجہ ہے؟ فرمایا کہ تم لعنت ملامت بہت کرتی ہو اور خاوند کی ناشکری کرتی ہو۔ میں نے تم سے زیادہ، کہ تم ناقصات العقل والدین بھی ہو، ہوشیار مرد کی عقل کو سلب کرنے والا کوئی نہیں دیکھا۔ عورتوں نے عرض کیا

: یارسول اللہ! ہمارے دین اور عقل کے نقصان کی کیا وجہ ہے؟ فرمایا کہ کیا عورت کی شہادت مرد کی شہادت سے نصف نہیں ہے؟ عورتوں نے عرض کیا کہ بے شک ہے۔ فرمایا کہ بس یہ نقصانِ عقل ہے۔ پھر فرمایا کہ کیا یہ بات نہیں ہے کہ جب کوئی حائضہ ہوتی ہے تو نہ نماز پڑھتی ہے، نہ روزہ رکھتی ہے؟ عرض کیا کہ بے شک۔ فرمایا کہ بس یہ نقصانِ دین ہے۔

تمہید:

میں نے اس وقت اس حدیث کو جس میں عورتیں مخاطب ہیں حالانکہ یہاں مردوں کا بھی مجمع ہے، اس لیے اختیار کیا ہے کہ عورتوں کو ایسا موقع بہت کم ملتا ہے، اس لیے وہ بالکل بے خبر ہیں اور طرح طرح کی خرابیوں میں مبتلا ہیں۔ اور وہ خرابیاں عورتوں سے تجاوز کر کے مردوں اور بچوں تک پہنچتی ہیں۔ اس لیے اُن کی اصلاح سے گھر بھر کی درستی ہے۔ اس کے اعتبار سے یہ مضمون عام اور مشترک النفع بھی ہوگیا۔ اور نیز اس میں بعض مضامین بلا واسطہ بھی مشترک ہیں، البتہ مقصود زیادہ تر عورتوں ہی کو سنانا ہے۔

اس حدیث میں جناب رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کے پانچ نقائص بیان فرمائے، دو اضطراری اور تین اختیاری۔ دو اضطراری یہ ہیں: نقصانِ عقل، نقصانِ دین۔ اور تین اختیاری اکثارِ لعن، کفرانِ عشیر، مردِ حازم کی عقل کو سلب کرنا۔

نقائصِ اضطراری:

نقصان عقل و دین کی ماہیت سے سوال کے جواب میں بجائے بیانِ حقیقت کے، حضور ﷺ نے اس کی علامتیں اس لیے بیان فرمائیں کہ مخاطب کم سمجھ ہیں، اس لیے حقیقت کے سمجھنے میں تکلّف ہوتا۔ اور جہاں مخاطب کم عقل ہو ایسا ہی کرنا مناسب ہے۔ مثلاً کوئی عامی نار (آگ) کی حقیقت سے سوال کرے تو کہا جاوے گا کہ جس میں دُھواں ہوتا ہے وہ نار ہے۔ اسی طرح حضور ﷺ نے نقصانِ عقل کو بھی ایک علامت سے بیان فرمایا ہے، وہ یہ کہ دو عورتوں کی گواہی بمنزلہ ایک مرد کے قرار دی گئی ہے۔ اور نقصانِ دین کو بھی اس علامت سے کہ حیض کے ایام میں روزہ، نماز نہیں پڑھتی۔ اس زمانہ میں چونکہ انقیاد للحق غالب تھا، یہ علامتیں

بیان کردینا کافی تھیں۔ آج کل طبائع کا رنگ بدل گیا، بجائے انقیاد کے عناد غالب ہے۔ اب تو اسی میں سوال پیدا ہوگا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ دو کی گواہی ایک مرد کے برابر ہوئی؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث وقرآن کوئی فن کی کتاب نہیں ہے کہ اس میں ایسی کاوش کی جاوے، بلکہ قرآن وحدیث تو طب کی سی کتابیں ہیں، اس لیے اس کو اس نظر سے دیکھنا چاہیے جس نظر سے شفیق طبیب کے کلام کو دیکھا جاتا ہے کہ کہیں وہ ایک مریض کی حالت کے لحاظ سے کلام کرتا ہے اور کہیں دوسرے مریض کے مناسبِ حال۔ اسی واسطے قرآن وحدیث کو وہ خوب سمجھے گا جو شانِ نزول سے واقف ہو، کیونکہ اس سے معلوم ہو جائے گا کہ کس موقع پر یہ ارشاد ہوا ہے وہاں کیا حالت تھی؟ کیا مقتضیات اور خصوصیات تھیں؟ اور اسی وجہ سے ہم فہم قرآن وحدیث میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے سخت محتاج ہوں گے۔ بڑا فرق ہے اس شخص میں جو نسخہ لکھنے کے وقت طبیب کے پاس حاضر ہو اور جو حاضر نہ ہووے، مدت کے بعد اس نے صرف نسخہ دیکھا ہو۔ جو حاضر ہے وہ مریض کے سن اور مزاج اور دوسری خصوصیات کو مشاہدہ کرلے گا۔ اس لیے نسخہ کے محل کو، وزن کو جیسا وہ سمجھے گا دوسرا شخص نہیں سمجھے گا۔ اسی طور پر قرآن وحدیث کی تفسیر میں سلف کا قول مقدم ہوگا۔

حاصل یہ ہے کہ قرآن وحدیث پر اس اعتبار سے نظر نہ کرنا چاہیے کہ وہ کوئی فن کی کتاب ہے، جس میں تعریفات کے جامع مانع نہ ہونے سے یا قیود کے مفید احتراز نہ ہونے سے تصنیف کو ناقص سمجھا جاتا ہے۔ اسی واسطے میری یہ رائے ہے کہ قرآن وحدیث ایسے وقت پڑھانا چاہیے کہ دماغ فلسفہ ومنطق سے متاثر نہ ہوا ہو۔ بہر حال اس وقت نقصان دین وعقل کی علامت کو بیان کردینا کافی ہوگیا، اور اگر آج یہ کافی نہیں ہے تو حقیقت کے بتلانے والے بھی بفضلہٖ تعالیٰ موجود ہیں۔

اور نقائص اختیاری تو اس لیے بیان فرمائے ہیں کہ اپنے نقائص پر مطلع ہو کر ان کے علاج کی فکر کریں۔ اور نقائص اضطراری غیر اختیاری جو معالجہ سے نہیں جاسکتے ان کو اس لیے بیان فرمایا کہ اپنے اندر ان نقائص کو دیکھ کر کبر اور پندار جاتا رہے، اس لیے کہ عورتوں میں کبر اور پندار کا بہت مرض ہے، ذرا سا کمال ہوتا ہے اس کو بہت کچھ سمجھتی ہیں۔

تکبّر کا منشا اور بنیاد جہالت ہوتی ہے:

اور منشا اس عجب و کبر کا ہمیشہ جہل ہوتا ہے۔ بڑا عالم اپنے کو وہی سمجھتا ہے جو کچھ نہ ہو۔ کیوں کہ جو واقع میں بڑا ہوگا اس کی نظر کمال کی حدِ آخر تک ہوگی اور اپنے کو اس سے عاری دیکھے گا، اس لیے ممکن نہیں کہ اپنے کو بڑا سمجھے۔ البتہ ایسے شخص کو اپنا بڑا سمجھنا شایان ہے (جو تمام مراتبِ کمال کو جامع ہو اور وہ صرف ایک ذات وحدہ لاشریک ہے، اس لیے متکبّر اس کا کمالی نام ہے۔ اس کے معنی ہیں: اپنے کو بڑا سمجھنے والا۔ سو چو کہ واقع میں حق تعالیٰ بڑا ہے، اس لیے اگر وہ اپنے کو بڑا نہ جانتا تو یہ جہل ہوتا اور جہل نقص ہے اور حق تعالیٰ تمام نقائص سے پاک ہیں۔

بس خدا کا تو یہی کمال ہے کہ وہ اپنے کو بڑا جانے اور بندہ کا کمال یہ ہے کہ اپنے کو چھوٹا سمجھے، اگر وہ اپنے کو بڑا سمجھے تو یہ نقص ہوگا۔ حدیثِ قدسی میں ہے:

اَلْكِبْرِيَاءُ رِدَائِيْ، وَالْعَظَمَةُ إِزَارِي فَمَنْ نَازَعَنِيْ فِيْهِمَا قَصَمْتُهُ.

یعنی عظمت و کبریا میرا خاصہ ہے، جیسے اِزار اور رِدا اِنسان کا ملبوسِ خاص ہوتا ہے۔ پس جو شخص مجھ سے (ان صفات میں) کھینچا تانی کرے گا، میں اس کی گردن توڑ دوں گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ عظمت اور بڑائی حق تعالیٰ کی صفاتِ خاصہ میں سے ہیں، اس لیے بندہ کا کمال اپنے کو عاجز سمجھنا ہے۔ چناں چہ جن حضرات کے قلب میں حق تعالیٰ کی عظمت اور کبریا آ گئی ہے وہ اپنے کو ہیچ در ہیچ سمجھتے ہیں۔ جس شخص کی رستم کی قوت پر، حاتم کی سخاوت پر نظر ہوگی وہ اپنے کو قوی اور سخی نہ سمجھے گا۔ جس کے پیشِ نظر جناب رسول اللہ ﷺ کا علم ہوگا، وہ اپنے کو تو کیا عالم سمجھے گا؟

آج کل یہ خبط ہوگیا ہے کہ تھوڑا سا کمال ہوجاتا ہے تو اپنے کو بڑا سمجھنے لگتے ہیں اور عورتوں میں یہ مرض زیادہ ہے۔ اگر کوئی عورت ذرا نماز اور تلاوت کی پابند ہوجاتی ہے تو اپنے کو ''رابعہ'' سمجھنے لگتی ہے اور ہر ایک کو حقیر سمجھتی ہے، اور وجہ اس کی بھی ہے کہ ان کی کسی نے تربیت نہیں کی، کتابیں پڑھ پڑھ کر دین دار ہوجاتی ہیں۔ پس اُن کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی کتبِ طب دیکھ کر دوا یہ کھانے لگے، بنانے لگے، اس سے بجائے نفع کے، خوف ضرور غالب

ہوگا۔ جب تک طبیب کی رائے سے دوا نہ کھائے کچھ نفع نہ ہوگا۔ اسی طرح چونکہ عورتوں کے اخلاق کی تربیت نہیں ہوتی اور کسی مربی سے رجوع نہیں کرتیں اور جو کچھ سمجھ میں آتا ہے کر لیتی ہیں، اس لیے اپنے کو باکمال سمجھنے لگتی ہیں۔

ایک لڑکی کا کسی شخص سے نکاح ہوا۔ وہ لڑکی نماز روزہ کی پابند تھی اور شوہر اس قدر پابند نہ تھا اور آوارہ سا تھا۔ تو وہ لڑکی کہتی ہے کہ افسوس! میں ایسی پرہیز گار اور ایسے شخص کے جال میں پھنس گئی، میری قسمت ڈوب گئی۔ حالانکہ بے وقوف یہ نہیں سمجھی کہ اگر ہم نے نماز پڑھی، روزہ رکھا، تلاوت کی تو اپنا کام کیا، دوسرے پر کیا احسان کیا۔ کوئی دوا پی کر فخر کرتا ہے کہ میں بڑا بزرگ ہوں کہ دوا پیا کرتا ہوں۔

اسی طرح یہ سب طاعات میں اپنا ہی نفع ہے اور اس سے اپنا ہی حق ادا کر رہا ہے۔ اور حقوق اللہ جو اُس کا لقب ہے، یہ اس اعتبار سے نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے منتفع ہے یا اس کا حق اس سے اُتر جاتا ہے۔ کیوں کہ صاحبِ حق کو تو دیکھنا چاہیے کہ اس کی ہم پر کس قدر نعمتیں ہیں۔ اگر نعمتوں کو دیکھا جاوے تو درحقیقت یہ ہماری نماز روزہ کچھ بھی نہیں۔ اور جہاں ہزاروں انبیاء، اولیاء و ملائکہ کی عبادتوں کے ذخیرے کے ذخیرے، انبار کے انبار موجود ہیں، ان کے مقابلے میں ہمارے روزہ نماز کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کہ جواہرات کے سامنے مٹی کے کھلونے۔ تو حقیقت میں احسان تو حق تعالیٰ کا ہے کہ ہماری ایسی عبادتوں کو قبول فرماتے ہیں۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ کوئی شخص کسی اپنے مخدوم کی خدمت بدون اس کی حاجت کے اس کی مرضی کے موافق نہ کرے اور اس مخدوم کو اس خدمت سے بجائے راحت کے تکلیف پہنچی، مگر خوش اخلاقی سے خاموش ہو جاوے، تو وہ خادم اپنی جہالت سے یہ سمجھے گا کہ میں نے بڑا کام کیا۔ حالانکہ بڑا کام تو مخدوم نے کیا کہ اس ناگوار خدمت کو قبول فرمایا۔

دیکھیے! قاعدۂ عقلیہ اور شرعیہ ہے کہ کامل و ناقص کا مجموعہ ہمیشہ ناقص ہوتا ہے اور پاک و ناپاک مل کر ناپاک ہوتا ہے۔ پس جب کہ ہماری نماز میں وساوس و خطرات اور ترکِ سنن اور خلافِ خشوع امور بھی شامل ہیں تو وہ مجموعہ نماز کامل کیسے ہوئی؟ اسی بنا پر حدیث شریف میں وارد ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ایک نماز پڑھنے والے کو جو کہ تعدیلِ ارکان نہ کرتا تھا

فرمایا: صَلِّ فَإِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ یعنی تُو نماز پڑھ لے، اس لیے کہ تُو نے نماز نہیں پڑھی۔ چونکہ اسی حدیث کے آخر میں یہ بھی ہے کہ حضور ﷺ نے پھر اس کو طریقہ نماز کا مع تعدیلِ ارکان اور آداب کے سکھایا اور اس کے بعد یہ فرمایا کہ جس قدر اس میں سے کمی ہوگی اسی قدر نماز میں کمی ہوجاوے گی۔ اس لیے فقہائے اُمت رحمہم اللہ نے سمجھا کہ نماز تو ہوجاوے گی مگر ناقص ہوگی، ورنہ ظاہر الفاظِ حدیث سے تو معلوم ہوتا تھا کہ بالکل ہی نماز نہ ہو۔

بہرحال یہ محض رحمت ہے کہ ہماری ناقص عبادت کو بھی عبادت گردانا، یہ محض فضل ہے۔ پھر ایسی عبادت پر خوش ہونا اور فخر کرنا جہالت ہے۔ اور منشا اس فخر و کبر کا جہل ہے، اور جس قدر عقل کم ہوتی ہے یہ مرض کبر کا زیادہ ہوتا ہے۔ چناں چہ مردوں کی نسبت عورتوں میں یہ مرض زیادہ ہے۔

حاصل یہ ہے کہ نقائصِ اضطراری پر نظر و تنبہ و توجہ ہونے سے یہ مرض کم ہوتا ہے۔ اور اوّل معلوم ہوچکا ہے کہ نقص اضطراری کہ جن کے ازالہ پر قدرت نہیں اس مقام پر دو ہیں: نقصانِ عقل، اور نقصانِ دین۔ نقصان عقل کو تو حضور ﷺ نے اس علامت سے بیان فرمایا کہ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر ہے؟ اس سے معلوم ہوا کہ ان کی عقل میں نقصان ہے۔ آج کل یہ سوال اس مسئلہ میں پیدا ہوسکتا ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ دو کی گواہی ایک کے برابر ہے۔ جوابِ حقیقی اور قاطع شغب تو یہی ہے کہ اس میں کوئی حکمت ہوگی کہ جس کی ہم تعیین نہیں کرتے، اور اگر دیں ہماری طرف سے تبرّع ہے، جواب تو اسی قدر کافی ہے۔

مردوں اور عورتوں کی خِلقت میں فرق ہے:

باقی ہم تبرعاً کہتے ہیں کہ حکمت یہ ہے کہ عورتوں کی خِلقت ہی میں نقصان ہے۔ تمام قُویٰ اور اعضا میں اُن کے بہ نسبت رجال کے نقصان، آفتابِ نیمروز کی طرح آتا ہے اور جبکہ خلقاً ناقص ہیں تو حافظہ بھی ناقص ہوگا اور مدار شہادت کا حفظ پر ہے، اس لیے دو کی گواہی ایک کے برابر قرار دی گئی۔ اور چونکہ حافظہ بھی معینِ عقل ہے، اس لیے یہ علامت ہوگی ایک درجہ میں نقصان عقل کی۔ پھر اس میں سوال ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسا ضعیف کیوں پیدا فرمایا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں تمدن کی حفاظت ہے، تاوقتیکہ ایک کو دوسرے کا تابع اور

محتاج نہ بنایا جائے تمدن محفوظ نہیں رہ سکتا، اور تبعیت دو مساوی میں ہوتی نہیں۔ اسی واسطے فرماتے ہیں: ﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ﴾ یعنی مرد عورتوں پر سردار ہیں۔ اور وجہ اس کی آگے ارشاد فرمائی ہے: ﴿فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ یعنی بسبب اس بات کے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ اور جن لوگوں نے برعکس اس حکم کے عورتوں کو متبوع بنالیا وہاں کی خرابیاں پوشیدہ نہیں ہیں۔

آج کل ﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ﴾ کی تفسیر یہ کی جاتی ہے کہ مرد عورتوں کے مزدور ہیں۔ سبحان اللہ! کیا تفسیر دانی ہے۔ ان مفسّر صاحب سے کوئی پوچھے کہ ﴿فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ﴾ (اللہ تعالیٰ نے بعض کو فضیلت دی) کے کیا معنی ہیں؟ اگر جرأت کر کے یہ کہیں کہ اس میں بھی ﴿بَعْضَهُمْ﴾ سے مراد عورتیں ہی ہیں تو تھوڑی دیر کے لیے مسلم، لیکن آگے جو فرماتے ہیں: ﴿وَبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ﴾ (اور اس سبب سے کہ مردوں نے اپنے مال خرچ کیے ہیں) اس میں تو ضمیر یقیناً رجال ہی کی طرف ہے کیوں کہ منفق وہی ہیں، تو کیا پھر ﴿فَضَّلَ اللّٰهُ﴾ کی وہ تفسیر سرتاسر مہمل اور تحریف قرآن نہ ہوگی؟ اگر یہ معنی ہوتے تو لِلنِّسَاءِ فرماتے۔ عَلٰی جو کہ تسلّط کے لیے ہے نہ فرماتے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مردوں کو عورتوں پر خلقتاً بھی فضیلت ہے۔ چنانچہ دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿اَوَ مَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ۝﴾ (الزخرف:۱۸) مشرکین جو ملائکہ کو بنات اللہ کہتے تھے ان کا رد اس طرح فرماتے ہیں کہ کیا تم ایسی مخلوق کی حق تعالیٰ کی طرف نسبت کرتے ہو جو کہ پست خیال ہے اور ہمیشہ بناؤ سنگھار اور زیور میں نشو ونما پاتے ہیں، اور دوسرے یہ کہ اُن میں مقابلہ کے وقت قوت بیانیہ نہیں ہے۔ واقعی یہ دو صفتیں جو عورتوں کی ارشاد فرمائی ہیں کھلّم کھلا نظر آتی ہیں۔ زیور اور آرائش اور بناؤ سنگھار میں شب وروز رہتی ہیں، اس سے آگے ان کا خیال ترقی ہی نہیں کرتا۔ غایتِ مقصود اپنا اسی کو سمجھتی ہیں اور مقابلہ اور مناظرہ کے وقت ان کے دلائل میں قوت بالکل نہیں ہوتی، اِدھر اُدھر کی باتیں بہت کریں گی لیکن کسی امر پر دلیلِ صحیح ہرگز نہ بیان کرسکیں گی۔

کوئی عورت یہ نہ کہے کہ یہ زیور تو ہم کو ماں باپ نے پہنا دیا اس سے عادت ہوگئی۔ اس

سے میلان کہاں ثابت ہوا؟ جواب یہ ہے کہ یہ بالکل غلط ہے، اگر ماں باپ بھی پہنادیں تب بھی ان کا طبعی میلان نمائش وآرائش کی طرف ہے۔ چنانچہ بہت سے واقعات اس کے مشاہد ہیں۔ اور اسی طرح اگر کوئی صاحب دوسرے جزو میں یعنی قوتِ بیانیہ میں کمی کے بارے میں فرماویں کہ یہ اس وجہ سے ہے کہ ہماری عورتوں کی تعلیم نہیں ہوتی، اگر تعلیم وتربیت کامل ہوتو یہ نقصان ہرگز نہ رہے، یہ بھی غلط ہے۔ اس لیے کہ جو عورتیں تعلیم یافتہ کہلاتی ہیں وہ بھی معلوم ہوا کہ لیکچروں میں ناقص تقریر کرتی ہیں۔ ان کے شوہر اس لیکچر کی تکمیل کرتے ہیں۔

یہ حکمت تبرعاً بیان کردی گئی ورنہ یہ کہنا کافی ہے کہ خدا تعالیٰ کی کوئی حکمت ہوگی۔ ہمارا کوئی فائدہ اس کی تعیین پر موقوف نہیں۔ اسی واسطے جو چیزیں فضول ہیں ان کی تحقیق وتفتیش سے منع کردیا گیا ہے۔ ہم کو اس تحقیق سے کیا فائدہ ہے کہ فلاں ناقص کیوں ہے، فلاں کامل کیوں؟ ہم کو تو اس کے نتائج واحکام پر عمل کرنا چاہیے۔ بہرحال تقریر سے معلوم ہوگیا کہ نقصانِ عقل اضطراری اور خلقی ہے۔

اور دوسرا نقصان یعنی نقصانِ صلوٰۃ جس کو نقصانِ دین فرمایا ہے جس کا سبب حیض کا آنا فرمایا ہے، وہ تو ظاہر ہی ہے کہ خلقی ہے۔ اور تین امر اختیاری ان کی طرف منسوب فرمائے کہ ان کا ازالہ ان کے اختیار میں ہے۔ وہ کفرانِ عشیر، واذہابِ لبِّ رجلِ حازم، واکثارِ لعن، چوں کہ یہ اختیاری ہیں اس لیے ان کو نقص نہ کہنا چاہیے، بلکہ ان کو شر کے نام سے موسوم کرنا مناسب ہے۔

حاصل یہ ہوا کہ عورتوں میں دو نقص اور تین شر ہیں۔ جو نقص ہیں ان کا فکر تو بے سود ہے، اس لیے کہ وہ معاملے زائل ہونے والے نہیں، بلکہ اس کی تو تمنّا سے بھی منع کیا گیا ہے۔ چناں چہ وارد ہے کہ حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا نے مردوں کے فضائل سن کر فرمایا تھا کہ یا لَیْتَنَا کُنَّا رِجَالًا یعنی اے کاش! ہم مرد ہوتے تو مردوں کی سی فضیلت ہم کو بھی ملتی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ﴾ (النساء: ۳۲) یعنی مت تمنّا کرو اس شی کی کہ اللہ تعالیٰ نے اس شی سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے یعنی خلقی۔ آگے فرماتے ہیں: ﴿ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ﴾ (النساء: ۳۲) یعنی مردوں کے لیے حصّہ ہے اس شی سے جو انہوں نے کمایا اور عورتوں کے لیے

حصّہ ہے جو انہوں نے کمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسی تمنّا چھوڑو، عمل میں کوشش کرو۔

اب اس پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ اگر ہم عمل بھی کریں تب بھی ناتمام ہی رہیں گے۔ نقصان ہمارا کہاں دور ہوگا؟ تو اس کا جواب فرماتے ہیں: ﴿وَاسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ سے اُس کے فضل کا سوال کرو۔ مطلب یہ ہے کہ عمل نیک کرے۔ اگر خدا تعالیٰ کا فضل ہو تو تم مردوں سے بڑھ سکتی ہو۔

غرض یہ کہ جو نقص اضطراری ہیں اس کی فکر تو بالکل فضول ہے، اور جو اختیاری ہیں جن کو ہم نے شر کہا ہے اس کی اصلاح واجب ہے اور وہ کل تین شر ہیں: اکثارِ لعن، کفرانِ عشیر، اذہابِ لبِ رجل۔

ا۔ لعنت ملامت کرنے کا مرض:

اکثار لعن یعنی لعنت ملامت زیادہ کرنا، چناں چہ دیکھا جاتا ہے کہ صبح سے شام تک ان کا یہی مشغلہ ہے کہ جس سے دشمنی ہے اس کی غیبت کرتی ہیں، اور جس سے محبّت ہے اس کو کوستی ہیں، اپنی اولاد کو کوستی ہیں، اپنی جان کو کوستی ہیں اور ہر شی کو خواہ وہ قابل لعنت ہو یا نہ ہو کوستی ہیں۔ یاد رکھو! بعض وقت اجابت کا ہوتا ہے اور وہ کوسنا لگ جاتا ہے پھر نادم ہونا پڑتا ہے۔ ہمارے یہاں ایک شخص تَشَنُّج زدہ ہے جو کہ چارپائی سے ہل نہیں سکتا اور سخت تکلیف میں ہے۔ اُس کی ماں نے اس کو کسی شرارت پر یہ کہا تھا کہ خدا کرے! تو چارپائی کو لگ جاوے۔ خدا کی قدرت وہ ایسا ہی ہوگیا اور اس کی مصیبت والدہ صاحبہ کو اٹھانی پڑی۔

۲۔ ناشکری کا مرض:

کفرانِ عشیر یعنی زوج کی ناشکری، جس قدر اُن کو دیا جائے سب تھوڑا ہے۔ مجھ کو مولوی عبدالرب صاحب کا ایک لطیفہ یاد آ گیا کہ وہ فرماتے تھے کہ اُن کے پاس کتنا ہی کپڑا ہو، جب پوچھو کہ کپڑا ہے؟ تو کہیں گی کہ کیا ہیں چار چیتھڑے۔ اور کتنے جوڑے جوتا کے ہوں، مگر پوچھنے پر یہی کہیں گی کہ کیا ہے دو لیتھڑے۔ اور برتن کیسے ہی عمدہ اور کثرت سے ہوں، مگر یوں ہی کہیں گی کہ کیا ہیں چار ٹھیکرے۔ ایک عورت خود کہتی تھی کہ ہمارا حال تو دوزخ کا سا ہے کہ اس

کو کہا جاوے گا: هَلِ امْتَلَأْتِ؟ (کیا تو بھر گئی؟) وہ جواب میں کہے گی: هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ؟ (کہ کچھ اور بھی ہے)۔

ایک مرض ان میں اور بھی ہے جو کفران ہی کا شعبہ ہے کہ کوئی چیز خواہ وہ کارآمد ہو یا نکمی ہو پسند آنا چاہیے، بے سوچے سمجھے اس کو خرید لیتی ہیں اور کہتی ہیں: گھر میں ہوئی چیز کام آہی جاتی ہے۔ اور یہ شعبہ کفران کا اس لیے ہے کہ اضاعت مال شوہر کا ہے۔ خود اپنے مال کی اضاعت بھی کفران ہے، جیسا ارشاد ہے:

﴿اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ۭ
وَ كَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا۝﴾ (الإسراء: ۲۷)

بے شک بے موقع اڑانے والے شیطانوں کے بھائی بند ہیں،
اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا ناشکر ہے۔

اور جب مال بھی دوسرے کا ہو تو کفرانِ حق کے ساتھ کفرانِ شوہر بھی ہے۔ مؤمن کا قلب تو زیادہ بکھیڑے سے گھبرانا چاہیے، گو کہ اسراف بھی نہ ہو، اور بے ضرورت کوئی شی خریدنا تو صریح اسراف میں داخل ہے۔ حدیث میں ہے:

نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ إِضَاعَةِ الْمَالِ.

یعنی منع فرمایا حضور ﷺ نے مال کے ضایع کرنے سے۔

آج کل گھروں میں اور خصوصاً بڑے گھروں میں نہایت اسراف ہوتا ہے، برتن ایسے خریدے جاتے ہیں جو قیمت میں تو بہت زیادہ، مضبوط خاک بھی نہیں، ذرا ٹھیس لگ جاوے چار ٹکڑے، اور پھر حاجت سے بھی زائد۔ بعض گھروں میں اس کثرت سے شیشہ و چینی وغیرہ کے برتن ہوتے ہیں کہ عمر بھر بھی اُن کے استعمال کی نوبت نہیں آتی۔ علیٰ ہذا کپڑوں میں بھی بہت اسراف ہے۔ عـہ/ (۱۰ روپے) گز کا اور عـــہ/ (۱۵ روپے) گز کا کپڑا بہت باریک ہو کہ علاوہ ممنوع ہونے کے کسی کام کا نہیں، پہنتی ہیں۔ اگر کہیں سے نکل گیا تو کسی کام کا نہیں۔ اور موٹا کپڑا اگر پرانا ہو جاتا ہے کسی غریب ہی کے کام آجاتا ہے۔ یہ تمام مصیبت اس کی ہے کہ عورتیں اس کی کوشش کرتی ہیں کہ میرا جوڑا ایسا ہو کہ کسی کے پاس نہ ہو۔ اپنی حیثیت کو نہیں

دیکھتیں، ظروف ولباس، مکان ہر شی میں شانِ نمود، تفاخر، ریا کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں۔ یہ حال تو روزہ مرہ کے برتاؤ کا ہے اور اگر کہیں کوئی تقریب پیش آجائے تو کیا ٹھکانا ہے۔ تمام رسوم پوری کی جاویں گی جن میں سراسر نمود ہی نمود ہے۔

بعض عورتیں فخر کرتی ہیں کہ ہم نے رسوم سب چھوڑ دیں۔ مگر رسمیں دو قسم کی ہیں: ایک تو شرک و بدعت کی رسمیں۔ مثلاً چٹائی پر بھوکا بٹھانا، اس کی گود میں بچہ دینا کہ اس سے شگون لیتے ہیں کہ اولاد ہو، تو واقعی ایسے ٹونے ٹوٹکے تو اکثر جگہ چھوٹ گئے۔ دوسری تفاخر اور نام آوری کی رسمیں۔ سو یہ دوسری قسم متروک نہیں ہوئی، بلکہ بسبب تموّل کے بہ نسبت پہلے کے کچھ بڑھ گئی ہیں۔ پہلے زمانے میں اتنا تفاخر اور ریا و نمود نہ تھا، کیوں کہ کچھ سامان کم تھا، کچھ طبائع میں سادگی تھی۔ اب تو کھانے میں الگ تفاخر ہوگیا، وہ پہلی سی سادگی ہی نہیں رہی۔ پلاؤ بھی ہو، کباب بھی ہوں، فیرنی، متنجن اور بریانی ہو۔ اور کپڑے کے تکلّفات کو اول بیان ہی کیا گیا ہے۔ ایک دلہن ایک جگہ ڈیڑھ ہزار کا صرف کپڑا ہی کپڑا جہیز میں لائی تھی۔ شاید یہ کپڑا اس کے مرنے تک بھی ختم نہ ہوا ہو۔ اور اکثر ایسا ہوا ہے کہ دلہن مرگئی ہے اور یہ سب سامان ہزاروں روپیہ کا ضایع ہوا۔ پھر علاوہ دلہن کے کپڑوں کے تمام کنبہ کے جوڑے بنائے جاتے ہیں اور بعض دفعہ اُن کو پسند بھی نہیں آتے اور ان میں عیب نکالے جاتے ہیں۔ کس قدر بے لطفی ہوتی ہے اور اس پر دعویٰ یہ ہے کہ ہم نے رسمیں چھوڑ دیں۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ جہیز کو دکھاتے تک نہیں۔ دیکھو! ہم نے رسمیں چھوڑ دیں۔ سو جناب اس میں کیا کمال کیا؟ اپنی بستی میں تو برسوں پہلے سے سامان جمع کر کر کے ایک ایک کو دکھلا چکی ہو۔ جو مہمان آتی ہے اس کو بھی اور جو رشتہ دار آتی ہے اس کو بھی ایک ایک چیز دکھلائی جاتی ہے، اور خود سامان آنے میں جو شہرت ہوتی ہے وہ الگ۔ آج دہلی سے کپڑا آرہا ہے، اور مرادآباد گئے تھے وہاں سے برتن لائے ہیں۔ اور اس کے بعد وہ دولہا کے گھر جا کر کھلتا ہے اور عام طور پر دکھایا جاتا ہے اور اسی واسطے لڑکی کے ہمراہ بھیجا جاتا ہے، تو یہ قصداً اعلان نہیں ہے تو کیا ہے؟ ہاں! اگر ہمراہ نہ کیا جاتا تو عقل کے بھی موافق تھا، کیوں کہ یہ سب سامان لڑکی ہی کو دیا جاتا ہے اور اس وقت وہ قبضہ نہیں کرتی اور نہ اس کو خبر ہوتی ہے۔ اس کو دینا تو یہ ہے کہ

سردست اپنے گھر رکھو، جب وہ اپنے گھر آوے اس وقت وہ تمام سامان اس کے سامنے رکھو اور کہو کہ یہ سب چیز تمہاری ہے، تمہارا جب جی چاہے لے جانا۔ بلکہ مصلحت یہ ہے کہ وہ اب نہ لے جاوے، کیوں کہ اس وقت تو اس کو کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کسی وقت جب ضرورت ہوگی لے جائیں گے اور اوفق للعقل ہونے کے ساتھ اس میں ریا بھی نہ ہوئی۔ اس وقت یہ دعوی ترکِ رسم کا صحیح ہوتا، مگر چونکہ اس میں کوئی تفاخر اور دکھاوا نہیں ہے اس لیے ایسا کوئی بھی نہیں کرتا۔

۳۔ چالاکی وہوشیاری کا مرض:

تیسرا اذہابِ لُبِّ رجلِ حازم، یعنی بڑے ہوشیار مرد کی عقل کو سلب کرلینا۔ چناں چہ دیکھا جاتا ہے کہ یہ ایسی اتار چڑھاؤ کی باتیں کرتی ہیں کہ اچھے خاصے عاقل بے عقل ہوجاتے ہیں۔ ان کے لہجے میں خلقتاً ایسا اثر رکھا گیا ہے کہ خواہ مخواہ مرد اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ عقل میں مردوں سے زیادہ ہیں، بلکہ وجہ اس کی یہ ہے کہ مکر اور چالاکی ان میں مردوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ عقل اور شی ہے اور مکر اور چالاکی دوسرے شی ہے۔ شیطان میں مکر اور چالاکی تھی، عقل نہ تھی، اسی واسطے دھوکہ کھایا، جبکہ حکم ہوا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو تو سجدہ نہ کیا اور

﴿خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ﴾(الاعراف: ۱۲)

مجھ کو تو نے مٹی سے بنایا ہے اور اس کو تو نے خاک سے پیدا کیا ہے۔

کہہ گزرا اور یہ نہ سوچا کہ جب حق تعالیٰ نے سجدہ کا حکم فرمایا ہے تو ضرور اس میں کوئی مصلحت ہوگی۔

اور مصلحت وحکمت تو بہت ہی ظاہر تھی۔ چناں چہ فرمایا ہے:

﴿اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً﴾(البقرہ: ۳۰)

یعنی میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

اور قاعدہ ہے کہ جب کوئی جانشین تختِ سلطنت پر بیٹھتا ہے تو اس کو نذریں گزاری جاتی

ہیں۔ جو معاملہ منیب کے ساتھ کیا جاتا تھا، وہ اب نائب کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اسی لیے یہاں بھی حکم ہوا کہ ہم کو جس طرح سجدہ کرتے تھے اسی طرح آدم علیہ السلام کو کرو، اس لیے کہ ہمارا خلیفہ ہے۔

ہاں! یہ فرق ضرور ہے کہ آدم علیہ السلام کو جو سجدہ کیا گیا وہ سجدۂ تحیہ تھا اور حق تعالیٰ کو سجدہ کرنا سجدۂ عبادت ہے، تو اتنی موٹی بات میں اس نے غلطی کی۔ اس سے معلوم ہوگیا کہ اس میں عقل نہ تھی، ہاں چالاکی اور مکر میں بے شک بے مثل ہے۔

اس پر ایک میاں جی کی حکایت یاد آئی کہ ان کے پاس کہیں سے بتاشے آئے۔ انہوں نے ایک مٹی کے بدھنے میں آٹا لگا کر بند کر کے رکھ دیے تاکہ کوئی لڑکا نہ کھا جاوے۔ لڑکوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ کوئی تدبیر ایسی ہونا چاہیے کہ بدھنے کا منہ بھی نہ کھلے تاکہ راز ظاہر نہ ہو اور بتاشے بھی وصول ہو جاویں۔ سوچتے سوچتے ایک تدبیر نکالی کہ پانی لا کر ٹونٹی کی راہ سے اس میں بھرا اور شربت گھول کر پی گئے۔ تو یہاں یہ نہ کہا جاوے کہ یہ لڑکے بڑے عاقل تھے، بلکہ یوں کہا جاوے گا کہ بڑے شریر اور چالاک و مکار تھے، کیوں کہ عقل کا مقتضیٰ تو اپنے استاد کی خدمت واطاعت ہے نہ کہ ضرر رسانی۔ کیوں کہ عقل کے معنی لغت میں "بستن" کے ہیں۔ عقل وہی ہے جو کہ مضرت سے بند رکھے، روکے۔ بندر بہت عجیب عجیب کام کرتے ہیں، مگر اس سے بندر کو عاقل نہ کہا جاوے گا بلکہ مکار کہیں گے۔

غرض عقل اور شی ہے اور چالاکی و مکر اور چیز ہے۔ عقل محمود ہے اور اس کا نہ ہونا مذموم، اور چالاکی مذموم ہے اور اس کا نہ ہونا محمود۔ چناں چہ شریعت میں یہ بھی محمود نہیں ہے کہ دوسروں کو ضرر پہنچائے کہ مکر ہے، اسی طرح یہ بھی کمال نہیں کہ اپنے کو مضرت سے نہ بچائے کہ کم عقلی ہے۔ حدیث شریف میں ہے:

لَا يُلْدَغُ الْمُؤْمِنُ مِنْ جُحْرٍ وَاحِدٍ مَرَّتَيْنِ.

یعنی مؤمن ایک سوراخ سے دو مرتبہ نہیں کاٹا جاتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اگر مؤمن کو کسی جگہ سے ضرر پہنچے تو اس کی شان یہ نہیں ہے کہ پھر وہاں جاوے، یا کسی آدمی سے تکلیف و نقصان پہنچا تو یہ مناسب نہیں کہ پھر اس سے معاملہ کرے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مومن کے لیے اتنی بیدار مغزی کمال کی بات ہے کہ اپنے کو مضرت سے بچائے۔ اسی واسطے دین کو نفع ہمیشہ عُقلا ہی سے ہوا ہے۔ انبیا اور مقتدائے دین جس قدر ہوئے ہیں سب بڑے عاقل تھے۔ کسی نبی کی ایسی حکایت نہ سنی ہوگی وہ بھولے ہوں، ان کو کچھ خبر نہ ہو۔ ہاں چالاک ومکار نہ تھے۔ عاقل، ہوشیار، حکیم تھے۔ اور یہ تو وہ شی ہے کہ جس کی بنا پر خلیفۃ اللہ بنایا گیا ہے۔

غرض یہ کہ عورتوں میں چالاکی اور مکر ہے، عقل نہیں۔ اس چالاکی ومکر کی وجہ سے عاقل کی عقل کو سلب کرلیتی ہیں۔ چناں چہ تنہائی میں ایسی باتیں کرتی ہیں کہ جس سے شوہر کا دل اپنی طرف ہوجاوے اور سب سے چھوٹ جاوے۔ بیاہ کے بعد گھر آتے ہی سب سے اول کوشش ان کی یہ ہوتی ہے کہ شوہر ماں باپ سے چھوٹ جاوے۔ بڑے ظلم کی بات ہے کہ جس ماں نے مشقتیں اٹھا کر اس کو پالا، اپنا خونِ جگر پلایا، خود تکلیف میں رہی اور اس کو آرام سے رکھا، اس کے تمام ناز برداشت کیے۔ اور جس باپ نے دھوپیں کھائیں اور اولاد کے لیے گھر چھوڑا، محنت کرکے ان کو پالا۔ آج ان کی خدمات کا یہ صلہ دیا جاتا ہے کہ ان سے چھڑایا جاتا ہے۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ.

پھر اگر یہ منتر ان کا چل گیا تو اس پر بھی اکتفا نہیں۔ کہتی ہیں کہ تم تو الگ ہوگئے، مگر تمہاری کمائی تو ان کے پاس جارہی ہے، کبھی ماں کو جُوتا لادیا، کبھی نقد کچھ دے دیا۔ غرض کوشش کرکے اس میں بھی کامیاب ہوتی ہیں۔ پھر اس پر بھی صبر نہیں آتا، اس کے بھائی بہن سے اور اگر پہلی زوجہ سے اولاد ہو اس سے چھڑاتی ہیں۔

غرض شب وروز اسی فکر میں گزرتا ہے اور یہی رات دن سعی ہوتی ہے کہ سوائے میرے اور میری اولاد کے کوئی نہ ہو۔ اور ان ہی کی بدولت بہت سے گھروں میں بلکہ بہت سے خاندانوں میں نا اتفاقی ہوجاتی ہے۔ مردوں میں یہ بے احتیاطی ہے کہ ان کی باتیں سنتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں۔ اور خود اس کفران اور اذہاب کی وجہ دو ہیں:

اوّل تو ان کو زوج کی مساوات کا زعم ہوتا ہے کہ ہم اس سے کیا کچھ کم ہیں۔ چنانچہ یہاں تک کوشش ہوتی ہے کہ مناظرہ میں بھی ہم غالب رہیں۔ جو بات شوہر کہتا ہے اس کا

جواب اُن کے پاس تیار رہتا ہے۔کوئی بات بھی بے جواب نہ چھوڑیں گی،خواہ نا گوار ہو یا گوارا ہو، خواہ معقول ہو یا نامعقول ہو۔ اور کفران کے آثار اکثر اس دعوائے مساوات سے پیدا ہوتے ہیں۔

اب میں اُن حضرات کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جو مساواتِ حقوقِ زوجین کی کوشش کرتے ہیں۔ ان سے التماس ہے کہ آپ حضرات جو اس سعی میں ہیں کہ رجال ونسا میں مساوات ہو جائے تو قطعِ نظر سب جوابوں کے کہتا ہوں کہ اگر آپ ہی کی بیگم صاحبہ آپ سے مساوات کا دعوی کرے اور مقابلہ میں آ کر جواب سوال کرے تو سچ کہنا کہ آپ ناخوش نہ ہوں گے؟ ضرور ہوں گے۔ ہر شخص یہی چاہتا ہے کہ میرے اہل وعیال میرے تابع ہوکر رہیں اور خصوصا جنٹلمین حضرات، کہ مساوات تو کیا رکھتے، معمولی حقوق بھی بیبیوں کے ضایع کرتے ہیں۔

بیبیو! تم مردوں کے برابر کیسے ہوسکتی ہو؟ تم ہر طرح اور ہر امر میں پیچھے رکھی گئی ہو۔ دیکھو! تمہاری امامت جائز نہیں۔ میراث، شہادت، امارت، ولایت وغیرہ میں ہر طرح مردوں سے پیچھے ہو۔تم آگے کیوں بڑھنا چاہتی ہو؟ امام صاحب کا قول ہے کہ اگر صف میں مرد کے برابر عورت کھڑی ہو جاوے تو نماز فاسد ہو جاوے گی۔ جب عبادات میں مساوات نہیں ہے جس میں زیادہ ہمت، زیادہ عقل کی بھی ضرورت نہیں تو معاملات میں کہ جن میں بہت سے ان امور کی ضرورت ہے جو خاص مردوں میں پائے جاتے ہیں، کیسے برابر ہوسکتی ہو؟ اور تم برابری کا دعوی کرنا چاہتی ہو، حالاں کہ تمہارا مرتبہ لونڈی سے بھی کم ہے۔ اس لیے کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اگر میں خدا کے سوا کسی غیر کو سجدہ کرنے کی اجازت دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ اپنے مولیٰ (شوہر) کو سجدہ کرے، اور یہ نہیں فرمایا کہ لونڈی کو حکم دیتا کہ اپنے مولیٰ (آقا) کو سجدہ کرے۔ معلوم ہوا کہ تمہارا مرتبہ لونڈی سے بھی کم ہے اور شوہر کا مرتبہ مالک سے بھی زیادہ ہے۔ مگر تمہاری یہ حالت ہے کہ خاوند سے دبنا نفس کے خلاف ہونے سے عار سمجھا جاتا ہے، تم ان احکام کو دین ہی نہیں سمجھتیں۔ بڑا شوق دین کا ہوگا تو وظائف اور سبحان اللہ اور الحمد للہ کی بہت سی تسبیح پڑھ ڈالیں گی۔

میں کہتا ہوں کہ وظائف کا مرتبہ تو ان سب سے پیچھے ہے۔ بڑی فضیلت اسی میں ہے

جس کام میں نفس کا خلاف ہو۔ اور ان وظائف کو اجزائے دین میں سے اکثر نے انتخاب کیا ہے، اس کے اندر نفس کا ایک خفی کید ہے۔ وہ یہ کہ عوام میں اس کی وجہ سے تعظیم وتکریم بہت ہوتی ہے۔ عوام بزرگ سمجھنے لگتے ہیں، اس لیے اس میں نفس خوش ہوتا ہے۔ اور خاوند کی حرمت اور تعظیم اور اطاعت نفس کے خلاف ہے، اس لیے اس سے اعراض ہے۔ غرضیکہ ایک وجہ خرابی کی تو زعمِ مساوات ہے۔

حسد:

دوسری وجہ حسد ہے، یہ مرض بھی عورتوں میں بہت ہے۔ ذرا ذرا سی شی پر ان کو حسد ہوتا ہے۔ مثلاً اسی پر حسد ہوتا ہے کہ ماں باپ کو یہ شی کیوں دیتا ہے۔ اگر ماں باپ نہ ہوتے تو یہ شے ہمارے پاس رہتی۔ لیکن اے عورتو! میں تمہاری اس امر میں تعریف کرتا ہوں کہ تمہارا ایمان تقدیر پر بہ نسبت مردوں کے زیادہ ہے۔ مردوں کو صدہا وسوسے پیش آتے ہیں، عُلما سے الجھتے ہیں۔ لیکن تم کو اس میں شک وشبہ بھی نہیں ہوتا۔ مگر معلوم نہیں کہ یہ تمہارا تقدیر پر ایمان لانا اس موقع پر کہاں گیا۔

خوب سمجھ لو کہ جس قدر تقدیر میں ہے وہ تم کو مل کر رہے گا، پھر حسد اور جلن کاہے کے لیے کرتی ہو۔ اور یہی حسد ہے جس کی وجہ سے سَوت سے ہمیشہ ان کی لڑائی رہتی ہے۔ لیکن کوئی عورت اس کا اقرار ہرگز نہ کرے گی کہ مجھ کو حسد ہے، بلکہ مختلف پیرایوں میں یہ جلن نکالتی ہے۔ کبھی کہتی ہے کہ فلانی میں یہ عیب ہیں، فلاں باہر کی ہے یا شرافت میں میرے برابر نہیں ہوسکتی۔ ہمارے قصبات میں بالخصوص دعوائے شرافت کا ایسا مرض ہے کہ باہر کی عورت یا مرد کیسا ہی شریف ہو، مگر اپنی شرافت کے گھمنڈ میں کسی کو منہ نہیں لگاتے۔ اور مجھ کو تو اسی میں شبہ ہے کہ ہم لوگ جو شریف کہلاتے ہیں آیا واقع میں ایسے ہی ہیں یا نہیں؟

کیوں کہ عجیب بات ہے کہ جس قدر شیوخ ہیں کوئی تو اپنے کو صدیقی کہتا ہے، کوئی فاروقی، کوئی علوی، کوئی عثمانی، کوئی انصاری۔ کیا ان چار پانچ صحابہ کے سوا نعوذ باللہ! اور صحابہ منقطع النسل تھے؟ کوئی اپنے کو یہ نہیں کہتا کہ حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ کی اولاد میں ہوں، یا حضرت مقداد بن الاسود رضی اللہ عنہ کی اولاد میں ہوں۔ سب ان چار پانچ حضرات ہی کی طرف

نسبت کرتے ہیں۔ شبہ ہوتا ہے کہ یہ سب تراشیدۂ یاراں ہے۔ مشاہیر اور جلیل القدر والشان صحابہ کو لے کر ان کی طرف نسبت کرنے لگے۔ جن کے پاس نسب نامہ محفوظ نہیں، ظاہر ہے کہ ان کا بیان تو زبانی ہی قصّہ ہے۔ اور جن کے پاس نسب نامہ ہے اس میں بھی اوپر سے اشتباہ ہے، کوئی تحقیقی بات نہیں ہے۔ چناں چہ ہم لوگ تھانہ بھون کے فاروقی مشہور ہیں، مگر تاریخ سے اس میں شبہ پڑتا ہے، اس لیے کہ ابراہیم بن ادہم اس سلسلۂ نسب میں موجود ہیں اور ان میں اختلاف ہے۔ کوئی ان کو فاروقی لکھتا ہے، کوئی عجلی، کوئی تمیمی، کوئی سید زیدی لکھتا ہے۔ پھر ہمارا کیا منہ ہے کہ ہم کہیں کہ فلانی کم قوم کی ہے۔

خوب یاد رکھو! قیامت کے دن صرف یہ پوچھا جاوے گا: مَاذَا اكْتَسَبْتَ؟ یعنی تُو نے کیا کمایا؟ یہ نہ پوچھا جاوے گا: بِمَنِ انْتَسَبْتَ؟ یعنی کس کی طرف منسوب تھا؟ اور جس قدر اقوام ہیں سب کے مرجع اور منتہیٰ یقینی طور پر آدم علیہ السلام ہی ہیں۔ مگر معلوم نہیں ان کی طرف اپنے کو نسبت کیوں نہیں کرتے؟ اگر جواب میں کہا جاوے کہ وہ بعید ہیں اور نسب میں قریب کا اعتبار ہے، تو میں کہتا ہوں کہ اگر قریب کا اعتبار ہے تو میں ایک شی نہایت قریب بتاتا ہوں اس کی طرف نسبت کرو، وہ کیا ہے؟ ایک آبِ ناپاک۔

ایک بزرگ کے سامنے سے ایک شخص نہایت فخر اور تکبّر سے اکڑتا ہوا نکلا۔ ان بزرگ نے اس کو نصیحت فرمائی کہ بھائی! اتراؤ مت۔ اس نے کہا کہ تم مجھ کو نہیں جانتے میں کون ہوں؟ فرمایا: ہاں! جانتا ہوں: أَوَّلُكَ نُطْفَةٌ قَذِرَةٌ، وَآخِرُكَ جِيفَةٌ مَذِرَةٌ، وَأَنْتَ بَيْنَ ذٰلِكَ تَحْمِلُ الْعَذِرَةَ.

اور اس سے یہ نہ سمجھا جاوے کہ شرفِ نسب کوئی چیز نہیں ہے۔ آخرت میں تو واقعی نسب کوئی چیز نہیں ہے، عمل ہی کام آنے والا ہے، لیکن دنیا میں وہ بے کار بھی نہیں ہے۔ شریعت نے خود اس کا اعتبار کیا ہے۔ اگر نسب کوئی شی نہ ہوتی تو غیرِ کفو میں نکاح کرنے سے منع نہ کیا جاتا اور یہ قانون مقرر نہ ہوتا:

اَلْأَئِمَّةُ مِنْ قُرَيْشٍ.

ائمہ قریش میں سے ہیں۔

ان احکام سے معلوم ہوتا ہے کہ شرع نے بھی شُرَ فا میں ضرور تفاوت رکھا ہے، اور یہ تفاوت مصالحِ تمدنیہ کی حفاظت کے لیے ہے۔ اگر سب کے سب اس میں یکساں ہوتے تو تمدن محفوظ نہ رہ سکتا، نہ کوئی کام چل سکتا۔ مثلاً اگر کوئی گھر بنانے کے لیے کسی کو کہتا: تو وہ کہتا تم ہی ہمارا گھر تعمیر کردو۔ نائی سے خط بنانے کو کہتے، وہ کہتا: تم ہی میرا بنائیو۔ دھوبی کپڑے نہ دھوتا۔ غرض سخت مصیبت ہوتی۔ اگر بڑھئی کی ضرورت ہوتی تو وہ نہ ملتا۔ اگر نوکر کی ضرورت ہوتی، نوکر نہ ملتا۔ یہ ادنیٰ اعلیٰ کا تفاوت ہی ہے جس سے لوگوں کے کام چل رہے ہیں۔

چناں چہ اَلْأَئِمَّةُ مِنْ قُرَیْشٍ میں بھی ایک انتظامی مصلحت ہے۔ قدرتی طور سے اللہ تعالیٰ نے قریش کو فضیلت دی ہے، تو جب ائمہ اور اُمَرا اُن میں سے ہوں گے تو اوروں کو اُن کے اتباع سے عار نہ ہوگا، اور ان کو دوسرے کے اتباع سے عار ہوتا اور جنگ وجدل کی صورت قائم ہوتی۔ اور نیز یہ قاعدہ ہے کہ آدمی اپنے خاندانی شی کی بہت حفاظت کیا کرتا ہے، تو اگر قریشی امام ہوگا تو دین کی حفاظت دو وجہ سے کرے گا: ایک اس وجہ سے کہ دین اُن کے گھر کا ہے، دوسرے مذہبی تعلّق سے۔

پس معلوم ہوا کہ نسبت میں مصالح تمدنیہ مُودَّع ہیں اس لیے وہ بے کار نہیں، مگر نسب پر تکبّر کرنا اور فخر کرنا ہر حالت میں حرام ہے۔ اور آج کل کے شُرَ فا میں تو نسب پر تکبّر ہی ہے، مگر غیر شُرَ فا میں دوسرے طور پر تکبّر پایا جاتا ہے کہ اپنے کو شُرَ فا کے برابر سمجھتے ہیں اور اپنے میں اور ان میں کچھ فرق نہیں جانتے، یہ بھی زیادتی ہے۔ جو فرق اللہ تعالیٰ نے رکھ دیا ہے اس کو کون مٹا سکتا ہے۔ غرض یہ کہ تفاخر اور کبر بھی برا ہے جیسا مدعیان شرافت خصوصاً عورتوں میں ہے، اور فرقِ مراتب نہ رکھنا بھی ناپسندیدہ ہے، جیسا دوسری قوموں نے بھی اختیار کیا ہے۔

عورتوں کو اپنی اصلاح کی فکر ضروری ہے:

میں اس کو بیان کررہا تھا کہ ہماری عورتوں کے اخلاق نہایت خراب ہیں، ان کو اپنی اصلاح کرانا نہایت ضروری ہے۔ اور یاد رکھو کہ بغیر اخلاق کے درست ہوئے عبادت اور وظیفہ کچھ کارآمد نہیں۔ حدیث میں ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ! فلانی عورت بہت عبادت کرتی ہے، راتوں کو جاگتی ہے، لیکن اپنے ہمسایوں کو ستاتی ہے۔ فرمایا:

هِيَ فِي النَّارِ (وہ دوزخی ہے)۔اور ایک دوسری عورت کی نسبت عرض کیا گیا کہ وہ عبادت نہیں کرتی مگر ہمسایوں سے حسنِ سلوک کرتی ہے۔فرمایا:هِيَ فِي الْجَنَّةِ (وہ جنتی ہے)۔

مگر ہماری عورتوں کا سرمایۂ بزرگی آج کل تسبیح اور وظیفہ پڑھنا رہ گیا۔اخلاق کی طرف اصلاً التفات نہیں۔حالاں کہ اگر دین کا ایک بھی جزو کم ہوگا تو دین ناتمام ہوگا، مگر آج کل لوگوں نے جیسے اور چیزوں کا سَت نکالا ہے، اسی طرح دین کا بھی سَت نکال لیا ہے۔بعض نے تو نماز روزہ ہی کو دین سمجھ لیا ہے، معاملات، اخلاق وغیرہ کو چھوڑ دیا۔اور بعضوں نے صرف اخلاق کو لے لیا ہے اور عبادات وعقائد کو چھوڑ دیا۔اگرچہ ان مدعیانِ اخلاق کے اخلاق بھی درست نہیں ہیں، لیکن اگر ہوتے بھی تو بے کار تھے۔

ایک جماعت وہ ہے کہ ان کے عقائد، اعمال ومعاملات اچھے ہیں، مگر سمجھتے ہیں کہ ہم خوش عقیدہ ہیں اور اس پر تفاخر کرتے ہیں اور دوسروں کی تحقیر کرتے ہیں، تو ان میں اخلاق کی کمی ہے۔اسی طرح ہماری عورتوں نے عقائد اور وظائف ونماز کو لے لیا، مگر اخلاق کو چھوڑ دیا۔صبح سے شام تک غیبت، حسد، لعن طعن اور کبر میں مبتلا ہیں اور اس پر یہ سمجھتی ہیں کہ ہم بڑے بزرگ ہیں، تو بزرگی صرف یہ نہیں ہے۔اسی طرح مردوں کو بھی کہا جاتا ہے کہ اخلاق کی ان میں بھی کمی ہے، وہ بھی اصلاح کریں بلکہ اخلاق کا بعض حیثیات سے اعمال سے بھی زیادہ اہتمام ہونا چاہیے۔اس لیے کہ اگر اعمال میں کمی ہوگی تو اس کا ضرر اپنی ذات ہی تک محدود رہے گا، اور اخلاق اگر خراب ہوئے تو اس کا ضرر دوسروں کو پہنچے گا۔یہ حق العبد ہے۔

افسوس! ترکِ صلوٰۃ اور دیگر کبائر کو تو گناہ سمجھا جاتا ہے اور غیبت اور حسد اور طمعِ زیور اور اپنی سَوت سے لڑنا وغیرہ وغیرہ خصائل کو گناہ نہیں سمجھتیں۔

خلاصہ تمام تر وعظ کا یہ ہوا کہ اس حدیث میں تین شر بیان فرمائے گئے ہیں، اور یہ تین شر ایسے ہیں کہ تمام شرور کا تعلّق ان ہی تین سے ہے۔بعض شرور کا تعلّق تو ان سے اِبتاً ہے اور بعض کا دلماً ہے۔یعنی بعض شرور ان سے پیدا ہوتے ہیں اور بعض شرور سے یہ پیدا ہوتے ہیں۔مثلاً کفرانِ عشیر کا منشا حرص وطمع ہے، اکثارِ لعن سے غیبت نامی وغیرہ ہوتی ہے، اذہابِ لبِّ رجل حازم سے نااتفاقی، جنگ وجدال، آپس کی خانہ جنگیاں وغیرہ۔اسی طرح غور کرنے

سے سب کا تعلّق معلوم ہوسکتا ہے۔ پس یہ تینوں واجب الاصلاح ٹھہرے۔

اصلاح کا طریقہ:

اب طریقۂ اصلاح کو غور سے سننا اور سمجھنا چاہیے اور اسی پر بیان ختم ہوجاوے گا۔ اور وہ طریقۂ اصلاح مُرکّب ہے علم وعمل سے۔ اور علم یہی نہیں ہے کہ ترجمۂ قرآن شریف پڑھ لیا، تفسیر سورۂ یوسف پڑھ لی یا نور نامہ، وفات نامہ پڑھ لیا۔ بلکہ کتاب وہ پڑھو جس میں تمہارے امراض کا بیان ہے۔ یہ تو علم ہوا۔

اور عمل ایک تو یہ کہ اول تو زبان کو روک لو، تمہاری زبان بہت چلتی ہے، تم کو کوئی برا کہے یا بھلا تم ہرگز مت بولو، اس سے کفرانِ عشیر، اذہاب لبِ رجلِ حازم، اکثارِ لعن وحسد وغیرہ جاتے رہیں گے۔ اور جب زبان روک لی جاوے گی تو امراض کے مبانی بھی قلب سے جاتے رہیں گے۔ کیوں کہ جب اس قوت سے کام ہی نہ لیا جاوے گا تو ان امراض کے مَناشی بھی ضعیف اور مضمحل ہوجاویں گے۔

اور دوسرا یہ کہ ایک وقت مقرر کر کے یہ سوچا کرو کہ دنیا کیا چیز ہے؟ اور یہ دنیا چھوٹنے والی ہے اور موت کا اور موت کے بعد جو اُمور پیش آنے والے ہیں، جیسے قبر اور منکر نکیر کا سوال اور اس کے بعد قبر سے اٹھنا اور حساب وکتاب اور پلِ صراط کا چلنا، سب کو بالتفصیل روزانہ سوچا کرو۔ اس سے حبِّ جاہ، حبِّ مال، تکبّر، حرص اور اس کے فروع غیبت، حسد وغیرہ سب امراض ہی جاتے رہیں گے۔

غرض حاصل معالجہ کا دو جزو ہوئے: ایک علمی، دوسرا عملی۔

علمی کا حاصل یہ ہے کہ قرآن کے بعد ایسی کتابیں پڑھو جس میں احکام فقہیہ کے ساتھ امراضِ قلب مثل حسد، تکبّر وغیرہ کا بھی بیان ہو، کم سے کم ''بہشتی زیور'' ہی کے دس حصّے پڑھ لو۔ اور عملی جزء کا حاصل دو چیزیں ہیں:

کف لسان اور مراقبۂ موت۔

لیکن طوطے کی طرح ''بہشتی زیور'' کے الفاظ خود پڑھ لینے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ بلکہ یہ

ضروری ہے کہ کسی عالم سے سبقاً سبقاً پڑھ لو، جب کہ گھر میں عالم ہو، ورنہ گھر کے مردوں سے ہی درخواست کرو کہ وہ کسی عالم سے پڑھ کر تم کو پڑھا دیا کریں۔ مگر پڑھ کر بند کر کے مت رکھ دینا۔ ایک وقت مقرر کر کے ہمیشہ اس کو خود بھی پڑھتی رہنا، اوروں کو بھی سناتی رہنا۔

میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس طریقہ سے ان شاء اللہ بہت جلد اصلاح ہو جاوے گی۔ اور یہاں اس سے زیادہ بیان کرنے کی اس لیے ضرورت نہیں کہ ماشاء اللہ یہاں کی عورتیں خود سمجھ دار ہیں۔ اور اصل الاصل ان تمام تر خرابیوں کا ایک ہی امر ہے، اس کا اگر ازالہ ہو جائے تو سب امور کی اصلاح ہو جاوے۔ وہ یہ کہ آج کل بے فکری ہو گئی ہے۔ اگر ہر امر میں دین کا خیال رکھا جاوے کہ یہ امر جو ہم کرتے ہیں آیا دین کے موافق ہے یا نہیں؟ تو ان شاء اللہ چند روز میں اصلاح ہو جاوے۔ اب دعا کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ توفیق عنایت فرماوے۔ آمین آمین آمین۔ فقط

مطبوعات مکتبۃ البشریٰ

اردو وفارسی مطبوعاتِ درسِ نظامی

خصائل نبوی شرح شمائل ترمذی
علم الصرف (اولین وآخرین)
عربی صفوۃ المصادر
جمال القرآن
عربی زبان کا آسان قاعدہ
فارسی زبان کا آسان قاعدہ
تسہیل المبتدی
عربی کا معلّم (اول تا چہارم)
کلید جدید عربی کا معلّم (اول تا چہارم)
حیات المسلمین
لسان القرآن (اول تا سوم)
مفتاح لسان القرآن (اول تا سوم)
بہشتی زیور (تین حصے)

خیر الاصول
معین الاصول
فوائد مکیہ
جوامع الکلم
تیسیر الابواب
پندنامہ
کریما
عوامل النحو
تعلیم الدین
سیر صحابیات
فصول اکبری
الانتباہات المفیدۃ
میزان ومنشعب

معین الفلسفہ
تاریخ اسلام
علم النحو
صرف میر
بہشتی گوہر
نام حق
تیسیر المبتدی
آداب المعاشرت
تعلیم العقائد
نحو میر
تیسیر المنطق
آسان اصول فقہ
تعلیم الاسلام

دیگر اردو مطبوعات

قرآن مجید پندرہ سطری (حافظی)
پنج سورہ
سورۂ یٰس
رحمانی قاعدہ
اعجاز القرآن
بیان القرآن
نمازیں سنت کے مطابق پڑھیے
آسان صرف (۳ حصے)
آسان نحو (دو حصے)
وصیّت اور میراث کے احکام
پردہ کے شرعی احکام
قصص القرآن (۴ حصے)
سیرت سید الکونین خاتم النّبیین صلی اللہ علیہ وسلم

پنج پارہ
عم پارہ (درسی)
نورانی قاعدہ
بغدادی قاعدہ
تفسیر عثمانی
النّبی الخاتم صلی اللہ علیہ وسلم
فضائل تجارت
آسان منطق
اپنی نمازیں درست کیجیے
حقوق الوالدین
بارہ مہینوں کے فضائل واحکام
آسان نیکیاں
حیاۃ الصحابہ رضی اللہ عنہم

خلفائے راشدین
نیک بیبیاں
تبلیغ دین (امام غزالی رحمہ اللہ)
علاماتِ قیامت
جزاء الاعمال
علیکم بسنتی
منزل
الحزب الاعظم (ماہانہ مکمّل)
اعمال قرآنی
مناجات مقبول
فضائل اعمال
اکرام مسلم
فضائل علم
فضائل امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم
منتخب احادیث
نماز حنفی
آئینۂ نماز
بہشتی زیور (مکمّل)
روضۃ الادب
جامع الاخلاق
کتاب الحج
کرامات صحابہ
موت کی یاد
حزب البحر مع قصیدہ بردہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوبات شریفہ
مرنے کے بعد کیا ہوگا؟
زندگی سے بیزاری کیوں؟
شوق وطن

امت مسلمہ کی مائیں
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نصیحتیں
اکرام المسلمین/حقوق العباد کی فکر کیجیے
حیلے اور بہانے
اسلامی سیاست
آداب معیشت
حصن حصین
الحزب الاعظم (ہفتہ وار کامل)
زاد السعید
مسنون دعائیں
فضائل صدقات
فضائل درود شریف
فضائل حج
جواہر الحدیث
آسان نماز
نمازِ مدلّل
معلّم الحجاج
خطبات الاحکام لجمعات العام
الحجامہ
صفائی معاملات
سال بھر کے مسنون اعمال
فضائل استغفار
مجموعہ وصایا امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ
حقوق العلم
شرعی پردہ
ایک مسلمان کس طرح زندگی گذارے؟
اخبار الزلزلہ
اصلاح النساء

دائمی نقشہ اوقاتِ نماز: سندھ، پنجاب، خیبر پختونخواہ

من منشورات مكتبة البشرى

ملونة مجلدة

الجامع للترمذي
الموطأ للإمام محمد
مشكاة المصابيح
التبيان في علوم القرآن
شرح نخبة الفكر
المسند للإمام الأعظم
ديوان الحماسة
مختصر المعاني
الهدية السعيدية
رياض الصالحين
القطبي
المقامات الحريرية
أصول الشاشي
شرح التهذيب
علم الصيغة
التسهيل الضروري
النحو الواضح (للمدارس الابتدائية)

الصحيح لمسلم
الموطأ للإمام مالك
الهداية
تفسير البيضاوي
تفسير الجلالين
شرح العقائد
آثار السنن
الحسامي
ديوان المتنبي
نور الأنوار
شرح الجامي
كنز الدقائق
نفحة العرب
مختصر القدوري
نور الإيضاح
تيسير مصطلح الحديث
النحو الواضح (للمدارس الثانوية)

المنهاج في القواعد والإعراب

تسهيل الوصول إلى علم الأصول
شرح الوقاية مع حاشية عمدة الرعاية

ملونة كرتون مقوي

شرح عقود رسم المفتي
متن العقيدة الطحاوية
متن الكافي
المعلقات السبع
هداية الحكمة
الكافية
مبادئ الأصول
زاد الطالبين
هداية النحو (متداول)
شرح مائة عامل

السراجي
الفوز الكبير
تلخيص المفتاح
مبادئ الفلسفة
دروس البلاغة
تعليم المتعلم
هداية النحو (مع التمارين)
المرقات
إيساغوجي
عوامل النحو

أصول التخريج ودراسات الأسانيد

كتب تحت الطباعة

الصحيح للبخاري
شرح معاني الآثار
معجمي الحي

سنن أبي داود
التوضيح والتلويح

Books in English

Tafsir-e-Uthmani (Vol. 1, 2, 3)
Lisaan-ul-Quran (Vol. 1, 2, 3)
Key Lisaan-ul-Quran (Vol. 1, 2, 3)
Al-Hizb-ul-Azam (Large) (H. Binding)
Al-Hizb-ul-Azam (Small) (Card Cover)

Other Languages

Riyad Us Saliheen (Spanish) (H. Binding)
Fazail-e-Aamal (German)
Muntakhab Ahadis (German)

To be published Shortly Insha Allah

Al-Hizb-ul-Azam (French) (Coloured)
Aasan Namaz (P.B) (U/P)

www.maktaba-tul-bushra.com